غیر مسلموں سے تعلقات

اور

ان کے حقوق

مولانا سیّد جلال الدین عمری

فہرستِ مضامین

بعض مسائل کی تحقیق وتوضیح

طبع چہارم

زمانۂ قدیم میں قومیں عموماً ایک نسل، ایک مذہب، ایک تہذیب اور ایک زبان بولنے والوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ باہر کے تھوڑے بہت افراد ہوتے بھی تو ان کی حیثیت اجنبی کی ہوتی۔ ان کو کوئی باعزت مقام نہ حاصل ہوتا۔ ایک قوم کا دوسری قوم سے رابطہ بھی کم ہی ہوتا۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور ایک سے زیادہ قوموں پر مشتمل معاشرے تشکیل پانے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس کے آغاز ہی میں مدینہ سے متصل یہودی قبائل سے آپ نے معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی رو سے انہیں پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور وہ ریاست کے دفاع اور تحفظ میں برابر کے شریک تھے۔

اسلامی اقتدار کا دائرہ جب وسیع ہوا تو مفتوح ممالک کی بڑی بڑی آبادیوں نے اسلام کی صاف ستھری تعلیمات اور مسلمانوں کے حسن سلوک سے متاثر ہوکر بخوشی اسلام کو سینے سے لگایا اور اس کی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے باوجود ان ممالک میں دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی حسب سابق موجود رہے۔ اسلام نے انھیں اپنے مذہب پر عمل کی آزادی دی اور ان کے شہری حقوق کی حفاظت کی۔

اس وقت پوری دنیا مختلف اسباب کی وجہ سے عملاً ایک تکثیری معاشرہ (Plural Society) میں تبدیل ہوگئی ہے۔ جس کسی ملک میں ایک نسل، ایک مذہب یا ایک زبان بولنے والے طبقہ کی اکثریت ہے، وہاں دوسری نسل، دوسرے مذہب اور

دوسری زبان بولنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ گو اقلیت میں ہیں، لیکن از روئے دستور ان کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ آج کے تکثیری معاشرے کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اقلیتوں کو بھی برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اس سے قانونی طور پر انکار نہیں کیا جاتا۔

سوال یہ ہے کہ اس مسئلے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟ جن ممالک میں اسلام کے ماننے والے اکثریت میں ہیں اور بااختیار ہیں، وہاں کی اقلیتوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہوگا اور جہاں اسلام کے ماننے والے اقلیت میں ہیں۔ اکثریت کے ساتھ ان کے تعلق کی کیا نوعیت ہوگی؟ یہ سوال مسلم ممالک سے متعلق بھی ہے، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور اس کا تعلق مغربی ملکوں سے بھی ہے، جہاں مسلم آبادی اقلیت میں ہے۔ ہندوستان جیسے ملک کے لیے یہ سوال خاص اہمیت کا حامل ہے، جہاں مسلمانوں کی تاریخ ایک ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے اور آج بھی وہ مردم شماری کے لحاظ سے تقریباً چودہ فیصد ہیں، جب کہ خود مسلمانوں کا اپنی آبادی سے متعلق اندازہ اس سے زیادہ ہے۔

یہ ایک علمی موضوع ہے۔ قرآن و حدیث میں اس سلسلے میں رہ نمائی موجود ہے۔ ہمارے قدیم علماء و محققین نے اس طرح کے مشترک معاشرے میں اسلام کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حقوق پر اپنے حالات کے پیش نظر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سے اسلام کے موقف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

موجودہ دور میں یہ موضوع اس لیے بھی کافی اہمیت اختیار کیا گیا ہے کہ بعض مخالف حلقے اسلام کی اس طرح تصویر پیش کرتے ہیں گویا کہ وہ اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو گردن زدنی اور واجب القتل قرار دیتا ہے اور اس میں رواداری اور مخالفین کو برداشت کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔ اسی طرح جب اسلامی ریاست یا اسلام کے نظام حکومت کا ذکر آتا ہے تو اس پر سنجیدہ غور وفکر اور بحث و تمحیص کی جگہ جذباتی رویہ اختیار کیا جاتا ہے کہ آج کے دور میں اسلامی افکار ونظریات ناقابل قبول ہیں اور وہ جدید زمانہ کے سیاسی وسماجی تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتے۔ اسلام کے بارے میں ان خیالات

سے آج کا تعلیم یافتہ طبقہ بری طرح متاثر ہے۔ اس کے پیچھے اسلام سے عداوت اور تعصب کے ساتھ بڑی حد تک اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت اور بے خبری بھی کارفرما ہے۔

پیش نظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ غیر مسلموں سے عام تعلقات اور اسلامی ریاست میں ان کے حقوق پر مستند حوالوں کے ساتھ گفتگو کی جائے اور جن مسائل کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے ان کے سلسلے میں اسلام کی تعلیمات وضاحت کے ساتھ آجائیں۔ اندازِ بیان ردّ و قدح کی جگہ مثبت اور معروضی اختیار کیا گیا ہے۔ امید ہے، اس سے اسلام کے موقف کو بہتر طریقہ سے اور اچھے ماحول میں سمجھا جاسکے گا اور اس کی صحیح تصویر سامنے آسکے گی۔ یہ موضوع موجودہ حالات میں اہم بھی ہے اور جدید بھی۔ اس لیے کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اہل علم نے اس کی طرف توجہ کی۔ یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے۔ وہی ہر طرح کی حمد و ستائش کا مستحق ہے۔ بعض دوستوں کا اصرار ہے کہ کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو۔ اس کی کوشش ہو رہی ہے۔

یہ کتاب اس سے قبل ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ سے دو مرتبہ شائع ہوچکی ہے۔ اس کی تیسری اشاعت مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی سے ہوئی۔ اب کی بار کسی قدر نظر ثانی کے بعد مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز ہی سے زیادہ اہتمام سے شائع ہو رہی ہے۔ اس میں حسب معمول برادرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے اور اجر آخرت سے نوازے۔

جلال الدین عمری

۴؍ستمبر ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغازِ سخن

انسانی تعلقات کا مسئلہ سماج کا سب سے اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ اس کی اہمیت اور نزاکت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کہ سماج میں مختلف افکار ونظریات اور عقائد و مذاہب کے ماننے والے ساتھ رہتے ہوں، ان کا طرزِ حیات اور ان کی تہذیب و معاشرت ایک دوسرے سے الگ ہو۔ اس صورتِ حال میں ظلم و زیادتی، حق تلفی اور ناانصافی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور عدل و انصاف اور حقوق کی ادائیگی میں فکری تعصّبات، ذاتی اور قومی رجحانات اور سماجی عوامل رکاوٹ بننے لگتے ہیں۔ اس پر قابو پانا ہر مہذب اور صالح سماج کی اولین ضرورت ہے۔

انسانی تعلقات کا اخلاق اور قانون سے رشتہ جڑا ہوا ہے۔ اخلاق کا ہدف ان تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانا ہے۔ قانون اس لیے ہے کہ انھیں جائز حدود میں رکھے اور کسی کو ان سے انحراف اور تجاوز کی اجازت نہ دے۔ اخلاق اور قانون اپنا فرض ادا کریں تو سماج کو امن و امان اور سکون کی دولت نصیب ہوگی، ورنہ جنگل کا راج ہوگا، حقوق پامال ہوں گے اور طاقت ور کے ظلم اور چیرہ دستی سے کم زور سسکتے اور بلبلاتے رہیں گے۔

دنیا نے الفت و محبت کے پھول کھلتے بھی دیکھے ہیں اور قتل وخون اور فتنہ و فساد کی کشتِ خزاں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ خدا کی اس زمین پر طبقات کا تصادم بھی رہا ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اتفاق بھی پایا گیا ہے۔ ظلم و زیادتی اور استحصال کی تیز و تند

آندھیاں بھی چلی ہیں اور عدل و انصاف اور ایثار و ترجیح کے خوش گوار مناظر بھی دیکھنے میں آتے رہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب کی روح تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔ وہ انسان کو اخلاق اور قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس لیے انسانی تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانے اور عدل و انصاف کے قیام میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افسوس کہ دنیا کے بیش تر مذاہب سے یہ روح مفقود ہوتی چلی گئی اور بے جان رسوم نے اس کی جگہ لے لی۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھودی کہ زمانہ کی رفتار اور تغیر پذیر حالات میں زندگی کے پیچیدہ مسائل اور ان کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ ان کے غیر عقلی اور جامد رویے نے دنیا کو ان سے بے زار اور متنفر کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب سے رہ نمائی کا مقام چھن گیا اور وہ انسان کی نجی زندگی تک محدود ہوکر رہ گیا۔ وہ فرد کی محض ذاتی دلچسپی کا موضوع بن گیا اور اجتماعی امور و معاملات اس سے آزاد قرار پائے۔ یہ رویہ پہلے مغرب نے اپنایا اور اس کے زیر اثر مشرق نے بھی عملاً اسے قبول کرلیا۔

اس وقت دوسرے مذاہبِ عالم زیر بحث نہیں ہیں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے بارے میں اس رویہ کو اختیار کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی، لیکن مختلف اسباب و عوامل کے تحت دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے ساتھ زیادہ سخت روش اختیار کی گئی۔ اسے اس طرح پیش کیا گیا جیسے وہ آج کے مہذب سماج کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس کا فروغ نوعِ انسانی کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔ اس کی تاریخ، نوعِ انسانی پر ظلم و زیادتی کی تاریخ ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں: ایک کا تعلق فرد سے ہے اور دوسرے کا ریاست سے۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام علیٰحدگی پسند ہے اور فرد کے اندر یہی رجحان پیدا کرتا ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے اور مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں سے قطع تعلق کا حکم دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ان سب افراد سے کاٹ دیتا ہے جو اس سے اختلاف

رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے۔ اسلام کی واضح تعلیمات اس کی تردید کرتی ہیں۔ وہ غیر مسلموں سے عام انسانی اور اخلاقی روابط سے کبھی منع نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ مسلمان کسی دوسرے گروہ میں ضم ہوجائیں۔ اس کے لیے اس نے کچھ حدود مقرر کر رکھے ہیں۔ ان حدود کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی بااصول اور نظریاتی ملت کے لیے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کی تردید آسان نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کے بارے میں یہ تصور ہے کہ اس میں سارے حقوق مسلمانوں کو حاصل ہوں گے اور غیر مسلم بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہوں گے۔ حالاں کہ اسلامی ریاست کا مقصد قرآن کے الفاظ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر (الحج:۴۱) اور عدل و انصاف کا قیام ہے۔ (الحدید:۲۵) وہ ہر انسان کے جائز اور فطری حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

ان خیالات کے پیچھے ناواقفیت اور لاعلمی کے ساتھ بہت سے تاریخی عوامل کارفرما ہیں۔ ان میں اسلام کی برتری کو تسلیم نہ کرنے کی نفسیات، اسلام کی سربلندی اور فرماں روائی کا خوف اور اسے کسی قیمت پر گوارا نہ کرنے کا جذبہ اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور عداوت جیسے محرکات شامل ہیں۔ اس وجہ سے اسلام کی صاف اور واضح تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش تو نہیں ہوتی، البتہ انھیں مسخ کرنے اور اسلام کو بھیانک شکل میں پیش کرنے کی تدبیریں ہوتی رہتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پورے رویہ میں مسلمانوں کی کوتاہی کا بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے موجودہ دور میں مختلف مسائل کے سلسلے میں غیر مسلموں کے سامنے سنجیدہ اور علمی انداز میں اسلام کا موقف واضح کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی جیسے ہونی چاہیے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط کی کمی بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ دونوں میں طویل عرصہ سے ایک طرح کی دوری اور حجاب پایا جاتا ہے۔ ایک

دوسرے کے موقف کو سمجھنے کے لیے جس ٹھنڈے ماحول کی ضرورت ہے اس کی کمی بلکہ فقدان رہا ہے، اس لیے بدگمانیاں پیدا ہوتی اور نشو ونما پاتی رہی ہیں۔

اس نازک اور اہم مسئلے میں اسلام کے موقف کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے بعض بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

۱- یہاں اس سے بحث نہیں کہ دنیا کے مذاہب میں کس کا رول شخصی اور انفرادی زندگی تک محدود ہے اور کس کے دائرے میں اجتماعی مسائل بھی آتے ہیں۔ البتہ اسلام کی حد تک یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ ایک جامع اور مکمل دین اور عقیدہ وعمل کا ایک مربوط نظام ہے۔ اس نے اس وسیع کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق صرف مضبوط عقیدہ ہی نہیں دیا، بلکہ اس کی بنیاد پر انسان کی زندگی کو ایک خاص رخ عطا کیا ہے۔ وہ عبادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے انسان کا تعلق جوڑتا اور اسے استحکام بخشتا ہے اور اخلاق اور قانون میں اس کے احکام کا اسے پابند بناتا ہے۔ خاندان، معاشرہ، ریاست، شخصی، ملی اور بین الاقوامی تعلقات سب اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ اس کے اس موقف سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے یہ مطالبہ صحیح نہ ہوگا کہ وہ انفرادی زندگی تک اپنے آپ کو سمیٹ لے۔ وہ محدود مذہبیت کا مخالف ہے، جس میں خدا اور قیصر کے حقوق الگ ہوں۔

۲- اسلام ایک عالمی دین ہے۔ وہ خدا کا آخری پیغام ہے، جو انسانوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا خطاب سب انسانوں سے اور ان کے سبھی طبقات سے ہے:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	(اے پیغمبر) کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ اللہ جس کا آسمانوں اور زمین پر اقتدار ہے۔ (الاعراف:۱۵۸)

جس دین کا خطاب دنیا کے تمام انسانوں اور ان کے تمام طبقات سے ہو، جو

اس حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ سارے عالم کی فلاح ونجات کا ذریعہ ہے، وہ کسی طبقہ سے نفرت اور عداوت کا سبق نہیں دے سکتا، ورنہ اس کا خطاب محدود ہوکر رہ جائے گا۔ وہ نظریات جو مختلف طبقات کے درمیان کشمکش پیدا کرتے اور ایک کے ذریعے دوسرے کا استحصال کرتے ہیں، ان میں عمومی اپیل نہیں ہوتی، وہ ایک کے لیے پرکشش ہوتے ہیں تو دوسرے کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتے۔

۳- اسلام نے اپنے عقیدے اور فکر کو عام کرنے کے لیے جبر و اکراہ کے تمام طریقوں کو رد کر دیا ہے۔ ان میں سے ہر طریقہ اس کے نزدیک ناجائز اور ممنوع ہے۔ اس کے لیے اس نے صرف دعوت وتبلیغ کی راہ کھلی رکھی ہے۔ وہ اپنی بات دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسے قبول یا رد کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ اس نے صبر و ثبات کے ساتھ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے اور مخالفت اور مزاحمت کو عزم و حوصلہ اور ہمت سے برداشت کرنے کا حکم دیا ہے:

وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ اھۡجُرۡھُمۡ ھَجۡرًا جَمِیۡلًا○ (المزمل:۱۰)
جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور ان کو اچھی طرح چھوڑ دو۔

اس نے بار بار کہا کہ یہ راہ عفو و درگزر کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کا دامن چھوٹنے نہ پائے:

فَاصۡفَحۡ عَنۡھُمۡ وَ قُلۡ سَلٰمٌ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ○ (الزخرف:۸۹)
ان سے درگزر کیجیے اور سلام کہیے ان کو بہت جلد (اپنا انجام) معلوم ہوجائے گا۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ○ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ○ (الحجر:۸۵،۸۶)
ان سے اچھی طرح درگزر کیجیے۔ تمھارا رب وہی ہے جو پیدا بھی کرتا ہے اور باخبر بھی ہے۔

اس نے اپنے ماننے والوں کی یہ خوبی بیان کی ہے:

وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران:۱۳۴)
وہ غصہ کے پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔

اس نے ہدایت کی ہے کہ بات چیت میں، دعوت میں اور اپنے طرزِ عمل میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے بدترین دشمن کی بھی دشمنی ختم ہوجائے اور وہ دوستوں کی صف میں آجائے۔ (حم السجدة:۳۴،۳۵)

کیا ان واضح تعلیمات کے بعد بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اپنے مخالفوں کو برداشت نہیں کرتا اور ان سے جنگ کی زبان میں بات کرتا اور اپنا عقیدہ ان پر بہ جبر مسلط کرتا ہے؟

۴- اسلام سچے دل سے خدا اور رسول کو ماننے اور خوش دلی سے ان کی اطاعت کا نام ہے۔ یہ چیز جبر و اکراہ سے نہیں پیدا ہوتی۔ جہاں جبر و اکراہ ہوگا وہاں ایمان اور اسلام کا اظہار تو ہوجائے گا، لیکن حقیقت میں یہ ایمان نہیں بلکہ نفاق ہوگا۔ قرآن مجید نے نفاق کو دل کا روگ، کذب و افترا اور خدا اور رسول کے ساتھ دھوکہ اور فریب کہا ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُم بِمُؤْمِنِيْنَ○ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُم وَ مَا يَشْعُرُوْنَ○ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً وَّلَهُم عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ○

لوگوں میں بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے حالاں کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان والے ہیں۔ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور اسے محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ ہے۔ اللہ نے ان کے اس روگ میں اضافہ کر دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بول رہے ہیں۔ (البقرة:۸-۱۰)

اس نے کہا کہ منافقین کا وہی انجام ہوگا جو خدا کے منکرین کا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا○

بے شک اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں یک جا جمع کردے گا۔ (النساء:۱۴۰)

ایک اور جگہ ان کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۝ بے شک منافقین جہنم کے سب سے نیچے درجے میں ہوں گے۔ (النساء:۱۴۵)

قرآن مجید نے منافقین پر جتنی سخت تنقید کی ہے اور ان کی ذہنی پستی، خودغرضی، بے عملی، بلکہ بدعملی کو نمایاں کیا ہے اور اسلام کے خلاف ان کی سازشوں کا پردہ چاک کیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہے، کیا اس کے بعد یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کی صفوں میں منافقین کا اضافہ ہوتا چلا جائے؟ کیا وہ ایسا طریقہ اختیار کرے گا کہ سماج میں نفاق کی آبیاری ہو اور وہ فروغ پاتا چلا جائے؟ اسلام اگر جبر و اکراہ کے موقف میں ہوتو بھی کسی کو ایمان اور اسلام پر مجبور نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اس سے نفاق کی راہ کھلتی ہے۔ دنیا کا کوئی عقیدہ اور کوئی فکر نفاق کو برداشت نہیں کرتا، کیا اسلام ہی اس کے ابھرنے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرے گا؟

اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ یہ سوال ابھر آتا ہے کہ اس میں غیر مسلموں کی کیا حیثیت ہوگی؟ ان کے حقوق کیا ہوں گے؟ اور ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا؟ اس ذیل میں بھی بعض باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں:

۱- اسلامی ریاست انسان کی حکم رانی کی جگہ اللہ تعالیٰ کی حکم رانی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں اقتدار کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے، کوئی فرد یا گروہ یا مجموعۂ افراد نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ریاست اپنا نظم چلاتی ہے۔ اس میں حالات و ظروف کے لحاظ سے نئے قوانین بھی وضع ہوں گے اور نئی راہیں بھی تلاش کی جائیں گی، لیکن یہ سب کچھ کتاب و سنت کے حدود کے اندر ہوگا۔ اس سے باہر نکلنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔

۲- اسلامی ریاست کی باگ ڈور فطری طور پر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی جو

قرآن و حدیث پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے مملکت کی اساس تسلیم کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا اس پر ایمان نہیں ہے ان پر نہ تو اس کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے اور نہ وہ اسے خوش دلی سے چلا سکتے ہیں۔ لیکن ریاست میں انھیں خدا اور اس کے رسول کی پناہ حاصل ہوگی۔ اسلامی قانون کی رو سے ان کے بنیادی حقوق محفوظ ہوں گے۔ کسی بھی فرد یا جماعت کو ان حقوق پر دست درازی کی اجازت نہ ہوگی۔ انتظامی امور میں حکومت ان کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

۳- اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اور ان سے تعلقات کا یہ قانونی پہلو ہے۔ لیکن عام زندگی میں قانون سے زیادہ اخلاقی رویہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسلام نے تعلقات میں صداقت اور راست بازی کی پابندی اور جھوٹ اور مکر و فریب سے اجتناب کا حکم دیا ہے، نخوت و استکبار کی جگہ تواضع اور خاک ساری کا مزاج پیدا کیا ہے، درشت مزاجی اور شدت کے مقابلے میں نرمی اور رافت کو پسند کیا ہے، غیظ و غضب پر قابو پانے اور تحمل و برداشت کا رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انتقام میں حد سے آگے نہ بڑھنے اور عفو و درگزر سے کام لینے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی ترغیب دی ہے، شر اور فتنہ وفساد سے بچنے اور ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کی تاکید کی ہے۔ یہ ہدایات بالکل عام ہیں۔ ان کا تعلق خاص مسلمانوں سے نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے تعلقات میں ان کا احترام کریں۔ اس معاملہ میں اسلام نے اپنوں اور غیروں میں فرق نہیں کیا ہے۔ ایک مسلمان کا ربط و تعلق کسی بھی مذہب وعقیدہ کے ماننے والے سے ہو، توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کا پابند رہے گا۔ جس سماج میں ان اخلاقیات کی فرماں روائی ہو وہاں فطری طور پر ظلم و زیادتی کے امکانات کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں گے اور اگر کبھی کسی کی طرف سے کوئی غلط قدم اٹھے تو قانون اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگا اور اپنا فرض انجام دے گا۔

۴- اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ جہاد کا ذکر اس طرح چھڑ جاتا ہے

جیسے اس کا مقصد وجود یا اولین ہدف مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف صف آرا کرنا اور جہاد کے نام پر قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کرنا ہے۔ حالاں کہ جس طرح دنیا کی ہر ریاست کو جنگ سے سابقہ پیش آ سکتا ہے اسی طرح اسلامی ریاست کو بھی جہاد کرنا پڑ سکتا ہے۔ اسے اس کے حقیقی پس منظر میں اور اسلام کی زیادہ وسیع اور عمومی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ وہ ایسی جنگ نہیں ہے جو قتل وخوں ریزی اور انسانوں کو محکوم بنانے اور حکم رانی کی خواہش کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے، بلکہ اس جنگ کے پیچھے اعلیٰ اخلاق، عدل و انصاف پر مبنی قانون، دعوت وتبلیغ کا مخلصانہ جذبہ اور انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کی تمنا اور آرزو موج زن ہوتی ہے۔ سوچا جاسکتا ہے کہ یہ جنگ دوسری جنگوں سے کتنی مختلف ہوگی اور اس کے کتنے اچھے ثمرات سامنے آئیں گے؟

آئندہ صفحات میں غیر مسلموں سے تعلقات کی بحث بھی ہے اور ان کے حقوق بھی بیان ہوئے ہیں۔ تعلقات میں خاندانی، سماجی، معاشرتی، معاشی کئی طرح کے تعلقات زیر بحث آئے ہیں۔ بعض اختلافی مسائل میں شریعت کا موقف واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے ان تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ تعلقات اور حقوق فرد اور ریاست دونوں ہی سے متعلق ہیں، البتہ تعلقات میں شخصی پہلو غالب ہے، حقوق کا رشتہ ریاست سے جڑ جاتا ہے۔ ریاست کی بحث میں غیر مسلم کی حیثیت اور اس کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔ اس ذیل میں جہاد اور اس کے احکام پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں اسلام کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخری صفحات میں غیر مسلموں سے عدم تعلق کے احکام و ہدایات کا پس منظر بیان ہوا ہے۔

کتاب میں اصلاً قرآن و حدیث کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان کی شرح وتفسیر میں معتمد علماء اور شارحین سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بعض فقہی مسائل میں فقہاء کے خیالات تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ ایک خیال یہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے مسائل میں صرف وہ رائے بیان کی جانی چاہیے جسے لکھنے والا صحیح سمجھتا ہو اور جسے اس کے نزدیک

ترجیح حاصل ہو، اس لیے کہ تفصیلات سے ذہن الجھن محسوس کرتا ہے۔

یہ ممکن تھا اور آسان بھی۔ لیکن جن حضرات کی فقہی ذخیرہ پر نظر ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے سامنے دوسری رائیں بھی ہوتیں۔ وہ یہ سوچ سکتے تھے کہ اس بحث میں ذاتی رجحان کے تحت مخالف رایوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ مختلف رایوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہی کسی رائے کو ترجیح دی جائے۔ پھر یہ کہ آج کا دور تقابلی مطالعہ کا دور ہے۔ دنیا کے ہر موضوع کا، جس میں فقہ بھی شامل ہے، تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جدید علمی تصنیفات اور انسائیکلو پیڈیاز میں یہی طریقہ اختیار کیا جارہا ہے۔

ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ بعض فقہاء کے خیالات سے غیر مسلم قارئین توحش محسوس کریں گے، اس لیے ان کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی بہت زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مطالعۂ مذاہب اب عام ہو رہا ہے۔ ہمارے دینی اور فقہی لٹریچر سے مسلمان علماء ہی نہیں، غیر مسلم اصحابِ علم بھی واقف ہیں۔ وہ فقہی اختلافات کے درمیان صحیح نقطۂ نظر جاننا چاہیں گے۔ اس لیے ان کے لحاظ سے بھی مناسب اور معقول طریقہ یہی ہے کہ زیر بحث مسائل میں فقہی آراء کا تجزیہ کر کے بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں بہتر اور موزوں رائے کیا ہے؟ اور اسے کس بنیاد پر ترجیح حاصل ہے؟ یہاں اسی کی کوشش رہی ہے، لیکن اس کوشش میں کوئی ایسی رائے نہیں اختیار کی گئی ہے جو بے دلیل ہو اور جسے سلف کی بالکل تائید حاصل نہ ہو۔

فقہاء کی رایوں میں سختی بھی ہے اور نرمی بھی، تنگی بھی ہے اور توسع اور کشادگی بھی۔ جن مسائل میں فقہاء کی رائیں سخت اور بے لچک معلوم ہوتی ہیں جیسے غیر مسلموں سے ملکی خدمات لینے یا مختلف معاملات میں ان پر اعتماد کا مسئلہ، انھیں اُس وقت کے حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے، ورنہ انھیں ہدفِ تنقید بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام کے دورِ اول یا اس کی ابتدائی صدیوں میں جو ممالک فتح ہوئے یا جہاں

تبلیغ و دعوت کامیاب رہی وہاں کی اکثریت دین کے آغوش میں آتی چلی گئی۔ اس میں حجاز، مصر، عراق، شام اور افریقہ و ایشیا کے بعض ممالک شامل ہیں۔ یہاں غیر مسلم تھے بھی تو چھوٹی سی اقلیت میں تھے۔ ان ممالک میں اور اس وقت کے حالات کے تحت حکومتی اداروں میں غیر مسلموں کی شرکت نمایاں نہیں ہے اور فقہاء کے ہاں اس طرح کی رائیں بھی ملتی ہیں کہ ملکی نظام، اس کے دفاع اور حفاظت کے لیے ان کی خدمات کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی مملکت ہے جس میں مسلمان اپنے تمام داخلی و خارجی امور میں خود کفیل ہیں اور انھیں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں ہے۔ یہ صورت حال ان ممالک کی نہیں ہوسکتی جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اقلیت میں اور غیر مسلم اکثریت میں ہوں۔ یہاں امورِ مملکت سے انھیں علیحدہ نہیں رکھا جاسکتا، انھیں شریک کیے بغیر اس کا چلانا ممکن نہ ہوگا۔ اس صورت میں بظاہر فقہی رائے بھی مختلف ہوگی۔

موجودہ دور میں مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے نتیجے میں مشترک سماج وجود میں آرہے ہیں اور کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ اقلیتیں انتظامِ ملکی میں شریک رہیں، انھیں الگ تھلگ نہ رکھا جائے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

معاملات میں غیر مسلموں پر اعتماد اور عدم اعتماد کی بحث میں خیال ہوتا ہے کہ اس وقت کی پوری دنیا کی صورت حال کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں مسلمان فی الجملہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے دوسروں سے برتر تھے، ان کے اندر خدا کا خوف تھا، اخلاقی بلندی تھی، وہ معاملات کے صاف اور کھرے تھے، ان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا اور کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ان کے اردگرد کی دنیا میں اخلاقی گراوٹ اور پستی تھی، افراد اور اقوام اپنا اعتماد کھو چکی تھیں، راست بازی، دیانت و امانت اور ایفائے عہد جیسی خوبیاں کم زور ہوچکی تھیں۔ ان حالات میں یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا تھا کہ مسلمان اپنے معاملات میں دوسروں پر کس حد تک اعتماد کرسکتے ہیں؟ بعض حضرات نے

اسے انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھا کہ افراد صحیح اور غلط ہر طرح کے ہوتے ہیں، ان کے متعلق کوئی عمومی فیصلہ درست نہ ہوگا۔ بعض حضرات نے اسے بہ حیثیت قوم دیکھا اور عمومی رائے قائم کی۔

اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ مسلمانوں کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی کی کیفیت ختم ہوچکی ہے، ان کا اخلاقی امتیاز باقی نہیں رہا، بلکہ بعض پہلوؤں سے ان کا معیار دوسروں سے فروتر ہے۔ معاملات میں دوسرے ان سے زیادہ بھروسہ کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ان پر مسلمانوں سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال بعض قدیم رایوں پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہے۔

غیرمسلموں اور ان کے حقوق کے ذیل میں دار الاسلام، دار الحرب اور دار الامان جیسی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔ یہ اصطلاحیں قرآن و حدیث میں استعمال نہیں ہوئی ہیں، بلکہ فقہائے کرام نے اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف ممالک کی حیثیت واضح کرنے کے لیے وضع کی ہیں۔ ان کے نزدیک دار الاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور مسلمان امن و امان کی زندگی گزار رہے ہوں اور مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں کسی قسم کا خوف اور خطرہ نہ لاحق ہو۔ دار الحرب وہ ہے جہاں کفر وشرک کا غلبہ ہو اور احکام کفر و شرک جاری ہوں۔ دار الاسلام اور دار الحرب کے درمیان امن کا معاہدہ ہوتو وہ دار الامن ہوگا۔ ان سب کے احکام مختلف ہیں، اس وقت دنیا کا کوئی ملک دار الاسلام ہونے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہے، اسی طرح اس نے کسی ملک کو دارالحرب قرار دے کر اس سے اعلانِ جنگ نہیں کر رکھا ہے۔ دنیا کے بیش تر ممالک بین الاقوامی معاہدوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ حالات اس موضوع پر ازسرنو غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مسلم ممالک کی از روئے شرع ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کریں، ان کے حدود میں انھیں اپنے عقیدے اور مذہب پر عمل کی

آزادی ہو، انھیں ترقی کے مواقع فراہم ہوں اور ان پر کسی بھی قسم کے ظلم اور زیادتی کا قانوناً سدِّ باب ہو۔

مسلمان جہاں اقلیت میں ہیں وہ دو طرح کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ غیر جمہوری ممالک میں وہ بنیادی حقوق تک سے محروم ہیں۔ انھیں اپنے دین و ایمان کو بچانا دشوار ہو رہا ہے۔ وہ اپنے وجود و بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جمہوری ممالک میں بڑی حد تک بنیادی حقوق انھیں حاصل ہیں، انھیں جان ومال اور عزت و آبرو کا تحفظ ملا ہوا ہے، عقیدہ اور عبادت کی آزادی میسر ہے، وہ آزادی سے نماز اور روزے پر عمل کر سکتے ہیں، زکوٰۃ کا اپنا نظم چلا سکتے ہیں، حج کی انھیں اجازت ہے، مساجد کی تعمیر اور ان کی آبادکاری کا نظم کر سکتے ہیں، جمعہ اور عیدین کے قیام کی انھیں اجازت ہے، عائلی قوانین نکاح، طلاق، وراثت، وقف اور ہبہ جیسے معاملات میں اسلامی قانون ان پر نافذ ہوتا ہے، وہ دینی اور دنیوی تعلیم کا نظم کرنے اور دینی مدارس اور دنیوی تعلیم کے ادارے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں ازروئے دستور انھیں مساوی حقوق حاصل ہیں اور وہ حکومت میں برابر کے شریک ہیں۔ بڑی بات یہ کہ جمہوری ممالک میں انھیں اپنے دین کی تبلیغ کی اجازت حاصل ہے۔ وہ اسے عام کر سکتے ہیں۔ جس ملک کے یہ حالات ہوں اسے وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ دین پر عمل کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ کے جو مواقع انہیں فراہم ہیں ان سے انھیں فائدہ اٹھانا ہوگا۔ ظاہر ہے، یہ صورتِ حال دار الحرب یا دارالاسلام کی نہیں ہے۔ کسی جمہوری ملک کو نہ تو دار الاسلام کہا جاسکتا ہے اور نہ اس پر دارالحرب کا اطلاق ہوتا ہے۔ دار الاسلام کی طرح یہاں غیر مسلموں کے حقوق کا سوال نہیں پیدا ہوتا، اس لیے کہ ازروئے دستور انھیں بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ یہاں ان سے تعلقات کی نوعیت بھی وہ نہیں ہوگی جو حربیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جمہوری ملک کو ایک آزاد دعوتی ملک کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا۔ مسلمان کی حیثیت یہاں ازروئے دستور دوسرے شہریوں کی طرح ایک پرامن آزاد شہری کی ہے۔ اسی حیثیت سے غیر مسلموں

سے اس کے تعلقات استوار ہوں گے اور غیر مسلم اس سے تعلقات قائم کریں گے۔

میں برادر عزیز ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے پوری کتاب کی توجہ سے پروف ریڈنگ کی، مضامین اور مآخذ کی فہرست تیار کی اور کتاب میں جن مسلم شخصیات کا ذکر آیا ہے ان کا اشاریہ مرتب کیا۔ یہ اشاریہ امید ہے اس کتاب کے لیے بھی اور اس نوعیت کی دوسری علمی کتابوں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ میں نے ان تمام چیزوں پر ایک نظر ڈال لی ہے، اس کے باوجود غلطی اور فرو گزاشت کا امکان ہے۔ اس کی نشان دہی علمی خدمت ہوگی اور ان شاء اللہ آئندہ اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اوراق اس کے دین کو سمجھنے کا ذریعہ ثابت ہوں، اس کے بندوں کو ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے، اپنے فضل و کرم سے وہ انھیں شرفِ قبولیت سے نوازے، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے۔ انّہٗ سمیع قریب مجیب۔

جلال الدین

۲؍ اگست ۱۹۹۸ء

غیر مسلموں سے تعلقات
اور ان کے احکام

غیر مسلموں سے تعلقات

اسلام کی تصویر جن مختلف پہلوؤں سے بگاڑنے بلکہ مسخ کرنے کی مسلسل کوشش ہوتی رہتی ہے ان میں غیر مسلموں سے تعلقات کا پہلو بہت ہی نمایاں اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام انفرادیت پسند ہے، وہ مسلمانوں میں علیٰحدگی کے جذبات ابھارتا ہے، وہ انھیں دوسروں سے کاٹتا اور الگ تھلگ کرتا ہے، وہ اپنوں اور غیروں کے درمیان اتنا زبردست فرق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کے ساتھ عام انسانی تعلقات کا بھی روادار نہیں ہوتا، وہ اخلاق کا درس ضرور دیتا ہے، لیکن اس کا تعلق اپنے ماننے والوں سے ہے، دوسروں سے نہیں ہے، جو لوگ اسلام کے دائرہ میں آجائیں انھیں وہ باہم اخلاقی رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس دائرہ سے باہر اس کی تعلیمات کا رخ بدل جاتا ہے اور وہ ایک دوسری ہی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ شکل بڑی بھیانک ہے۔ اس میں محبت کی جگہ نفرت و عداوت اور نرمی کی جگہ سختی اور درشتی نمایاں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کا جو مزاج بناتا اور جس طرح کی ذہنی تربیت کرتا ہے اس سے ان کی اپنے مخالفین سے ازخود مخاصمت شروع ہوجاتی ہے اور وہ ہر محاذ پر ان سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔

اسلام کی اس خود ساختہ تصویر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جن ذہنوں کی پیداوار ہے وہ یا تو ناواقفیت کا شکار ہیں یا دوسروں کو فریب اور دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام، مسلمانوں کو باہم اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، انھیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے، ان کے باہم اخلاقی اور قانونی حقوق مقرر کرتا ہے، ان کے درمیان تعاون و تناصر کا جذبہ بیدار کرتا ہے[1] اور انھیں ایک نظامِ حیات دے کر ایک امت بناتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام نے اس امت کو ایک اعلیٰ نصب العین دیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کے دین کی علم بردار بن کر اٹھے، انسانوں کو ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح کا پیغام دے، دنیا میں خیر کو عام کرے، بھلائیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو مٹائے۔ اس دین کے بارے میں یہ تصور کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ وہ انسانوں کے دلوں میں کدورت اور نفرت پیدا کرتا ہے، انھیں ایک دوسرے کا حریف اور دشمن بناتا ہے اور ان کے تعلقات میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ بنتا ہے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

آئندہ صفحات میں غیر مسلموں سے تعلقات کے بارے میں اسلامی تعلیمات کسی قدر تفصیل سے پیش کی جارہی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اجنبیت کی دیوار نہیں کھڑی کی ہے، بلکہ ان تعلقات کو وہ ایک سماجی، معاشرتی اور معاشی ضرورت سمجھتا ہے۔ اگر غیر مسلم سے خونی رشتہ اور خاندانی تعلق ہو تو اسے وہ خاص اہمیت دیتا ہے۔ یہ تعلیمات صاف بتاتی ہیں کہ اسلام پر سختی سے قائم رہتے ہوئے اور اس کے احکام کی پوری طرح پابندی کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے افراد سے انتہائی شریفانہ روابط رکھے جاسکتے ہیں اور رکھے جانے چاہئیں۔ یہ دین داری کے منافی نہیں، بلکہ اس کی ہدایت کے مطابق ہے۔

---

[1] اس کی کسی قدر تفصیل راقم کے مضمون 'اہلِ ایمان کے باہمی تعلقات' میں موجود ہے۔ مطبوعہ ماہنامہ 'زندگی نو' نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۸۹ء

خاندانی تعلقات

(حسنِ سلوک کی خصوصی ہدایات)

اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے

اسلام نے اللہ تعالیٰ کا جو تصور دیا ہے اس میں اس کا رحمٰن و رحیم ہونا نمایاں ہے۔ اس کا ثبوت قرآن مجید کے آغاز ہی میں سورۂ فاتحہ سے ملتا ہے۔ اس کا ابرِ رحمت پوری کائنات پر ہر آن برس رہا ہے۔ اسی سے اس کا وجود قائم ہے، ہر گوشۂ عالم میں اس کی رحمت کے آثار ہویدا ہیں۔ انسان اپنی پوری زندگی میں اور زندگی کے ہر لمحہ میں اس کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔

انسان سے رحم اور ہمدردی مطلوب ہے

اسلام چاہتا ہے کہ انسان بھی رحمت کا پیکر ہو، اس کے اندر محبت، الفت، تعاون، ہمدردی اور غم خواری کے جذبات موجزن ہوں۔ اس کی سیرت و کردار سے رحم دلی کا مظاہرہ ہو، اس کا سینہ سنگ دلی اور شقاوت سے پاک ہو، وہ اپنے ابناءِ نوع کے ساتھ وہ سلوک کرے، جس کی توقع وہ خدا کی ذات سے کرتا ہے اور جس سے وہ اپنی تمام کم زوریوں کے باوجود شب و روز بہرہ ور ہوتا رہتا ہے۔ وہ ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہے، ظلم و عدوان سے اس کا دامن داغ دار نہ ہو، اس کے اندر عفو و درگزر کی صفت پائی جائے، وہ جذبات سے مشتعل نہ ہو، طیش میں نہ آئے اور غصہ پر قابو رکھے، صبر و ثبات کا دامن نہ چھوڑے اور معاشرہ میں محبت اور رحمت کی خوشبو پھیلاتا رہے:

وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ جو ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کرتے ہیں اور رحم کھانے کی تاکید کرتے ہیں۔ (البلد:۱۷)

صلۂ رحمی کی اہمیت اور اس کی ہدایت

انسانی تعلقات کے استحکام کا پہلا قدم صلہ رحمی ہے۔ اس کا تعلق خونی رشتوں سے ہے۔ اسلام نے ان رشتوں کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کی تعلیمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فطری طور پر جو رشتے اور ناطے ہیں ان کا احترام ہو، ان سے بہتر اور خوش گوار تعلقات ہوں، ان کے حقوق پہچانے جائیں اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی سے احتراز کیا جائے۔ اگر انسان کا اپنے قریب ترین دائرہ میں بہتر سلوک ہو تو توقع ہے کہ وسیع تر دائرہ میں بھی اس کا رویہ محبت و اخوت اور ہمدردی کا ہوگا اور پورے معاشرہ پر اُس کے خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے، لیکن اگر قرابت دار بھی انسان کے ظلم و جور کا شکار ہونے لگیں تو جن افراد سے اس کا دور کا واسطہ ہے وہ اس کی زیادتیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ صلۂ رحمی کے بغیر محبت، شرافت اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے نزدیک انسان کے قرابت دار اس کے حسن سلوک، تعاون اور ہمدردی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اللہ کے نیک بندے ان کے حقوق سے غافل نہیں ہوتے:

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ○ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ○

جو اللہ سے کیے گئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس کے عہد کو نہیں توڑتے اور جو ان رشتوں کو جوڑتے ہیں، جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا جنھیں خوف لاحق رہتا ہے۔ (الرعد:۲۰،۲۱)

اللہ تعالیٰ سے غافل اور دنیادار انسانوں کا حال بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی ان اعلیٰ صفات سے عاری ہوتی ہے اور وہ فساد فی الارض مچاتے پھرتے ہیں:

وَ الَّذِیْنَ یَنقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ ٗبَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَ لَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِo	جو لوگ اللہ سے کیے گئے عہد کو مضبوط بنانے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انھیں کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے آخرت میں برا انجام ہے۔ (الرعد:۲۵)

اسلام نے معاشرہ کے فلاح کی بنیاد عدل و احسان، قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی، فحش و منکرات اور ظلم و عدوان سے اجتناب پر رکھی ہے۔ ان اعلیٰ اقدار کے بغیر کسی مہذب سماج کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ الْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَo	بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اور قرابت داروں کو (ان کا حق) دینے کا۔ اور وہ منع کرتا ہے فحش اور منکر سے، ظلم اور سرکشی سے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (النحل:۹۰)

غیر مسلم والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

قرابت اور رشتہ داری کی بنیاد والدین ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تاکید کی ہے[۱] اس میں گو کہ غیر مسلم بھی آتے ہیں، لیکن غیر مسلم والدین کی طرف سے کبھی جارحانہ رویہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے اور نزولِ قرآن کے وقت مسلمان نوجوان اسی رویہ سے دوچار تھے۔ اس صورتِ حال میں اندیشہ تھا کہ مسلمان اولاد پر اس کا ردعمل ہو اور وہ غیر مسلم والدین کے ساتھ کوئی

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' باب 'خدمت کے یہ مستحق ہیں'۔

نامناسب سلوک کر بیٹھیں، اس لیے ہدایت کی گئی کہ عقیدہ ہر چیز پر مقدم ہے۔ ماں باپ اگر توحید کے مقابلہ میں شرک و کفر کی دعوت دیں اور اس پر اصرار کرنے لگیں تو ان کی بات ناقابل قبول ہوگی اور وہ کسی حال میں نہیں مانی جائے گی، لیکن ان کی زیادتیوں کے باوجود ان کے دنیوی حقوق ادا کیے جائیں گے اور وہ کبھی نظر انداز نہ ہوں گے۔ ارشاد ہے:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْناً عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصَالُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْلِیْ وَ لِوَالِدَیْکَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ○ وَ اِنْ جَاهَدٰکَ عَلٰى اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا○ (لقمان: ۱۴، ۱۵)

ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے کم زوری پر کم زوری اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے، اس لیے ہم نے اسے وصیت کی کہ تم میرا بھی شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔ میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مان اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق اپنا برتاؤ رکھ۔

ان آیات میں صاف طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ والدین کے ساتھ، چاہے وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں، حسن سلوک کیا جائے گا۔ ان کے شرک و کفر کی وجہ سے کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ ہوگی۔ علامہ ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے 'وَ اِنْ جَاهَدٰکَ' الخ (اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے) کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے کہ حسن سلوک کا یہ حکم مسلم والدین اور غیر مسلم والدین دونوں ہی کے لیے ہے۔ پھر یہ فرما کر کہ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا (دنیا میں ان کے ساتھ معروف کے مطابق برتاؤ رکھو) اس حکم کو موکد اور مستحکم کر دیا ہے۔

اس کے قانونی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ باپ اگر اولاد کو قتل کردے تو اس سے (شریعت کے عام ضابطہ کے مطابق)

قصاص نہیں لیا جائے گا، وہ اس پر تہمت لگائے تو اس پر حد نہیں جاری ہوگی، اولاد کے قرض کی عدم ادائیگی پر اسے قید نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ والدین محتاج ہوں تو ان کا نان ونفقہ اولاد پر واجب ہوگا، اس لیے کہ یہ ساری چیزیں معروف کے ساتھ برتاؤ میں آتی ہیں اور اس کے خلاف اقدام اس کے منافی ہوگا۔''[1]

فقہ حنفی کہا گیا ہے کہ آدمی کے والدین چاہے مسلمان ہوں یا کافر، ان کا نان و نفقہ اس پر واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے ساتھ بھی برتاؤ میں معروف کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ اس کا تقاضا ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ''**لیس من المعروف ان یعیش فی نعم اللّٰہ تعالٰی و یتر کھما جوعا**'' یعنی یہ کوئی نیکی اور معروف نہیں ہے کہ آدمی خود تو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے اور والدین کو بھوکا مرنے چھوڑ دے۔[2]

علامہ قرطبیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

والاٰیۃ دلیل علٰی صلۃ الاٰبوین الکافرین بما امکن من المال ان کان فقیرین وإلانۃ القول والدعاء الی الاُسلام برفق۔[3]

آیت دلیل ہے اس بات کی کہ کافر ماں باپ کے ساتھ مال کے ذریعہ ممکن حد تک صلۂ رحمی کی جائے گی اگر وہ محتاج ہوں اور ان کے ساتھ گفتگو میں ملاطفت برتی جائے گی اور اسلام کی طرف نرمی سے انھیں دعوت دی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس کا ثبوت حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے مشہور واقعہ سے ملتا ہے۔

فرماتی ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے بعد جب امن قائم ہوگیا) میری ماں، جو مشرک تھیں، مجھ سے ملنے آئیں۔[4] میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ مجھ

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۳/ ۴۳۳۔ احادیث سے ان تمام نکات کی تائید ہوتی ہے۔
[2] ہدایہ، ج ۲، ص ۴۲۵، ۴۲۶۔ نیز ملاحظہ ہو 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' ص ۶۳
[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۴/ ۶۵
[4] ان کا نام قتیلہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جاہلیت کے زمانہ میں طلاق دے دی تھی۔ فتح الباری: ۵/ ۲۳۳

سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ صلۂ رحمی کرو۔[1]

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بطور تحفہ گوہ، پنیر اور مکھن لائی تھیں، لیکن حضرت اسماء نے انھیں اپنے گھر میں آنے کی اجازت دینے اور ان کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرایا تو آپ نے ان سے کہا کہ وہ ان کا تحفہ قبول کر لیں اور اپنے گھر بھی آنے دیں۔[2]

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

فيه جواز صلة القريب المشرك[3]	اس حدیث سے مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلۂ رحمی کا ثبوت ملتا ہے۔

علامہ خطابیؒ نے لکھا ہے:

فيه ان الرحم الكافرة توصل من المال و نحوه كما توصل المسلمة و يستنبط منه وجوب نفقة الأب الكافر والأم الكافرة و ان كان الولد مسلما[4]	اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ کافر رشتہ کے ساتھ بھی مال وغیرہ کے ذریعہ صلہ رحمی کی جائے گی جیسا کہ مسلم رشتہ کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس سے یہ استنباط بھی کیا جاتا ہے کہ کافر باپ اور کافر ماں کا نفقہ واجب ہے، چاہے اولاد مسلمان ہو۔

غیر مسلم رشتہ داروں سے تعلقات

قرآن مجید نے والدین کے ساتھ رشتہ داروں کے حقوق بھی بیان کیے ہیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی ہے۔ احادیث میں بھی ان کے ساتھ

---

[1] بخاری، کتاب الہبۃ، باب الہدیۃ للمشرکین۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی الاقربین

[2] نیل الاوطار: ۶/ ۱۰۶، ۱۰۷ بحوالہ مسند احمد وغیرہ

[3] نووی: شرح مسلم، ج ۳، جزء ۷، ص ۸۹

[4] ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۲۳۴

حسن سلوک کا حکم ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم رشتہ دار دونوں ہی آتے ہیں۔ بعض قانونی احکام میں ان کے درمیان فرق ہے، لیکن حسنِ سلوک اور تعاون اور ہمدردی کے غیر مسلم رشتہ دار بھی مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ یہاں پہلے ایک قانونی فرق کی وضاحت کی جارہی ہے۔

قرآن مجید نے وراثت کے سلسلے میں یہ قانون بیان کیا ہے کہ آدمی کے خونی رشتہ دار ہی اس کے وارث ہوسکتے ہیں، غیر رشتہ دار وارث نہیں ہوسکتے۔ ورثاء کا اس نے تعین کر دیا ہے:

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ۝

ہم نے ہر ایک کے لیے، جو کچھ والدین اور قرابت دار چھوڑ جائیں، اس کے وارث مقرر کردیے ہیں۔ (النساء:۳۳)

اسلامی قانونِ وراثت میں دین کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔ ایک مسلمان کی وراثت کا حق اس کے مسلمان قرابت داروں ہی کو ہے۔ غیر مسلم قرابت دار اس کے وارث نہیں ہوں گے۔ اسی طرح غیر مسلم کی وراثت کا حق اس کے غیر مسلم رشتہ داروں ہی کو حاصل ہوگا۔ مسلمان رشتہ دار اس سے محروم رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی واضح حدیث ہے:

لاَ یرث المسلم الکافر و لاَ الکافر المسلم[1]

مسلمان نہ تو کافر کا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہوگا۔

وراثت کے کچھ اصول ہیں اور رشتہ داروں کے درمیان ایک ترتیب ہے۔ اسی لحاظ سے وہ وراثت کے حق دار ہوں گے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ

اور رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں

---

[1] بخاری، کتاب الفرائض، باب لایرث المسلم الکافر۔ مسلم، کتاب الفرائض۔ اس موضوع کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: جصاص، احکام القرآن: ۲/ ۱۲۲، ۱۲۳۔ نووی، شرح مسلم: ج ۴، جزء ۱۱، ص ۵۲، ۵۳۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۶/ ۱۹۲-۱۹۴

فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○	اللہ کے قانون میں۔ بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (الانفال:۷۵)

یہ بات صرف وراثت کی حد تک ہے۔ اس سے ہٹ کر جو رشتہ دار اور خویش و اقارب وارث نہیں ہیں، آدمی ان کی مدد اور تعاون کرسکتا ہے اور اسے کرنا چاہیے۔ وقتِ ضرورت ان کے حق میں وصیت بھی کی جاسکتی ہے:

وَ اُولُو الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهَاجِرِیْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِیَآءِكُمْ مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○	اور اللہ کی کتاب میں رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں دوسرے اہل ایمان اور مہاجرین سے۔ مگر یہ کہ تم اپنے رفیقوں کے ساتھ کوئی بھلائی کرنی چاہو تو کرسکتے ہو۔ یہ اللہ کی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ (الاحزاب:۶)

سوال یہ ہے کہ کیا غیر وارث مسلم عزیزوں اور قرابت داروں کی طرح غیر مسلم رشتہ داروں کی بھی مدد کی جاسکتی ہے اور ان کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے؟ فقہاء سلف نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے، اسے وہ جائز سمجھتے ہیں۔ اس کی بنیاد سورۂ احزاب کی یہی مذکورہ بالا آیت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے ایک یہودی عزیز کے لیے وصیت کی تھی۔[1]

حضرت عکرمہؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت صفیہؓ نے اپنا ایک مکان حضرت معاویہؓ کو ایک لاکھ میں فروخت کیا۔ انھوں نے ایک عزیز سے، جو یہودی تھا، کہا: اگر تم اسلام لے آؤ گے تو میرے وارث ہوجاؤ گے، لیکن اس نے ان کی بات نہیں مانی۔ پھر انھوں نے اس کے نام وصیت کردی۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق وصیت تیس ہزار کی تھی۔[2]

---

[1] دارمی، کتاب الوصایا، باب الوصیۃ لاہل الذمہ۔ ۲/۵۱۷۔ ایک اور روایت میں دو یہودی قرابت داروں کا ذکر ہے۔ ابو عبید، کتاب الاموال۔ ص ۵۴۳

[2] عبد الرزاق: المصنف: ۶/ ۳۳

امام شعبی کہتے ہیں:

تَجُوْزُ وصیة المسلم للنصرانی[۱] مسلمان، نصرانی کو وصیت کرسکتا ہے۔

ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے سورۂ احزاب کی آیت کے اس فقرہ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيَآئِكُمْ مَّعْرُوْفًا (مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ بھلائی کرو) کے بارے میں دریافت کیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: عطاء اور بخشش مراد ہے۔ میں نے کہا کہ کیا وہ بخشش جو ایک مومن اپنے کافر قرابت دار کو کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ زندگی میں وہ جو اسے دیتا ہے اور اپنے بعد اس کے لیے جو وصیت کرتا ہے۔[۲]

حضرت قتادہؒ سے اس فقرہ کی تشریح ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

الّا ان یکون لک ذو قرابة لیس علی دینک فتوصی له بالشیء هو ولیک فی النسب و لیس ولیک فی الدین ہاں اس کی اجازت ہے کہ تمہارا کوئی قرابت دار ہو جس کا دین تمہارا دین نہ ہو اور تم اس کے لیے وصیت کرو۔ وہ رشتہ کے لحاظ سے تمہارا ولی ہے، دین کے لحاظ سے ولی نہیں ہے۔

حضرت حسن بصری نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے۔[۳]

محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس سلسلے میں نازل ہوئی ہے کہ مسلمان یہودی اور نصرانی کو وصیت کرسکتا ہے۔[۴]

صلۂ رحمی میں وقت ضرورت قرض دینا اور قرابت دار مجبور ہو تو قرض معاف کر دینا بھی شامل ہے۔

عبداللہ بن مروان نے حضرت مجاہدؒ سے پوچھا کہ میرا ایک مشرک رشتہ دار میرا مقروض ہے۔ کیا یہ قرض میں چھوڑ دوں؟ انھوں نے کہا: ہاں چھوڑ دو اور اس کے ساتھ

---

۱ عبدالرزاق، المصنف: ۶/ ۳۳ ۲ حوالہ سابق: ۶/ ۳۳، ۳۴

۳ حوالہ سابق: ۶/ ۳۳، ۳۴

۴ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۴/ ۱۲۶

صلۂ رحمی کرو۔[1]

اسلام چاہتا ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ سماجی تعلقات رکھے جائیں اور ان کے ساتھ محبت، ہمدردی اور تعاون کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کا ایک ذریعہ تحفے تحائف دینا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو ایک ریشمی جوڑا بطور تحفہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ریشم کے استعمال سے تو آپ نے (مردوں کو) منع فرمایا ہے، پھر یہ مجھے کس لیے عطا ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ اس لیے نہیں ہے کہ تم اسے پہنو، بلکہ اس لیے ہے کہ کسی اور کام میں لاؤ، کوئی دوسرا فائدہ اٹھاؤ۔ حضرت عمرؓ نے یہ جوڑا اپنے ایک (اخیافی) بھائی کو جو مشرک تھے، تحفہ میں بھیج دیا۔[2]

اس حدیث کے ذیل میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

و فی ھٰذا کلہ دلیل لجواز صلۃ الاقارب الکفار والاحسان الیھم و جواز الھدیۃ الی الکفار[3]	اس سب میں دلیل ہے اس بات کی کہ کافر قرابت داروں کی صلہ رحمی اور ان کے ساتھ حسن سلوک جائز ہے۔ اس میں کفار کو ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کا جواز بھی موجود ہے۔

امام ابن قیمؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ غیر مسلم رشتہ دار نادار ہو تو کیا اس کا نفقہ خوش حال مسلمان پر واجب ہے؟ اس میں اور وراثت میں کیا فرق ہے؟ وہ فرماتے ہیں: اختلاف دین کے باوجود قرابت داروں پر انفاق کے واجب ہونے کی دلیل قرآن کی آیت ہے، جس میں مشرک والدین کے بارے میں کہا گیا 'وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا' (ان کے ساتھ دنیا میں معروف کا معاملہ کرو) یہ نہ تو احسان ہے اور نہ معروف ہے کہ ماں باپ اور رشتہ دار انتہائی ضرورت مند اور فاقہ زدہ ہوں اور اولاد

---

[1] ابو عبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳

[2] بخاری، کتاب الھبۃ، باب الھدیۃ للمشرکین۔ مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم استعمال، آنیۃ الذھب و الفضۃ الخ

[3] نووی، شرح مسلم: ج ۵، جز ۱۴، ص ۳۹

خوش حال ہونے کے باوجود ان کو کس مپرسی کے حال میں چھوڑ دے۔ اللہ تعالیٰ نے صلۂ رحم کا حکم دیا ہے اور قطع رحم کی مذمت کی ہے۔ حدیث میں ہے: **لاَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعُ رَحْمٍ** [مسلم] (قطع رحم کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔ یہ صلۂ رحمی کے خلاف ہے کہ ایک مسلمان صاحب حیثیت ہونے کے باوجود ان غیر مسلم رشتہ داروں پر انفاق نہ کرے جو بھوکے پیاسے اور لباس کے محتاج ہیں۔ آگے فرماتے ہیں:

و صلة الرحم واجبة و ان كانت كافرة فله دينه و للواصل دينه[1]	صلہ رحمی واجب ہے، جس سے رحمی تعلق ہے چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے اس کا دین اور صلہ رحمی کرنے والے کا اپنا دین۔

بعض لوگوں نے انفاق کو وراثت پر قیاس کیا ہے کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے، اسی طرح ان کا نفقہ بھی لازم نہیں ہونا چاہیے۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ میراث کی بنیاد نصرت وحمایت اور موالات پر ہے۔ اس کے برخلاف نفقہ کا تعلق صلہ رحمی اور قرابت کے حقوق سے ہے۔ عدم ایمان کی وجہ سے قرابت دار کے دنیوی حقوق ساقط نہیں ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاعْبُدُواْ اللّٰهَ وَلاَ تُشْرِكُواْ بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ	اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرو اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت والے ہم سایہ، اجنبی ہم سایہ اور ساتھ بیٹھنے والے ہم سایہ اور مسافروں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ (النساء:۳٦)

اس آیت میں جن لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے ان کا حق واجب ہے، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سے قرابت داروں کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] احکام اہل الذمہ، جلد ۲، ص۷۹۱ - ۷۹۳

'احسان' کا سب سے نمایاں پہلو ضرورت پر انفاق ہے۔

غیر مسلم والدین اور قرابت داروں سے خونی رشتہ بہرحال ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کے احترام کی تعلیم دی ہے۔ ان کے دکھ درد میں کام آنے، ان سے خوش گوار تعلقات رکھنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اگر وہ دین سے پھیرنے کی کوشش کریں اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور اس سے بغاوت کی راہ پر لے جانا چاہیں تو ان کی اطاعت کسی قیمت پر نہیں کی جائے گی اور دین کی سربلندی کی راہ میں مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ بھی کیا جائے گا، لیکن ان کے دنیوی حقوق ادا کیے جاتے رہیں گے، ان میں کوتاہی نہ ہوگی۔

☆☆

عام انسانی تعلقات

(حسنِ سلوک کی عمومی ہدایات)

یہ بات واضح ہے کہ قرآن مجید نے غیر مسلم والدین کے ساتھ حسن سلوک کا بالفاظِ صریح حکم دیا ہے۔ اسی طرح غیر مسلم رشتہ دار بھی ازروئے شرع حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ ان کے قانونی حقوق بھی ہیں۔ جن غیر مسلموں سے خون اور رشتہ کا تعلق نہیں ہے، ان کے سلسلے میں عمومی ہدایات ہیں، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ بعض اخلاقی ہدایات مسلمانوں کو خطاب کر کے دی گئی ہیں، لیکن ان ہدایات پر عمل مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے سلسلے میں بھی ہوگا، دونوں کے ساتھ الگ الگ رویہ نہیں اختیار کیا جائے گا۔ خاص بات یہ کہ غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کے ذیل میں بعض شبہات کو رفع بھی کیا گیا ہے۔ ذیل میں ان پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

قرآن مجید میں والدین اور قرابت داروں کے علاوہ یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کی مذمت کی گئی ہے[1] یہ عام حکم ہے۔ اس لیے حسن سلوک ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مطلوب ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے، جس

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' باب 'خدمت کے یہ مستحق ہیں'۔

کسی کے ساتھ بھی غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے گا وہ غیر اسلامی رویہ ہوگا۔

قرآن مجید کی ان عمومی تعلیمات میں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے۔ اس کا تعلق فرد اور ریاست دونوں سے ہے۔ اس میں جنگی نفسیات اور سیاسی نزاکتیں بھی شامل ہوجاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے ان کے ساتھ جو مہذب اور شریفانہ رویہ اختیار کیا اس سے بہ آسانی ان عمومی تعلیمات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

انسان جب خدا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھتا ہے تو اس کے ہاتھوں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق محفوظ نہیں رہ پاتے۔ وہ کم زوروں، ناداروں، یتیموں اور مسکینوں پر ستم ڈھانے اور ان کے حقوق پر دست درازی کرنے لگتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہی گئی ہے۔[1] اس کے برخلاف خدا کے نیک بندوں کا کردار وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْناً وَّ یَتِیْماً وَّ اَسِیْراً ○ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوْراً ○

اور وہ کھانا کھلاتے ہیں، اس کی خواہش اور طلب کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں، تم سے کسی بدلہ یا شکریہ کے طالب نہیں ہیں۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا ڈر ہے جو سخت مصیبت والا اور طویل ہوگا۔ (الدھر:۸-۱۰)

معاشرہ کے کم زور افراد کو کھانا کھلانا، خدا کے نیک بندوں کے مجموعی کردار کی محض ایک علامت ہے۔ اس سے ان کی پوری زندگی کا رخ سمجھا جاسکتا ہے۔ یہاں اسی پہلو سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کم زوروں کو بے سہارا نہیں چھوڑتے،

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔ سورۃ الفجر: ۱۷-۱۹، سورۃ البلد: ۱۱-۱۷، سورۃ المدثر: ۴۴۔ اس کی پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ 'کم زور- اسلام کے سایہ میں' مطبوعہ ماہ نامہ 'زندگی' رام پور، اگست تا دسمبر ۱۹۷۸

مشکلات میں ان کے کام آتے ہیں، ان کو کھلاتے پلاتے اور ان کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔

یہاں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ قیدیوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ یتیم اور مسکین چاہے اپنے ہوں یا پرائے، ان کا تعلق کسی بھی قوم اور طبقہ سے ہو، ان کی بے کسی اور مظلومی کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہی احساس آدمی کے اندر ان سے ہمدردی کے جذبات ابھارتا ہے۔ وہ ان کی مدد کرے یا نہ کرے، انھیں مدد کا بہرحال مستحق سمجھتا ہے۔ صرف شقی القلب اور خود غرض انسان ہی ان جذبات کو دبا سکتا ہے۔ لیکن قیدیوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ سیاسی مجرم سمجھے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کا وہ جذبہ عام حالات میں مفقود ہوتا ہے جو کسی یتیم یا مسکین کے سلسلے میں پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قیدیوں کے ساتھ دنیا میں بہت ہی برا سلوک ہوتا رہا ہے، انھیں سخت سے سخت اذیتیں دی جاتی تھیں، وہ کال کوٹھریوں میں پڑے پڑے ختم ہوجاتے تھے، باہر نکلتے تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ہوتی تھیں، ان کی ضروریات کی تکمیل کی کوئی متعین صورت نہ تھی۔ بسا اوقات بھیک پر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔ ان حالات میں اسلام نے اپنے ماننے والوں کے اندر قیدیوں کے مجرم اور گناہ گار ہونے سے زیادہ ان کے انسان اور ہمدردی کے مستحق ہونے کا جذبہ ابھارا۔

یہ آیت سورۂ دہر کی ہے۔ عام طور پر علماء نے اسے مدنی قرار دیا ہے۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، مقاتل، کلبی اور یحییٰ بن سلام نے اسے مکی کہا ہے۔ اس کی تائید سورہ کے مضامین سے ہوتی ہے۔ مکہ کے اصحابِ ثروت اور زر پرست مسکینوں اور یتیموں کے ساتھ جس شقاوت اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے، قیدیوں کے ساتھ ان کا سلوک اس سے مختلف نہیں رہا ہوگا۔ اسلام نے اس پورے رویہ پر تنقید کی اور اللہ کے نیک بندوں کی تعریف کی کہ وہ ظلم و جور کے شکنجہ میں کسے ہوئے قیدیوں کو اپنی محبت اور حسنِ سلوک سے راحت پہنچا رہے ہیں۔ یہ بات جس پس منظر میں کہی گئی ہے اور عملاً

جوصورت حال تھی اس میں مسکین، یتیم اور قیدی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم ہی تھے۔ مکی دور میں گو مسلمان بہت تھوڑی تعداد میں تھے، لیکن ان کی یہ تصویر ابھر کر سامنے آ رہی تھی کہ ان کم زوروں کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردی، محبت اور انسان دوستی کا ہے۔

مشہور تابعی مفسر عکرمہ نے 'اسیر' سے غلام مراد لیا ہے۔[1]

غلامی بھی ایک طرح کی قید ہی ہے۔ قرآن مجید نے بندِ غلامی کو توڑنے اور غلاموں کو آزاد کرنے کی تحریک شروع کی اور ترغیب وتشویق کے ذریعہ اسے آگے بڑھایا۔

مدینہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو اللہ کے ان نیک بندوں نے قیدیوں کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا اس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ 'اسیر' سے اس آیت میں کس قسم کے قیدی مراد ہیں؟

ہر ریاست بعض خاص قسم کے جرائم کے ارتکاب پر اپنے شہریوں کو قید و بند کی سزا دیتی ہے۔ یہ شہری یا ملکی قیدی ہیں۔ ریاست حالتِ جنگ میں ہو تو دشمن کے افراد بھی قیدی بنائے جاتے ہیں۔ انھیں غیر ملکی قیدی کہا جاسکتا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں دونوں طرح کی رائیں ملتی ہیں۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

الاسیر من اھل الشِّرک یکون فی ایدیھم.	اسیر وہ ہے جس کا تعلق مشرکین سے ہے، جو مسلمانوں کے ہاتھ میں (قیدی) ہے۔

یہی تفسیر قتادہؒ اور سعید بن جبیرؒ نے کی ہے۔ حضرت قتادہؒ کہتے ہیں:

---

[1] ابن کثیر، تفسیر: ۴/ ۴۵۵

[2] ابن جریر، تفسیر: جزء ۲۹، ص۱۲۹، ۱۳۰

لقد امر اللّٰه بالاُسری ان یحسن الیھم و ان اسراھم یومئذ لاھل الشرک[1]	اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور اس دور میں ان کے قیدی اہل شرک ہی ہوتے تھے۔

ابن جریج کہتے ہیں:

لم یکن الاُسیر یومئذ الّا من المشرکین.	اس زمانہ میں قیدی مشرکین ہی میں سے ہوتے تھے۔

علامہ ابوعبید اس قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

یرید ان اللّٰه تعالیٰ قد حمد علی اطعام المشرکین[2]	ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو کھلانے پر تعریف کی ہے۔

حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کہتے ہیں کہ 'اسیر' اہل قبلہ (مسلمان) اور غیر اہلِ قبلہ (غیر مسلم) دونوں ہی ہوسکتے ہیں۔

امام قرطبی نے اسے ایک جامع قول قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: مشرک قیدی کو کھانا کھلانا بھی اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے، البتہ اس پر خرچ فرض صدقات سے نہیں، نفل صدقات سے ہوگا۔[3]

امام ابن جریر طبری کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ 'اسیر' کا لفظ عام ہے۔ وہ حربی بھی ہوسکتا ہے، جو جنگ میں گرفتار ہوتا ہے اور اہل قبلہ میں سے بھی ہوسکتا ہے، جسے کسی جرم میں گرفتار کیا گیا ہو۔ یہاں نیک بندوں کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ محض اللہ کی رضا اور اس سے تقرب کے لیے اور جذبہ رحم سے انھیں کھلاتے ہیں۔

آگے فرماتے ہیں۔ یہ بات قیامت تک کے لیے ہے۔[4]

۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۹/ ۱۲۹

۲۔ ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳.

۳۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۹/ ۱۲۹

۴۔ ابن جریر، تفسیر: جزء ۲۹، ص ۱۳۰

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ یہاں 'اسیر' سے مراد مشرک قیدی ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان قیدی کو علی الاطلاق 'اسیر' نہیں کہا جاتا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ قیدی کو کھانا کھلانا، اللہ سے تقرب کا ذریعہ ہے۔ آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرک قیدیوں پر ہر طرح کے اموالِ صدقات صرف کیے جاسکتے ہیں، لیکن (جیسا کہ پہلے گزر چکا) ہمارے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ اس سے وہ صدقات مستثنیٰ ہیں، جن کے وصول کرنے کا حق حاکم کو ہے۔[1]

رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ان تعلیمات کا عملی ثبوت ہے۔

جنگ بدر میں مشرکین کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر ہی قیدی بنائے گئے۔[2] رسول اللہ نے قیدیوں کو صحابہ کرامؓ کے درمیان تقسیم کر دیا اور نصیحت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔[3] اس پر عمل جس طرح ہوا اس کا ذاتی تجربہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابوعزیز بن عمیر کی زبانی سنئے:

وہ اس جنگ میں نضر بن حارث کے بعد مشرکین کے علم بردار تھے۔ فرماتے ہیں کہ انھیں بعض انصار کے حوالے کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی نصیحت کا ان پر یہ اثر تھا کہ صبح و شام کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے۔ ان میں سے کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ملتا تو مجھے دے دیتا، اسے ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ اس سے مجھے

---

۱ احکام القرآن: ۳/ ۵۷۹

۲ بخاری، کتاب المغازی۔ ابن ہشام میں ہے کہ قیدی ستاون تھے۔ ان میں بیش تر کا نام بنام ذکر ہے۔ ابن ہشام ۲/ ۳۶۴-۳۶۷۔ قیدیوں کی تعداد میں اور بھی اختلافات ہیں، بخاری کی روایت صحیح اور معتبر ہے۔ ملاحظہ ہو ابن کثیر۔ السیرۃ النبویۃ ۲/ ۴۵۶، ۴۶۳

۳ ماوردی نے ایک کم زور سی روایت نقل کی ہے کہ مہاجرین میں سے سات افراد نے بدری قیدیوں کی کفالت کا بوجھا اٹھایا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ حضرات ابوبکر، عمر، علی، زبیر، عبد الرحمٰن بن عوف، سعید بن العاص اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم۔ ماردی، النکت والعیون: ۴/ ۳۷۰۔ انصار کے سلسلے کی تفصیل نظر سے نہیں گزری۔

شرم سی محسوس ہوتی تھی۔[1]

یہ جنگ بدر کے قیدیوں کا ذکر ہے۔ اور قیدیوں کے ساتھ بھی یہی مہذب اور شریفانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يؤتى بالاسير فيدفعه الى بعض المسلمين فيقول احسن اليه فيكون عنده اليومين والثلاثة فيوثره على نفسه[2]	رسول اللہ ﷺ کے پاس قیدی لایا جاتا تو آپ اسے کسی مسلمان کے حوالہ کردیتے اور فرماتے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ یہ قیدی اس کے پاس دو تین دن رہتا اور وہ مسلمان اس کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا تھا۔

جنگ بدر کے قیدیوں ہی کے سلسلہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو میں سہیل بن عمرو کے اگلے دانت توڑ دوں، تاکہ اس کی زبان باہر نکل آئے اور وہ پھر کہیں آپ کے خلاف اپنی خطابت کا مظاہرہ نہ کرسکے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں (اس طرح کی) سزا دوں تو اللہ تعالیٰ مجھے بھی سزا دے سکتا ہے، گوکہ میں نبی ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے: ممکن ہے کہ کل وہ کسی ایسی حیثیت میں ہو جو تمہارے لیے ناگوار نہ ہو۔[3]

اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں ملکی قیدیوں اور قید خانوں کے متعلق قوانین موجود ہیں اور اصلاحات ہوئی ہیں، جنگی قیدیوں کے بارے میں بھی بعض بنیادی اصول تسلیم کیے جاتے ہیں، لیکن ایک تو ان کا چرچا زیادہ ہے، پابندی کم ہے، دوسرے یہ کہ ان اصلاحات اور قوانین کا تعلق ریاست سے ہے، عوام ان سے غیر متعلق رہتے ہیں، انھیں ان سے دلچسپی نہیں پیدا ہوتی۔ اسلام نے ریاست کے ساتھ اس کے ایک ایک فرد میں قیدیوں سے ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ اس کے نتیجے میں تاریخ نے یہ

---

[1] ابن ہشام: سیرۃ النبی: ۲/ ۲۵۶، ۲۵۷ [2] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/ ۱۹۶

[3] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲/ ۲۶۰، ۲۶۱

کارنامہ دیکھا کہ جو قوم اسلام کے ماننے والوں سے برسر پیکار تھی اور جو انھیں ختم کرنے اور مٹانے کے درپے تھی، اس کے افراد جب میدان جنگ سے گرفتار ہوکر آئے تو انھوں نے خود تکلیف اٹھا کر ان قیدیوں کو راحت پہنچائی، خود بھوکے رہے یا روکھی سوکھی کھا کر انھیں اچھا کھلایا پلایا، ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھا۔ ان کی یہ ساری خدمت بے لوث اور بے غرض تھی، وہ نام و نمود نہیں چاہتے تھے، انھیں کسی صلہ کی تمنا نہ تھی۔ ان کے سامنے صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوش نودی تھی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اسی کے لیے کرتے تھے۔

اس طرح اسلام نے بتایا کہ غیر ملکی اور دشمنوں کے صف سے گرفتار ہونے والے قیدی بھی بہتر سلوک کے مستحق ہیں، ان کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کرنا اور انھیں ذہنی اذیت پہنچانا ناروا ہے۔ وہ گو دشمن ہیں، لیکن انسان ہیں۔ جب وہ اپنے حقوق حاصل کرنے میں آزاد نہیں ہیں تو ان کے انسانی حقوق کا احترام ہمارا فرض ہے۔ ریاست کو یہ حق بھی ہے کہ اگر اس کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ کے انھیں آزاد کردے۔ یہ سب باتیں اسلام کے قوانینِ جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ ان سے دنیا نے جنگ و صلح کے بین الاقوامی اصول و آداب سیکھے اور بہت سی اصلاحات کیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں تو دشمن کے قیدیوں کے ساتھ اس حسن سلوک کا ذکر ہو رہا ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی اور جس کا عملی نمونہ اس کے ماننے والوں نے پیش کیا۔

بعض لوگوں نے سورۂ دہر کی زیر بحث آیت کا تعلق مسلمان قیدیوں سے بھی جوڑا ہے، ظاہر ہے، برسرِ پیکار دشمن اور غیر ملکی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے، مسلمان قیدیوں کے سلسلے میں اس سے بہتر رویہ ہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ حضرت قتادہؓ کہتے ہیں:

کان اسیرھم یومئذ المشرک و اس وقت ان کے قیدی مشرک تھے (ان کے

اخوک المسلم احق ان تطعمہ[۱] ساتھ یہ حسن سلوک رہا) تمہارا بھائی جو مسلم ہے وہ تو اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اسے کھلاؤ پلاؤ (اور اس کی ضروریات کا خیال رکھو)۔

امام ابو یوسفؒ نے قیدیوں کے سلسلے میں خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو فساد، فسق و فجور اور چوری وغیرہ کسی جرم میں گرفتار کیا جائے تو اگر وہ صاحب حیثیت ہے تو اسی کے مال سے اس پر خرچ کیا جائے، لیکن نادار ہے اور زندہ رہنے کا سامان نہیں کرسکتا تو اس پر صدقہ کیا جائے، یا بیت المال سے اس پر صرف کیا جائے، دونوں ہی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں، لیکن میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ بیت المال اس کا خرچ برداشت کرے۔

مزید فرماتے ہیں کہ جب ایک مشرک قیدی کو کھلانا پلانا اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے تو مسلمان کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسے بھوک سے مرنے کے لیے کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟

مسلمان خلفاء، قیدیوں کے کھانے پینے اور سردی گرمی میں ان کے لباس کا نظم کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت علی بن ابی طالبؓ نے عراق میں اور پھر حضرت معاویہؓ نے شام میں اس پر عمل کیا۔

اس کے بعد امام ابو یوسفؒ نے قید خانوں کی اصلاح کی تجاویز پیش کی ہیں۔[۲]

اسلام کی روح یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی اور شہری قیدیوں کے ساتھ بھی بہتر سے بہتر سلوک ہو۔ اسلامی تاریخ اسی کا ثبوت فراہم کرتی رہی ہے۔ اس کے لیے جو قواعد وضوابط بنائے جائیں، ان میں یہی روح کارفرما ہونی چاہیے۔

غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات

اسلام کی عمومی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے ایک اور مثال غیر مسلم پڑوسیوں سے

۱۔ ابن جریر طبری، تفسیر: جزء ۲۹، ص ۱۳۰۔ زمخشری، الکشاف: ۴/ ۱۹۶

۲۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۴۹-۱۵۱

تعلقات کی ہے۔

انسان کا عملاً سب سے قریبی تعلق اس کے پڑوس سے ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا مضبوط ہو وہ اتنا ہی سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ پڑوسی اس کے لیے خطرہ نہیں ہے، اس سے اسے کوئی نقصان اور گزند نہیں پہنچے گا، بلکہ اس کی جان مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی اور وہ اس کے دکھ درد اور آسائش و راحت میں شریک ہوگا تو وہ یک سوئی اور دل جمعی کے ساتھ کاروبارِ حیات میں اپنی ذمے داری ادا کرسکتا ہے، ورنہ وہ سخت دشواریوں سے گزرے گا۔ اسلام نے انسان کو بہترین پڑوسی بننے کی تعلیم دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

مَن کان یومن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلا یؤذ جارہٗ[1]

جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے اپنے پڑوسی کو اذیت نہیں پہنچانی چاہیے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میرے محبوب (ﷺ) نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اپنے پڑوسیوں میں سے، جس کے گھر ضرورت ہو اس میں سے کچھ اسے بھیج دو۔[2]

پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم عام ہے۔ اس کے مستحق مسلمان پڑوسی کی طرح غیر مسلم پڑوسی بھی ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ہاں بکری ذبح ہوئی تو آپ نے گھر والوں سے ایک سے دو بار دریافت کیا کہ ہمارے فلاں یہودی پڑوسی کو اس میں سے کچھ بھیجا ہے؟ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل مجھے پڑوس کے سلسلے میں اس قدر تاکید کرتے تھے کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ اسے وارث نہ بنا دیں۔[3]

اس حدیث کے حوالے سے علامہ رشید رضا مصری کہتے ہیں:

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق الجوار

[2] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ

[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق الجوار

هٰذا دلیل علٰی ان ابن عمر فهم من الوصایا المطلقة فی الجـار انها تشمل المسلم و غـیر المسلم و ناهیک بفهمہٖ و علمہٖ.[1]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے پڑوس کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلے میں جو مطلق تاکیدیں آئی ہیں ان سے یہ سمجھا کہاں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا علم و فہم تمھارے لیے کافی ہونا چاہیے۔

اس کے بعد پڑوسیوں کا حق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و من الاحسان الی الجار الاهداء الیه و دعوته الی الطعام و تعاهده بالزیارة و العیادة[2]

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بھی شامل ہے کہ اسے ہدیہ اور تحفہ دیا جائے، کھانے پر بلایا جائے اور ملاقات اور عیادت کے ذریعے اس کی خبر گیری کی جاتی رہے۔

قرآن مجید میں پڑوسی کی ایک قسم 'الجار الجنب' بتائی گئی ہے۔ بعض علماء نے اس سے یہودی اور نصرانی مراد لیے ہیں۔ اس حوالے سے علامہ قرطبی کہتے ہیں:

فالوصاة بالجار ما مور بها مندوب الیها مسلما کان او کافرا.[3]

پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے۔ یہ مندوب اور پسندیدہ ہے۔ پڑوسی چاہے مسلمان ہو یا کافر۔

اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات عام ہیں، ان کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے۔ ان پر عمل جس طرح اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ ہوگا اسی طرح دیگر مذاہب والوں کے ساتھ بھی ہوگا۔

مسلمانوں سے متعلق ہدایات میں غیر مسلم بھی داخل ہیں

قرآن و حدیث کی بہت سی تعلیمات وہ ہیں، جو مسلم معاشرہ کے پیش نظر دی گئی ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے؟ لیکن معنوی لحاظ سے یہ عام ہدایات ہیں، ان سے غیر مسلم خارج نہیں ہیں۔

---

[1] رشید رضا، تفسیر المنار: ۵/ ۹۲ [2] حوالہ سابق

[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵/ ۱۸۴

ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیے وہی سلوک غیر مسلم کے ساتھ بھی اس کا ہونا چاہئے۔ دونوں کے سلسلے میں دو الگ رویے وہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اس طرح کی دو ایک تعلیمات کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

مسند احمد، امام بخاری کی الادب المفرد، طبرانی اور بیہقی میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اجیبوا الداعی ولاَ تردّوا الهدیة ولاَ تضربوا المسلمین.

دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرو، ہدیہ کو واپس مت کرو اور مسلمانوں کو زد و کوب مت کرو۔

دعوت اور ہدیہ قبول کرنے کے کچھ آداب ہیں۔ یہاں ان کا ذکر نہیں ہے۔ آخری فقرہ ہے 'ولاَ تضربو المسلمین' علامہ مناوی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: مسلمانوں کو مت مارو سوائے اس کے کہ ان پر کوئی حد لازم آجائے یا کسی غلطی پر تادیب کرنی پڑے۔ ان کے ساتھ لطف و محبت کا معاملہ کرو۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا اسوہ تھا۔ آپ نے کسی خادم یا غلام یا لونڈی کو اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں مارا۔ تقویٰ سے قریب تر رویہ یہ ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیا جائے۔ مسلمان کو بلا وجہ مارنا گناہ کبیرہ ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

و التعبیر بالمسلم غالبی فمن لہ ذمة او عهد معتبر یحرم ضربه تعدیًا [1]

مسلمان کا ذکر غالب صورت حال (مسلم معاشرہ) کے پیش نظر ہے، ورنہ اسلامی ریاست میں جو ذمی ہے یا جس کے ساتھ معتبر عہد و پیمان ہے، ناحق اسے مارنا بھی حرام ہے۔

کسی مسلم یا غیر مسلم کو زد و کوب کرنا غلط اخلاقیات کی ایک مثال ہے۔ اس سے اس حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کسی بھی غلط اخلاقی رویہ کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔ ایک مسلمان کا جو رویہ ہونا چاہیے اس کا اندازہ ایک دوسری حدیث سے ہوتا ہے۔

---

[1] مناوی، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر: ۱ / ۱۶۴

ابن ماجہ کی روایت ہے۔

اذا استشار احدکم اخاہ فلیشر علیہ تم میں سے کسی سے اس کا بھائی مشورہ کرے تو اسے (صحیح) مشورہ دے۔

علاوہ مناوی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے کسی دینی معاملہ میں مشورہ طلب کرے تو جو بات اس کے حق میں بہتر ہو اسی کا مشورہ دے، ورنہ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے ساتھ خیانت ہوگی۔ اس لیے خیر خواہی لازم ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

ذکر الاخ غالبی، فلو استشار ذمی کان کذٰلک[۱] بھائی کا ذکر غالب صورت حال (مسلم معاشرہ) کی بنا پر ہے۔ اگر کوئی ذمی مشورہ کرے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام نے غیر مسلموں سے ربط و تعلق سے کہیں منع نہیں کیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کی ہدایت یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا جائے، ان سے خونی رشتہ ہو تو اس کا احترام کیا جائے، بہ حیثیت انسان ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔ وقت ضرورت ان کی خدمت کرنا اور ان کے دکھ درد میں کام آنا اس کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل اور کارِ ثواب ہے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ ذہنی تحفظات تھے تو اسلام نے انھیں رفع کیا ہے اور کسی قسم کے شک و شبہ کو باقی رہنے نہیں دیا ہے۔

غیر مسلموں پر خرچ کرنا بھی خدا کی راہ میں انفاق ہے

قرآن مجید نے اس خیال کی اصلاح کی کہ انفاق صرف مسلمانوں پر ہونا چاہئے۔ اس نے واضح کیا کہ غیر مسلموں کے دکھ درد میں کام آنا اور ان کی مالی مدد کرنا بھی راہِ خدا میں انفاق ہی کی ایک صورت ہے۔

---

[۱] مناوی، فیض القدیر: ۱/ ۲۷۵

سورۂ بقرہ میں ایک جگہ راہِ خدا میں انفاق کا ذکر ہے، اس کی ترغیب ہے، اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ خرچ کرنے اور نام و نمود اور ریاکاری سے بچنے کی تاکید ہے، کھلے چھپے ہر طریقہ سے انفاق کا حکم ہے، خاص طور پر ان لوگوں کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت ہے جو دست سوال دراز نہیں کرتے۔ (آیت ۲۶۱ تا ۲۷۴) عین ان تفصیلات کے بیچ میں ایک آیت آئی ہے جو قابل غور ہے او رہمارے موضوع سے اس کا خاص تعلق ہے۔ ارشاد ہے:

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰهُمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ○ (البقرۃ: ۲۷۲)

(اے پیغمبرؐ!) آپ پر ان کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔ تم جو بھی مال اللہ کی راہ میں خرچ کروگے اس کا فائدہ تم ہی کو پہنچے گا۔ (دیکھو) تم اللہ کی رضا ہی کے لیے تو خرچ کرتے ہو۔ تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اس کا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی نہ ہوگی۔

یہ آیت یہاں کیوں آئی ہے؟ اس کا اصل مضمون سے کیا تعلق ہے؟ اس بارے میں تفسیر میں متعدد روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت تھی کہ مسلمان جو کچھ صدقہ و خیرات کریں وہ مسلمانوں پر کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

ایک روایت میں اس ممانعت کی وجہ بھی بیان ہوئی ہے۔ سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ ذمیوں میں جو حاجت مند ہوتے مسلمان ان پر انفاق کیا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں ہی میں حاجت مندوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا:

لاَ تتصدقوا الاّ علی اھل دینکم — اپنے ہم مذہب لوگوں ہی پر تم صدقہ و خیرات کرو۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان لوگوں پر بھی خرچ کرنے کی اجازت دی گئی

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/ ۳۲۳، ۳۲۴

جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں[۱]

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے۔ فرماتے ہیں: انصار کے رشتے بنو قریظہ اور بنو نضیر سے تھے۔ انصار ان پر اپنا مال خرچ کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان پر خرچ کیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[۲]

یہ روایت بتاتی ہے کہ پس منظر میں یہود اور ان سے تعلقات تھے۔ گویا آیت نے ہدایت کی کہ ان کے نادار بھی حسن سلوک کے مستحق ہیں اور ان پر بھی انفاق ہونا چاہیے۔ بعض دوسری روایات میں اس پس منظر کے ساتھ مشرکین کا ذکر ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مشرکین پر انفاق نہیں فرمایا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[۳]

یہی بات صحابہ کرامؓ کے بارے میں بھی کہی گئی ہے کہ وہ اپنے مشرک قرابت داروں پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کی اجازت انھیں دے دی گئی[۴]

حضرت قتادہؓ ایک عمومی بات بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے بعض صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ جو لوگ ہمارے ہم مذہب نہیں ہیں، کیا ان پر انفاق کیا جاسکتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[۵]

اسلام کی جس طرح ہر طرف سے مخالفت ہو رہی تھی اور اس کے ماننے والے جس طرح جور وستم کا نشانہ بنائے جا رہے تھے، اس کے خلاف مسلمانوں کے اندر ردّ عمل

---

۱ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۳/ ۳۲۷

۲ ابن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن ۵ / ۵۸۸، طبع جدید

۳ ابن جریر: ۵ / ۵۸۷

۴ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۴ / ۱۹۱، نیز ابن جریر، حوالہ سابق

۵ ابن جریر: ۵ / ۵۸۸

کا پایا جانا غیر فطری نہ تھا۔ ان کے دل میں کبھی یہ سوال ابھرتا ہوگا کہ ان کے خویش و اقارب اور دور ونزدیک کے لوگ آخر اس دین کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں جس میں سب کی صلاح و فلاح کا سامان ہے؟ کبھی یہ سوچتے ہوں گے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں ہمدردی کی جائے اور مشکلات میں ان کی مدد کی جائے جو زندگی بھر ہمارے راستے میں کانٹے بچھاتے اور ناوک فگنی کرتے رہے؟ کبھی یہ خیال آتا ہوگا کہ ان دشمنانِ دین کے ساتھ تعاون کا کوئی اجر وثواب بھی ہے یا نہیں؟ کبھی یہ خواہش موج زن ہوتی ہوگی کہ کاش یہ ایمان لے آتے اور ہم اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیتے۔ اوپر کی روایات ان سب کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے انفاق اور اس کے تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے اس جذبہ کی بھی اصلاح کی ہے کہ تعاون اور ہمدردی کے مستحق صرف اپنے ہم مذہب افراد ہیں اور ان ہی کے ساتھ حسن سلوک ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ انسانوں کی خدمت کی راہ میں عقیدہ و خیال اور دین و مذہب کے اختلاف کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ جو شخص ضرورت مند ہے اس کی مدد کرنا دینی اور اخلاقی فرض ہے، چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مشرک ہو یا اہلِ کتاب، رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار۔ آدمی کی یہ خواہش یا اصرار کہ لوگ ایمان لے آئیں تو ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے اندر طلب صادق پائی جاتی ہے اسے وہ اس دولت سے نوازتا ہے۔ آدمی یہ سوچ کر انسانوں کی خدمت اور فلاح و بہبود کے کام کرتا چلا جائے کہ اس کا اجر وثواب اللہ نے چاہا تو محفوظ ہے اور کل وہ اس کے کام آئے گا۔ اس پورے پس منظر کے ساتھ آیت ان بہت سے الزامات کی تردید کرتی ہے، جو اسلام کے کردار پر کیے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مسلم وغیر مسلم ہر فرد اور ہر طبقہ پر صدقہ وخیرات کی ہدایت فرما دی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فامر بالصدقة بعدها على كل من سألک من كل دين[1]	اس آیت کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ کسی بھی دین کا ماننے والا تم سے سوال کرے تو اس پر خرچ کرو۔

اس سلسلے کی ایک اور روایت ہے:

تصدقوا على اهل الاُديان[2]	تمام اہلِ مذاہب پر صدقہ و خیرات کرو۔

حضرت سعید بن میسّبؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی گھرانے پر صدقہ کیا تھا جو بعد میں بھی جاری رہا۔[3]

اس آیت کے سیاق وسباق سے بحث کرتے ہوئے علامہ قرطبی کہتے ہیں:

هٰذا الكلام متصل بذكر الصدقات فكانه بيّن فيه جواز الصدقة على المشركين[4]	یہ آیت صدقات کے ذکر سے ملی ہوئی ہے۔ گویا اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشرکین پر صدقہ کرنا جائز ہے۔

اس بحث کا تعلق مسئلہ کے اخلاقی پہلو سے ہے۔ آیئے، اب ذرا اس کے فقہی اور قانونی رخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے مال کا کتنا اور کون سا حصہ غیر مسلموں کی مدد اور ان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں خرچ کرسکتا ہے اور کون سا حصہ خرچ نہیں کرسکتا؟

اسلامی شریعت میں صدقات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو فرض اور واجب ہیں اور دوسرے وہ جن کی نوعیت فرض یا واجب کی تو نہیں ہے، لیکن اللہ کی رضا کے لیے کیے جاتے ہیں۔ فرض صدقات میں سب سے پہلے زکوٰۃ کا سوال سامنے آتا

---

[1] ابن کثیر، تفسیر: ۱/ ۳۲۴

[2] رواہ ابن ابی شیبہ عن سعید بن جبیر مرسلاً (نصب الرایۃ لاحادیث الھدایۃ: ۲/ ۳۹۸)

[3] ابو عبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳۔ نصب الرایۃ: ۲/ ۳۹۸

[4] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۲/ ۳۳۷

ہے۔ زکوٰۃ مال کی ایک خاص مقدار یا نصاب پر فرض ہوتی ہے۔ یہ صاحبِ نصاب مسلمانوں سے لی جاتی ہے اور متعین مدات میں غریب مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی ہے۔ علاّمہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اموالِ زکوٰۃ غیر مسلم پر صرف نہیں ہوں گے[1] دوسرے صدقات کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

صدقۂ فطر رمضان المبارک کے ختم ہونے پر ہر صاحبِ حیثیت یا فقہ حنفی کی رو سے ہر صاحب نصاب مسلمان پر واجب ہوتا ہے۔ یہ صدقہ اسے اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرنا ضروری ہے۔

صدقۂ فطر کے بارے میں امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کے حکم میں ہے، لہٰذا اسے زکوٰۃ ہی کی طرح مسلمانوں پر صرف ہونا چاہیے، لیکن امام ابوحنیفہ ذمیوں پر بھی اس کے صرف کو جائز سمجھتے ہیں۔ عمرو بن میمون، عمرو بن شرحبیل اور مرہ ہمدانی کے بارے میں آتا ہے کہ فطرہ کی رقم میں سے وہ راہبوں کو بھی دیا کرتے تھے[2]

ابو میسرہ کہتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس صدقۂ فطر جمع کرتے، وہ پورا کا پورا یا اس کا ایک حصہ راہبوں کو دیتے تھے[3]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے:

ولاَ یجوز ان یدفع الزکوٰۃ الی ذمی و یدفع الیہ ما سوی ذٰلک من الصدقۃ[4]	کسی ذمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے صدقات اسے دیے جاسکتے ہیں۔

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۴/۱۰۶، ۱۰۷

[2] ابوعبید، کتاب الاموال ص ۵۴۳۔ نیز ملاحظہ ہو ابن قدامہ، المغنی: ۴۰/ ۳۱۴، ۳۱۵

[3] ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳

[4] ہدایہ، ج ۱، ص ۱۸۵

فطرہ کے بارے میں کہا گیا ہے:

و یؤدی المسلم الفطرة عن عبده الکافر[۱] مسلمان اپنے اس غلام کی طرف سے بھی فطرہ ادا کرے گا جو کافر ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص نے فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے قرآن مجید کی بعض آیات کا حوالہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات مشرکین پر بھی کیے جاسکتے ہیں، لیکن احادیث سے ثابت ہے کہ زکوٰۃ کی تمام قسمیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''مجھے تمھارے اصحاب ثروت سے زکوٰۃ وصول کرنے اور تمھارے اصحابِ حاجت پر اسے لوٹا دینے کا حکم ہے۔'' اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جن صدقات کے وصول کرنے کا حق امام یا ریاست کو ہے وہ ذمیوں پر صرف نہیں ہوسکتے، ان کے علاوہ دوسرے تمام صدقات ذمیوں کو دیے جاسکتے ہیں، جیسے نذر کا صدقہ، غلطیوں کے کفارہ کا صدقہ، یا صدقہ فطر۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ صدقات واجبہ غیر مسلموں پر صرف نہیں کیے جاسکتے۔ اسے انھوں نے زکوٰۃ پر قیاس کیا ہے۔[۲]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے فقہاء کے ہاں اس مسئلے میں کتنی وسعت ہے اور انھوں نے کتنی گنجائش رکھی ہے۔

زکوٰۃ ایک چھوٹی سی مد ہے، جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کی جاتی ہے۔ دیگر صدقات واجبہ کی تعداد بھی بہت تھوڑی ہے۔ ان سے ہٹ کر انسانوں کی خدمت، تعاون اور ہمدردی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ اسلام ان سب کی ترغیب دیتا اور تشویق پیدا کرتا ہے۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

---

۱ ہدایہ، ج۱، ص۱۸۹۔ اس پر جن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے ان کی صحت وضعف پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو نصب الرایۃ: ج۲، ص۴۱۲-۴۱۴

۲ جصاص، احکام القرآن: ۵۴۷، ۵۴۸

محاربین اور غیر محاربین کے درمیان فرق

جو لوگ اسلام کے نظامِ فکر و عمل سے اختلاف رکھتے ہیں وہ دو طرح کے رویے اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک رویہ عداوت اور مخاصمت کا ہوگا۔ وہ مسلمانوں کو آزادی اور امن و سکون سے رہنے نہ دیں اور اسلامی ریاست سے ان کی جنگ جاری ہو۔ دوسرا رویہ آزادی، حریتِ فکر و عمل اور ظلم و زیادتی سے اجتناب کا ہوگا۔ اسلام نے ان دونوں رویوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ سے عام انسانی ہمدردی اور تعاون سے منع نہیں کرتا، البتہ موالات اور رازدارانہ تعلقات سے احتراز کا حکم دیتا ہے، کیوں کہ یہ چیز دشمن کو تقویت پہنچانے کے ہم معنیٰ ہے۔ جہاں تک دوسرے گروہ کا تعلق ہے اس کے ساتھ حسنِ سلوک، تعاون اور ہمدردی کی بہرحال اجازت ہے۔ اس نے اس سے منع نہیں کیا ہے[1]

سورہ ممتحنہ میں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے:

لَا يَنۡهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَ لَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ○ اِنَّمَا يَنۡهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قٰتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَ اَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ وَ ظٰهَرُوۡا عَلٰۤى اِخۡرَاجِكُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ وَمَنۡ يَتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ○ (الممتحنہ: ۸، ۹)

اللہ تعالیٰ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[2] اللہ تعالیٰ تو تمھیں اس بات سے منع کرتا ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی، جو شخص ان سے دوستی کرے وہی ظالم ہے۔

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث 'غیر مسلموں سے عدم تعلق کے احکام کا پس منظر' کے ذیل میں آ گے آ رہی ہے۔

[2] اس کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے تمھارے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کی اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس آیت میں وہ کون لوگ مراد ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر ظلم و زیادتی نہیں کی اور اس طرح کا اقدام کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا؟ اس کے جواب میں سلف سے حسب ذیل رائیں ملتی ہیں:

۱- حضرت حسن بصریؒ اور ابو صالحؒ کا بیان ہے کہ یہ آیت بنوخزاعہ، بنوحرث بن کعب، کنانہ، مزینہ اور عرب کے بعض دیگر قبائل سے متعلق نازل ہوئیں، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے صلح کر رکھی تھی کہ وہ آپ سے جنگ نہیں کریں گے اور آپ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے۔

۲- بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس میں بنو ہاشم کے ان افراد کی طرف اشارہ ہے جو ان لوگوں میں شامل نہیں تھے، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا تھا۔ ان ہی میں حضرت عباسؓ بھی ہیں۔

۳- حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت غیر مسلم عورتوں اور بچوں سے متعلق ہے۔ (اس لیے کہ ان کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا)۔[1]

سلف کی ان تشریحات میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ ان میں سے ہر تشریح کسی خاص پہلو کو واضح کر رہی ہے۔ ان سب کو سامنے رکھنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

اسلامی ریاست کا جن قبیلوں، قوموں اور ملکوں سے صلح و آشتی کا معاہدہ ہوگا،

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ظلم کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا ان کے ساتھ تمھارا رویہ عدل و انصاف پر مبنی ہونا چاہیے۔ یہ بات ناانصافی کی ہوگی کہ انھیں بھی دشمنوں کی صف میں رکھا جائے اور دونوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا جائے۔ اس کا ایک اور مفہوم ابن عربی مالکی نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قسط سے مراد یہاں عدل نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی حصہ کے بھی آتے ہیں۔ یہی اس جگہ مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حسن سلوک اور صلہ رحمی کی خاطر اپنے اموال کا ایک حصہ ان پر خرچ کرو اس لیے کہ جہاں تک عدل کا تعلق ہے وہ محارب اور غیر محارب سب کے ساتھ واجب ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: **و تقسطوا الیهم ای تعطوهم قسطا من اموالکم و لیس یرید به من العدل فان العدل واجب فی من قاتل و فی من لم یقاتل**۔ احکام القرآن: ۲/ ۲۴۹

[1] آلوسی، روح المعانی، جزء ۲۸، ص ۷۵۔ نیز ملاحظہ ہو رازی، تفسیر کبیر: ۸/ ۱۳۴

ان کے ساتھ عدل و انصاف اور رواداری ہی کا نہیں، بلکہ برّو احسان کا رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جو قوم اسلامی ریاست سے برسر پیکار ہے، اس میں بھی ایسے گروہ اور طبقات ہوسکتے ہیں، جن کے دل میں اسلامی ریاست سے حریفانہ جذبات نہ ہوں اور جو اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ ان کے ساتھ بھی بہتر تعلقات رکھنے اور تعاون اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

اسی طرح محارب قوم کے وہ افراد، جو جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے (جیسے عورتیں، بچے اور معذور وغیرہ) ان کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہیں کیا جائے گا جو برسرِ جنگ افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے، بلکہ وہ ہمدردی اور لطف و محبت کے مستحق ہوں گے۔

علامہ ابن جریر طبری اس آیت کے ذیل میں سلف سے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کی بہتر اور صحیح توجیہ ان حضرات نے کی ہے جنھوں نے کہا ہے کہ کسی بھی دین و ملت کے وہ افراد جو برسرِ جنگ نہ ہوں، ان کے ساتھ عدل و انصاف اور حسنِ سلوک کیا جائے گا۔ اس میں ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان فرق نہیں کیا جائے گا۔ آیت کو منسوخ بھی نہیں کہا جاسکتا، اس لیے کہ اہل حرب میں سے کسی سے قرابت اور رشتہ داری ہو یا نہ ہو، اس کے ساتھ نیکی اور بھلائی ممنوع اور ناجائز نہیں ہے، بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کا کوئی راز ان پر نہ کھلے یا ساز و سامانِ حرب کے ذریعے انھیں تقویت نہ پہنچائی جائے۔[۱]

ذمیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ ذمی اور حربی کے درمیان ایک مسلمان کے رویہ میں فرق ہوگا۔ ذمی اسلامی ریاست کا شہری ہوتا ہے اور اسے ایک طرح

---

[۱] ابن جریر، تفسیر، طبع قدیم، جزء ۲۸، ص ۴۱

کا معاہدۂ امن حاصل ہوتا ہے۔ اس کے احکام حربی کے احکام سے مختلف ہیں۔ ذمی کے دکھ درد میں کام آنا اور مشکلات میں اس کی مدد کرنا ایک اخلاقی فریضہ ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں:

''آیت کے الفاظ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ میں عموم ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمیوں کو صدقات دیے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہے جو ہم سے برسر جنگ ہیں، البتہ اس سے حربی کو صدقات دینے کی ممانعت نکلتی ہے (اس لیے کہ ریاست سے وہ حالت جنگ میں ہے)۔''[1]

محارب قوم سے انسانی تعلقات

کسی قوم سے حالت جنگ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے عام انسانی تعلقات بھی نہ رکھے جائیں اور مصیبت میں اس کے ساتھ ہمدردی نہ کی جائے اور اس کی تکلیف پر خوشی منائی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ یہ بتاتا ہے کہ دشمن اگر نازک حالات سے گزر رہا ہے اور معاشی یا کسی نوع کی ہمدردی کا مستحق ہے تو اس کے ساتھ تعاون ہونا چاہیے۔ امام محمد فرماتے ہیں:

''حربی یا ذمی کی مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ کے پاس پانچ سو درہم بھجوائے، تاکہ وہ مکہ کے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں انھیں تقسیم کردیں۔''

مزید فرماتے ہیں:

''صلۂ رحمی ہر مذہب میں پسندیدہ ہے۔ دوسروں کو ہدیہ بھیجنا مکارم اخلاق میں شمار ہوتا ہے۔''[2]

---

[1] علامہ ابوبکر جصاص کے الفاظ یہ ہیں: 'ان تبروھم و تقسطوا الیھم' عموم فی جواز دفع الصدقات الی اھل الذمة: اذ لیس ھم من اھل قتالنا، فیه النھی عن الصدقة علی اھل الحرب. احکام القرآن: ۳/۵۳۷۔ نیز ملاحظہ ہو: روح المعانی، جزء ۲۸، ص ۷۵۔ ذمیوں کے حقوق پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔ [2] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۹۲

معاشرتی تعلقات

موجودہ دور میں انسان کی ضروریاتِ زندگی کا دائرہ بہت ہی وسیع ہوتا چلا گیا ہے اور ان میں بڑا تنوع آگیا ہے۔ آج کی تیز رفتار مادی ترقی کے ساتھ ان میں روز بروز اضافہ ہی کا امکان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بستی، شہر یا علاقہ ہی کے لیے نہیں بڑے سے بڑے ملک کے لیے بھی ان ضروریات کے سلسلے میں خود کفیل ہونا دشوار ہو رہا ہے۔ اس کے لیے ایک علاقہ کو دوسرے علاقہ سے اور ایک ملک کو دوسرے ملک سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اس طرح درآمد و برآمد ہر ملک کی ضرورت بن گئی ہے۔ ایک چیز ایک ملک میں تیار ہوتی ہے، دوسرا ملک اس کے لیے منڈی فراہم کرتا ہے۔ جن چیزوں کی ضرورت ہے یا جو چیزیں لازمۂ حیات بن گئی ہیں، ان کی پیداوار اور تیاری پر کسی خاص قوم یا ملک کی اجارہ داری نہیں ہے۔ انھیں کوئی بھی ملک تیار کرسکتا ہے اور جہاں جس قسم کی ضرورت ہو، فراہم کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ بین الاقوامی حالات اور آمد و رفت کی سہولتوں نے قوموں اور ملکوں کو قریب کر دیا ہے۔ کسی ملک کے افراد کا دوسرے ملک میں لمبی مدت تک قیام، بلکہ وہاں جا کر آباد ہو جانا بھی ناممکن نہیں رہا۔ ان حالات میں ایک مسلمان کے سامنے ان اشیاء کے استعمال کا سوال آتا ہے جنھیں غیر مسلم تیار کرتے ہیں۔ اس وقت خاص طور پر غذا اور لباس اور ان کے متعلقات زیر بحث ہیں۔ ان ہی کے ذیل میں بعض سوالات پر گفتگو کی جائے گی۔

معاشرتِ عرب کے بعض پہلو

غذا اور لباس کا تعلق تہذیب اور معاشرت سے جڑا ہوا ہے۔ دنیا کی ہر قوم کی طرح مشرکین عرب کی بھی خاص تہذیب اور معاشرت تھی، رسوم و رواج تھے، ان کی مخصوص غذائیں تھیں، ان کی تیاری کا اپنا ایک طریقہ تھا۔ خوشی کے مواقع پر تقریبات اور دعوتوں کا رواج تھا اور ہر تقریب کا الگ نام تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ عرب کی اسی تہذیب اور معاشرت میں پیدا ہوئے، صحابہ کرامؓ کا بھی اسی ملک اور اسی تہذیب سے تعلق تھا۔ آپؐ کی اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی غذا، لباس، رہن سہن اور معاشرت وہی تھی جو اہل عرب کی تھی۔

غذاؤں کی حلّت وحرمت

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی غذا کے لیے جن اشیاء کا استعمال کرتا ہے مذہب کی دنیا میں ان کی حلت وحرمت کا سوال بڑا اہم رہا ہے۔ بعض چیزیں ایک

---

[1] بعض تقریبات کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا:

١- ولیمہ: نکاح کے بعد کی تقریب۔

٢-عقیقہ: بچہ کی پیدائش پر ساتویں دن کی دعوت۔

٣- اعذار: ختنہ کے موقع پر کی جانے والی دعوت۔

٤- النقیعہ: وہ دعوت جو سفر سے بہ عافیت واپسی پر کی جائے۔

٥- الوکیرہ: مکان کی تعمیر کی خوشی میں کی جانے والی دعوت۔

٦- الجفلیٰ: دعوت عام۔

٧- النقریٰ: دعوت خاص۔

دعوت کے لیے جو کھانا تیار کیا جاتا اسے المأدبہ کہا جاتا۔

ملاحظہ ہو: ابو عمر احمد بن محمد بن عبد اللہ الاندلسی، العقد الفرید، بحث اطعمۃ العرب۔ ٦/٢٩٠-٢٩٢ متعلقہ الفاظ کی وضاحت اور تشریح کے لیے لسان العرب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان تقریبات میں سے بعض کو رسول اکرم ﷺ نے باقی رکھا۔ اس لیے انھیں سنت کا درجہ حاصل ہے۔

مذہب میں جائز اور مباح ہیں تو دوسرے مذہب میں وہ ممنوع اور حرام سمجھی گئی ہیں۔ اہل عرب بھی اشیاء کی حلت وحرمت کے قائل تھے، لیکن اس کی بنیاد زیادہ تر مشرکانہ تصورات اور اوہام وخرافات پر تھی۔ اسلام نے ان کے باطل تصورات کی اصلاح کی اور کہا کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے:(النحل:۱۱۶) اس کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۂ انعام مکی سورت ہے۔ اس میں مشرکین کے غلط رسوم و رواج اور مذہبی خیالات پر تفصیل سے جرح وتنقید ہے۔ اسی میں ارشاد ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّماً عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَماً مَّسْفُوْحاً اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقاً اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لاَ عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○ (الانعام:۱۴۵)

کہہ دو کہ مجھ پر جو وحی آئی ہے اس میں کسی کھانے والے پر جو چیزیں کہ وہ کھاتا ہے، میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار یا بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت، اس لیے کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ جانور پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے، لیکن اگر کوئی (جان بچانے کے لیے ان محرمات کے کھانے پر) مجبور ہوجائے اور وہ حد سے نہ بڑھے اور زیادتی نہ کرے تو تمہارا رب بڑا معاف کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔[۱]

اس آیت میں بعض وہ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں جنھیں اہلِ عرب حلال سمجھتے اور بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض اور چیزوں کی حرمت بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ جیسے شراب کی حرمت (المائدۃ:۹۰،۹۱) یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔[۲]

---

۱ اس سلسلے کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' ص ۱۰۰-۱۰۱۔

۲ قرآن وحدیث میں مطعومات ومشروبات میں کن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور کن چیزوں کی حرمت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور کن چیزوں میں کراہت پائی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۷/ ۱۱۵-۱۲۳

اشیاء میں اصل حلّت ہے

اشیاء کی حلّت و حرمت کے سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ اشیاء میں اصل حلّت ہے۔ حرام صرف وہی اشیاء ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ ایک مسلمان ان سے لازماً احتراز کرے گا۔ اس کے علاوہ ساری چیزیں حلال ہیں، انھیں وہ استعمال کرسکتا ہے۔ حرام و حلال کے اس فرق کے ساتھ وہ جس معاشرہ کا فرد ہے اور جہاں اس کی نشو ونما ہوئی ہے، وہاں کی غذا اس کی غذا ہوگی اور وہ جہاں بھی جائے گا اور جس ماحول میں بھی رہے گا مناسبِ حال اور اپنی پسند کی غذا استعمال کرے گا۔ جو چیزیں وہ خود کھا سکتا ہے وہ دوسروں کو بھی کھلا سکتا ہے اور ان کے ساتھ ان چیزوں کے کھانے پینے میں شریک بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا بھی فرق نہیں ہے۔ حلال چیزیں غیر مسلم تیار کریں تو ان کی خرید وفروخت اس کے لیے جائز ہوگی۔

اب آیئے اس موضوع کے بعض پہلوؤں کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے مطالعہ کیا جائے۔

غیر مسلم کا پانی پاک ہے

پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حلال اور پاک نعمت ہے۔ ہر جاندار کی حیات کا اس پر دار و مدار ہے۔ یہ نعمت سب کے لیے ہے۔ بہت سے لوگ انسانوں کے درمیان ذات پات اور رنگ ونسل کی بنیاد پر فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کوئی شخص، جسے وہ کم تر ذات کا سمجھتے ہیں، پانی کو ہاتھ لگا دے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے اور اس کا استعمال ان کے لیے ممنوع ہو جاتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پانی اصلاً پاک ہے، کسی فرد کے ہاتھ لگانے سے وہ ناپاک نہیں ہو جاتا۔ وہ ناپاک اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس میں کسی نجس اور ناپاک چیز کی آمیزش ہوجائے۔ چناں چہ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام نے غیر مسلموں کا پانی کھانے پینے، حتیٰ کہ عبادات تک کے لیے استعمال کیا ہے۔

حضرت عمران بن حصینؓ ایک سفر کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رات میں ہم نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ صبح سب کی آنکھ لگ گئی۔ نماز قضا ہوگئی۔ فوراً بعد میں ادا کی گئی۔ ہمارے پاس پانی ختم ہوچکا تھا۔ شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کچھ سواروں کے ساتھ مجھے پانی کی تلاش میں بھیجا۔ جب ہم نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت پانی سے بھرے ہوئے دو مشک اپنی اونٹنی پر لیے جا رہی ہے۔ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ پانی کہاں مل سکتا ہے؟ اس نے کہا: قریب میں پانی نہیں ہے۔ میں اپنے قبیلے سے ایک دن اور ایک رات کا فاصلہ طے کر کے پانی لا رہی ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک بیوہ عورت ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ہیں۔ ہم اسے لے کر رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ کے حکم پر اونٹنی کو بٹھایا گیا۔ آپ نے مشک پر دست مبارک رکھا۔ تھوڑا سا پانی لے کر اس پر کلی کی۔ اس کے بعد آپ کا یہ معجزہ دیکھنے میں آیا کہ ہم چالیس افراد تھے، ہم سب نے اس سے پانی پیا اور ہمارے پاس جو چھوٹے بڑے برتن تھے، سب بھر لیے۔ ایک صاحب کو غسل کی حاجت تھی۔ انھیں اس کے لیے پانی دیا گیا۔ اس کے باوجود یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مشک اس قدر بھرے ہوئے ہیں کہ پھٹے جا رہے ہیں۔ آپ نے اس عورت سے فرمایا: دیکھو ہم نے تمھارا پانی کم نہیں کیا ہے۔ پھر آپ کے حکم سے ہم لوگوں نے بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اور کھجوریں اسے دیں۔ آپ نے اس سے کہا: جاؤ، یہ اپنے بچوں کو کھلاؤ۔ اس نے اپنے قبیلہ میں پہنچ کر پورا واقعہ سنایا تو سب لوگ اسلام لے آئے۔[۱]

حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے شام کے سفر میں ایک نصرانی عورت کے گھر سے گرم پانی لے کر وضو کیا۔[۲]

---

۱ بخاری، کتاب المغازی، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب قضاء الفایت و استحباب تعجیلہ۔ قاضی شوکانی کہتے ہیں: ثبت فی الصحیحین انہ صلی اللہ علیہ وسلم توضأ من مزادۃ مشرکۃ۔ نیل الاوطار: ۱/۲۶

۲ بخاری، کتاب الوضو، باب وضوء الرجل مع امرأتہ۔ قرطبی نے دار قطنی کے حوالہ سے اس واقعہ کی تفصیل نقل کی ہے۔ الجامع لاحکام القرآن: ۱۳/۴۴،۴۵

امام شافعیؒ نے اس روایت کو یوں نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی عورت کے گھڑے سے پانی لے کر وضو کیا۔[۱]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل کتاب کے پانی کو اس تفصیل میں گئے بغیر کہ وہ کس قسم کا پانی ہے، استعمال کیا جاسکتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مشرک کے پانی سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اگر اپنی عبادت کے لیے وضو کرتا ہو تو اس کے بچے ہوئے پانی سے بھی وضو کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر متعین طور پر یہ معلوم ہو کہ پانی نجس ہے تو وضو صحیح نہ ہوگا۔[۲]

غیر مسلم کی غذا کا حکم

اب غذاؤں کو لیجیے۔ انسان کی غذا میں کئی طرح کی چیزیں شامل ہیں:

۱۔ بعض چیزیں قدرت کی طرف سے اسے تیار شدہ شکل میں مل جاتی ہیں۔ جیسے پھل اور میوے۔ اس میں انسان کا دخل صرف زراعت، شجرکاری اور آب پاشی وغیرہ کی حد تک رہتا ہے۔ بعض اوقات بغیر محنت کے بھی یہ چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ انھیں اگر کوئی غیر مسلم پیدا کرتا ہے تو اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جس طرح مسلمان کی پیداوار جائز ہے اسی طرح غیر مسلم کی پیداوار بھی جائز ہے۔ یہی حکم گیہوں، چاول اور دیگر غذائی اجناس کا ہے۔

۲۔ بعض چیزیں وہ ہیں جنھیں آدمی ان کی فطری حالت میں بطور غذا استعمال نہیں کر پاتا، اس لیے ان میں اپنی جسمانی حالت، مزاج اور معدہ کی رعایت سے مناسب ترمیم کر کے استعمال کرتا ہے۔ اسی کے لیے وہ گیہوں سے آٹا تیار کرتا اور آٹے سے روٹی پکاتا ہے، یا دانوں سے تیل نکال کر استعمال کرتا ہے۔ اگر یہ خدمات کوئی

---

۱ ابن حجر، فتح الباری: ۱/ ۲۹۹

۲ ابن حجر، فتح الباری: ۱/ ۲۹۹

غیر مسلم انجام دے تو مسلمان کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ اگر کوئی اس سے فائدہ اٹھانا نہ چاہے تو بقول علامہ قرطبی یہ اس کی احتیاط ہوگی، جواز بہرحال باقی رہے گا۔[1]

۳- جانور کا گوشت بھی انسان کی غذا میں شامل رہا ہے۔ اسلام کی رو سے حلال جانور کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ اس میں بعض اوقات تقرب اور عبادت کا پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس پر بحث آگے آرہی ہے۔

غیر مسلم کی تیار کردہ غذائی اشیاء

غیر مسلموں کی تیار کردہ حلال مطعومات استعمال کی جاسکتی ہیں۔ احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے:

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پنیر کا ٹکڑا پیش کیا گیا۔ آپ نے چھری طلب فرمائی، اللہ کا نام لے کر اسے قطع کیا اور تناول فرمایا۔[2]

پنیر حجاز میں تیار نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ شام وغیرہ سے آتی تھی۔[3]

حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خیبر میں مجھے چربی سے بھرا ہوا ایک جراب (چمڑے کا تھیلا) ملا۔ میں نے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیا اور کہا کہ میں کسی کو نہیں دوں گا۔ اتنے میں پلٹ کے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ مسکرا رہے تھے۔[4]

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہود کے ذبیحہ کی چربی کا استعمال مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ مالکیہ اور حنابلہ میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ چوں کہ چربی یہود کے لیے حرام تھی، اس لیے ان

---

۱ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/ ۷۷

۲ ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب فی اکل الجبن

۳ قاضی شوکانی رسول اللہ ﷺ کے پنیر کے استعمال کے بارے میں فرماتے ہیں۔ اکل من الجبن المجلوب من بلاد النصاریٰ کما اخرجہ احمد و ابو داؤد من حدیث ابن عمرؓ، نیل الاوطار: ۱/ ۲۶

۴ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب ذبائح اہل الکتاب و شحومها عن الجرب وغیرہم۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب جواز الاکل من طعام الغنیمۃ فی دار الحرب۔

کے ذبیحہ سے نکلی ہوئی چربی ہمارے لیے بھی حرام ہوگی، لیکن امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور جمہور علماء اس کے جواز کے قائل ہیں۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[1]

چربی کو محفوظ رکھنے اور اسے قابل استعمال بنانے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرتے رہے ہوں گے۔ چربی پر مکھن، گھی اور روغن وغیرہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

غیر مسلم کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے

دعوتیں اور تقریباً ہر معاشرت کا ایک لازمی جزء ہیں۔ اس سے خوشی میں شرکت ہوتی ہے، تعلقات استوار ہوتے ہیں اور قربت بڑھتی ہے۔ اسلام نے اس کی ترغیب دی ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دعوت دے تو اسے قبول کرنا پسندیدہ ہے، بلاوجہ اسے رد نہیں کرنا چاہیے[2]

غیر مسلم کے ساتھ بھی کھانا پینا مباح ہے۔ وقت ضرورت اسے دعوت دی جاسکتی ہے اور اس کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے۔ جس معاشرہ میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں وہاں اس طرح کی دعوتوں اور تقریبات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس سے دینی اور سماجی بہت سے فائدے اٹھائے جاسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا:

وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ	ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے
(المائدۃ:۵)	حلال ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ”تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے“ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے اور اسی کو ترجیح حاصل ہے کہ جس طرح تم ان کا ذبیحہ کھاسکتے ہو اسی طرح تم

---

[1] نووی، شرح مسلم، ج ۴، جزء ۱۲، ص ۱۰۲، ۱۰۳، نیز ملاحظہ ہو۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/ ۷۷

[2] ملاحظہ ہو: راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' ص ۱۶۹

انھیں اپنا ذبیحہ کھلا سکتے ہو، اس کی ممانعت نہیں ہے[۱]

رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے:

ان یھودیا دعا النبی ﷺ الی خبز شعیر و اھالۃ سنخۃ فاجابہ[۲]

ایک یہودی نے نبی ﷺ کو جو کی روٹی اور بدبودار چربی (یا تیل) کی دعوت دی۔ آپ نے قبول فرمائی۔

روایات سے ثابت ہے کہ جنگ خیبر کے ختم ہونے کے بعد ایک یہودی عورت نے آپ کے پاس بکری کا گوشت بھجوایا یا آپ کی دعوت کی، اس میں زہر تھا۔ آپ نے لقمہ لیتے ہی اسے تھوک دیا۔ اس کے باوجود اس کا اثر آپ پر ہوا۔ آپ کے ساتھی حضرت بشر بن براءؓ کا اسی سے انتقال ہوگیا۔[۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے کھانے پینے کا اہتمام بھی فرمایا ہے۔

قبیلہ ثقیف کے وفد کو، جو ابھی اسلام نہیں لایا تھا، آپؐ نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ حضرت خالد بن سعیدؓ اس کے کھانے کا نظم فرماتے تھے۔ وفد کے لوگ حضرت خالدؓ کے کھانے سے پہلے کھانا نہیں کھاتے تھے۔[۴]

۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۲۰

۲۔ مسند احمد: ۳/۲۱۱، ۲۷۰

۳۔ بخاری، کتاب المغازی، باب الشاۃ التی سمت، مع فتح الباری: ۷/ ۴۹۷۔ واقعہ کی تفصیل اور روایات کے اختلافات کے لیے دیکھی جائے: ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۳/ ۳۹۴۔ ۴۰۱۔ نیز ملاحظہ ہو راقم کا مضمون 'تحائف کی سماجی اور سیاسی اہمیت' سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ جنوری-مارچ ۱۹۹۶ء

۴۔ قبیلۂ ثقیف نے بعض شرائط کے ساتھ بعد میں اسلام قبول کرلیا۔ ابن ہشام: ۴/ ۱۹۴-۱۹۷۔ ابن کثیر، السیر ۃ النبویۃ: ۴/ ۵۴-۵۶

غیر مسلم کا ذبیحہ

جانور کا گوشت ہمیشہ سے انسان کی غذا میں شامل رہا ہے۔ اسلام نے حلال جانور کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے۔ اس کے ساتھ بعض شرطیں رکھی ہیں:

۱- حلال جانور بھی مردار نہ ہو، چاہے وہ طبعی موت مرا ہو، یا گلا گھونٹنے، یا چوٹ کھانے سے یا کسی بلند مقام سے گرنے یا دوسرے جانور کے سینگ مارنے اور حملہ کرنے سے اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ (المائدۃ:۳)

۲- اسے ذبح کیا جائے اور اللہ کے نام پر کیا جائے۔ مشرکین کہا کرتے تھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ جس جانور کو اللہ نے مارا ہے وہ تو ناجائز ہے اور جسے انسان ذبح کرے وہ حلال اور جائز ہے۔ قرآن نے اس نامعقول اعتراض کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور کہا کہ اللہ کے نام پر جو جانور ذبح ہو اس کے کھانے میں تکلّف نہیں ہونا چاہیے۔ ارشاد ہے:

فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ بِاٰیٰتِہٖ مُؤْمِنِیْنَo وَمَا لَکُمْ اَلَّا تَاْکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَکُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ (الانعام: ۱۱۸، ۱۱۹)

پس تم کھاؤ وہ جسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہے۔ اگر تم اس کی ہدایات پر یقین رکھتے ہو۔ آخر تم اس جانور کو کیوں نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے وہ چیزیں بتا دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں۔ (ان میں یہ ذبیحہ نہیں ہے)۔

۳- جو جانور اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کیا جائے اس کا کھانا حرام ہے۔ چناں چہ قرآن نے صراحت کی ہے:

وَلاَ تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَ اِنَّہٗ لَفِسْقٌ (الانعام:۱۲۱)

جس جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے اسے مت کھاؤ۔ بے شک یہ فسق ہے۔

۴- اسی وجہ سے جو جانور غیر اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے، جیسے بت پرست قومیں بتوں کے نام سے کرتی ہیں یا استھانوں پر جانور کا چڑھاوا چڑھاتی ہیں، اس کا

کھانا حرام ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ ... وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ — تم پر حرام کیا گیا ہے ...اور وہ جانور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ (البقرۃ:۱۷۳)

مشرکینِ عرب کسی آسمانی شریعت کے پابند نہیں تھے۔ انھوں نے مذہب کے نام پر حلال وحرام کے کچھ خود ساختہ طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ مردار تک کھا جاتے اور ذبح کرتے تو دیوی دیوتاؤں کے نام پر کرتے۔ اس لیے اسلام نے مشرکین کے ذبیحہ کو مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا۔ اس کے برخلاف اہلِ کتاب خدا اور وحی و رسالت کو اصولی طور پر مانتے اور اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ اس لیے ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا گیا۔ چناں چہ ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ — آج تمھارے لیے تمام پاک چیزیں حلال کردی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی اور تمہارا کھانا ان کے لیے بھی حلال ہے۔ (المائدۃ:۵)

آیت میں 'طعام' کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی کھانے کے ہیں۔ اس میں گو عموم پایا جاتا ہے، لیکن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے ذبیحہ مراد ہے[۱]۔ یہی بات متعدد تابعین سے مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، اس لیے کہ وہ غیر اللہ کے نام سے ذبح کو حرام سمجھتے ہیں اور اللہ ہی کے نام سے ذبح کرتے ہیں[۲]۔

علامہ ابن رشد کہتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔ تفصیلات میں بعض باتوں میں اتفاق ہے اور بعض میں اختلاف[۳]۔

---

[۱] امام بخاری فرماتے ہیں: قال ابن عباس: **طعامهم ذبائحهم**۔ بخاری، کتاب الذبائح والصید

[۲] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۱۹

[۳] تفصیل کے لیے دیکھی جائے بدایۃ المجتہد: ۴/ ۱۲۶ اور اس سے آگے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کو ناپسند کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کے ذبیحہ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے[۱]

علامہ نووی فرماتے ہیں: اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے حلال ہونے پر اجماع ہے۔ صرف شیعہ حضرات کو اس سے اختلاف ہے۔[۲] فقہائے احناف نے اس معاملہ میں ذمی اور حربی کا بھی فرق نہیں کیا ہے۔ ان کے نزدیک کتابی چاہے ذمی ہو یا حربی، اس کا ذبیحہ حلال ہے۔[۳]

ایک سوال یہ ہے کہ نصاریٰ کبھی حضرت مسیح علیہ السلام کے نام پر اور کبھی کسی کنیسہ کے نام پر بھی جانور ذبح کرتے ہیں۔ یہود (کا ایک فرقہ) حضرت عزیرؑ کے نام پر ذبح کرتا ہے۔ اس طرح کے ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟

سلف میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ کس کے نام سے ذبح کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عقائد و اعمال سے واقف ہے، اس کے باوجود جب اس نے ان کا ذبیحہ حلال کیا ہے تو اسے حلال ہونا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صحابۂ کرام میں حضرت ابو درداءؓ اور عبادہ بن صامتؓ کی رائے ہے۔ تابعین میں حضرت عطاء، زہری، ربیعہ، شعبی اور مکحولؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اگر اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر جانور ذبح کریں تو یہ ہمارے لیے حلال نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن نے صاف طور پر اس جانور کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے کھانے کی ممانعت کی ہے جو اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا گیا ہو (الانعام:۱۲۱) تابعین میں حضرت حسن بصری اور طاؤس کی بھی یہی رائے ہے۔[۴]

---

۱. جصّاص، احکام القرآن: ۱/ ۳۹۶

۲. نووی، شرح مسلم، جلد ۴، جزء ۱۲، ص ۱۰۲

۳. ابن عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار: / ۳۵۸

۴. نووی، شرح مسلم، جلد ۴، جزء ۱۲، ص ۱۰۲، ۱۰۳۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/ ۷۶

بظاہر یہی دوسری رائے کتاب وسنت سے زیادہ قریب اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کوئی مسلمان کسی کتابی سے جانور ذبح کرائے تو یہ ذبیحہ جائز ہوگا یا نہ ہوگا۔ امام مالک سے جواز اور عدم جواز دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں۔ جن لوگوں نے اسے ناجائز کہا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے نیت شرط ہے۔ ایک مسلمان اس نیت سے جانور ذبح کرتا ہے کہ اسلامی شرائط کے مطابق جانور ذبح کر رہا ہے وہ اس لیے اس کا ذبیحہ حلال ہے۔ اس طرح کی نیت کتابی کی نہیں ہوتی، جن لوگوں نے اسے جائز قرار دیا ہے انھوں نے یہ شرط تسلیم نہیں کی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے، لہٰذا وہ مسلمان کی طرف سے اس معاملہ میں نیابت بھی کرسکتا ہے[1]

احناف کے نزدیک کسی مسلمان کا کتابی سے جانور ذبح کرانا مکروہ ہے، لیکن ذبیحہ حلال ہوگا[2]

غیر مسلم کے برتن

جو برتن غیر مسلم افراد یا کمپنیاں تیار کرتی ہیں ان کی خرید وفروخت یا استعمال کے مباح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ البتہ جو برتن ان کے استعمال میں ہوں ان کے بارے میں سوال یہ ہے کہ ان کا استعمال صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو اس کے ساتھ کچھ شرائط ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب متعدد احادیث میں ملتا ہے۔

حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم لوگ ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں اہل کتاب ہیں۔ کیا ہم ان کے برتن کھانے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

فان وجدتم غیر انیتھم فلا تاکلوھا و اگر تمھیں ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن

۱؎ ابن رشد، بدایۃ المجتہد: ۴/ ۱۲۷

۲؎ ہدایہ: ۴/ ۴۴۸

ان لم تجدوا فاغسلوھا ثم کلوا فیھا[1] دستیاب ہوں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ۔ لیکن اگر دستیاب نہ ہوں تو انھیں دھولو، پھر ان میں کھاؤ۔

حضرت ابو ثعلبہ ہی سے مروی ایک روایت میں اہل کتاب کے ساتھ مجوس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ حضرت ابو ثعلبہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

انا اھل سفر نمرّ بالیھود و النصاری والمجوس فلا نجد غیر اٰنیتھم قال فان لم تجدوا غیرھا فاغسلوھا بالماء ثم کلوا فیھا واشربوا[2] ہم (ہمیشہ) سفر میں رہنے والے لوگ ہیں۔ ہمارا گزر یہود، نصاریٰ اور مجوس کے علاقوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن نہیں ہوتے (ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟) آپ نے فرمایا: اگر ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن نہ ہوں تو تم انھیں پانی سے دھولو، پھر ان میں کھاؤ اور پیو۔

ایک اور روایت میں ہے:

سئل رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم عن قدور المجوس فقال انقوھا غسلا و اطبخوا فیھا[3] رسول اللہ ﷺ سے مجوس کے کھانا پکانے کے برتنوں کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ انھیں دھوکر پاک کرلو اور پھر ان میں کھانا پکاؤ۔

حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کی مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم ـــــ چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا مجوس اور بت پرست ـــــ کے استعمالی برتن اس وقت استعمال کیے جانے چاہئیں جب کہ دوسرے برتن دستیاب نہ ہوں اور استعمال سے پہلے انھیں خوب صاف کرلینا چاہیے۔ حضرت ثعلبہؓ ہی کی ایک اور روایت سے اس کی وجہ بھی سامنے آتی ہے۔ اس روایت میں ان کا سوال ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

---

[1] بخاری، کتاب الصید والذبائح، باب صید القوس۔ مسلم، کتاب الصید والذبائح۔ باب الصید بالکلاب المعلّمۃ

[2] ترمذی، ابواب الصید، باب ماجاء مایوکل من صید الکلب وما لایوکل

[3] ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی آنیۃ المشرکین۔

انا نجاور اهل الکتاب و هم یطبخون فی قدورهم الخنزیر و یشربون فی اٰنیتهم الخمر

ہم اہل کتاب کے پڑوس میں رہتے ہیں اور وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے اور اپنے برتنوں میں شراب پیتے ہیں (کیا یہ برتن ہم استعمال کرسکتے ہیں؟)

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

ان وجدتم غیرها فکلوا فیها و اشربوا و ان لم تجدوا غیرها فارحضوها بالماء[1]

اگر تمھیں ان برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن دستیاب ہوں تو تم ان ہی میں کھاؤ اور پیو۔ اگر دوسرے برتن نہ ہوں تو انھیں پانی سے دھوکر صاف کرلو۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ اہلِ کتاب یا غیر مسلموں کے ان برتنوں کا حکم ہے جنھیں وہ حرام اور ناپاک چیزوں کے پکانے اور کھانے پینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ جو برتن ان چیزوں کے لیے استعمال نہ ہوں، ان کے بارے میں یہ حکم نہ ہوگا کہ اہتمام کے ساتھ پاک صاف کر کے بدرجہ مجبوری استعمال کیا جائے۔ اس سے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ اچھی طرح دھودینے کے بعد ہر طرح کے برتن استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے۔ مشرکین کے کھانے پینے کے جو برتن ہاتھ آتے، انھیں استعمال کرتے تھے۔ آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا[2]

ایک روایت میں ہے کہ ہم انھیں دھوکر استعمال کرلیا کرتے تھے[3]

امام نووی فرماتے ہیں: حضرت ابو ثعلبہؓ کی روایت میں غیر مسلم جن برتنوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے یا شراب پیتے ہیں، ان کے استعمال سے، اگر دوسرے برتن موجود ہوں تو، منع کیا گیا ہے، کیوں کہ اس میں کراہت محسوس ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر برتن فقہاء کے نزدیک دھونے سے پاک ہوجاتے ہیں۔ ان میں کوئی کراہت باقی نہیں

---

[1] ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب فی استعمال آنیۃ اہل الکتاب

[2] ابوداؤد حوالہ سابق [3] ابن حجر، فتح الباری: ۹/ ۶۲۳

رہتی۔ آدمی کے پاس اور برتن موجود ہوں تو بھی انھیں وہ استعمال کرسکتا ہے۔[۱]

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ غیر مسلم کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے انھیں دھونے اور بعض صورتوں میں پانی کھولا کر انھیں صاف کرنے کی ہدایت اس لیے ہے کہ وہ نجاسات سے بچتے نہیں ہیں اور مردار کھاتے ہیں۔ دھوئے بغیر پکانے میں برتن مٹی کے ہوں تو ان کے اثرات آسکتے ہیں۔ دھونے اور صاف کرنے کے بعد ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطے کہ برتن سونے اور چاندی کے نہ ہوں یا خنزیر کی کھال سے نہ بنے ہوں (جیسے مشکیزہ وغیرہ) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ضرورت ہو اور برتن تانبے یا لوہے کے ہوں تو انھیں دھو دیا جائے اور مٹی کے ہوں تو اس میں پانی پکانے کے بعد دھو دیا جائے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جو برتن وہ کھانا پکانے کے لیے نہیں، بلکہ دوسری ضروریات کے لیے استعمال کرتے ہیں، انھیں دھوئے بغیر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۲]

علاّمہ عینی فرماتے ہیں کہ کسی غیر مسلم کے برتن سے طہارت (استنجاء، وضو، غسل) حاصل کی جائے اور اس کا پاک یا ناپاک ہونا واضح نہ ہوتو اگر غیر مسلم کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہے جس کے نزدیک اس برتن کے استعمال سے کوئی مذہبی جذبہ یا تقدس وابستہ نہیں ہے تو قطعی طور پر طہارت صحیح ہوجائے گی، لیکن اگر اس کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہے، جس کے نزدیک اس برتن کے استعمال میں کوئی دینی جذبہ یا تقدس پایا جاتا ہے تو اس صورت میں بھی صحیح مسلک یہی ہے کہ طہارت ہوجائے گی۔ امام اوزاعی، ثوری، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب اس برتن کے استعمال میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ امام احمد اور اسحٰق بن راہویہ کے علاوہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے بھی اسے ناپسند کیا ہو۔[۳]

۱۔ نووی، شرح مسلم، جلد ۵، جزء ۱۳، ص ۷۹-۸۰

۲۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/ ۷۸

۳۔ عینی، عمدۃ القاری: ۲/ ۳۹۱

غیر مسلم کے کپڑے

غیر مسلم بنکروں یا ان کے کارخانوں کے تیارہ کردہ کپڑے کا استعمال بالاتفاق جائز ہے۔ البتہ ان کے استعمال شدہ کپڑوں کے بارے میں علماء کے یہاں کچھ تفصیل ملتی ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے استعمال شدہ کپڑے، جیسے عمامہ، طیلسان (وہ چادر جو لباس کے اوپر عبا کی طرح اوڑھی جاتی ہے) یا بدن کے اوپر کے حصہ میں استعمال ہونے والے کپڑے، یہ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ جسم کے نچلے حصہ کے لیے جو کپڑے استعمال ہوتے ہیں ان سے احتراز اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ عبادت کے لیے طہارت کا خیال نہیں رکھتے۔ ابو الخطاب کہتے ہیں کہ اصل طہارت ہے، جب تک کسی کپڑے کے ناپاک ہونے کا ثبوت نہ ہو، اسے پاک ہی سمجھنا چاہیے[1]

غیر اہل کتاب، مجوسیوں اور بت پرستوں کے برتنوں اور کپڑوں کے بارے میں ابو الخطاب کہتے ہیں کہ ان کا حکم بھی اہلِ کتاب ہی کا ہے۔ یعنی ان کے کپڑے اور برتن پاک سمجھے جائیں گے اور ان کا استعمال جائز ہوگا، جب تک کہ ان کے نجس ہونے کا یقین نہ ہو۔ یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔

یہ تو استعمالی کپڑوں کا حکم ہے۔ وہ کپڑے جو غیر مسلم تیار کرتے ہیں وہ پاک ہیں، ان میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ یہی کپڑے استعمال کرتے تھے۔ فقہاء کی عام رائے یہی ہے[2]

غیر مسلموں سے معاشرتی روابط کے بعض اور پہلوؤں کی، سماجی تعلقات کے تحت وضاحت ہوسکے گی۔

☆☆

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱/ ۱۱۱

[2] حوالہ سابق، ص ۱۱۲

سماجی تعلقات

معاشرتی تعلقات کے ذیل میں کھانے، پینے اور لباس کا ذکر آچکا ہے۔ ان تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سماجی تعلقات کے تحت اس کے بعض اور پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

غیر مسلم کو سلام کرنا

احادیث میں سلام کو رواج دینے کا حکم ہے۔ زیادہ تر علماء کے نزدیک اس کا تعلق مسلمانوں سے ہے، اس لیے غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جاسکتا، لیکن بعض حضرات کے نزدیک سلام ایک طرح کی دعا ہے۔ یہ دعا غیر مسلم کو بھی دی جاسکتی ہے[۱]

غیر مسلم کو دعا دینا

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی۔ اس نے وہ پیش کی تو آپ نے اسے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں حسین وجمیل رکھے، چناں چہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ رہے۔[۲]

علاّمہ بغوی اس روایت کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کو دعا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ روایت میں آتا ہے کہ ایک

---

۱ اس مسئلہ پر مستقل بحث آگے آرہی ہے۔

۲ عبدالرزاق، المصنف: ۱۰/ ۳۹۲

یہودی نے رسول اللہ ﷺ کو دودھ دوہ کر پیش کیا۔ آپ نے اسے دعا دی کہ اللہ اسے حسین وجمیل بنا دے۔ چناں چہ اس کے بال سیاہ ہوگئے۔ وہ نوے برس کے قریب زندہ رہا، لیکن اس کے بالوں میں سفیدی نہیں آئی[1]

چھینک کی دعا کا جواب

کوئی شخص چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہے تو حکم ہے کہ سننے والا 'یَرحَمُکَ اللّٰہ' کہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ یہود آپ کی مجلس میں زبردستی چھینکتے تھے، تاکہ زبانِ مبارک سے ان کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ ادا ہوں۔ آپ یرحمکم اللّٰہ کے الفاظ تو ان کے لیے استعمال نہیں فرماتے تھے، البتہ یھدیکم اللّٰہ و یصلح بالکم کہا کرتے تھے[2] یہ بھی دعا ہے اور اس کا مطلب ہے اللہ تمھیں ہدایت سے نوازے اور تمہارے حالات کو ٹھیک کر دے۔

اس سے واضح ہے کہ غیر مسلم کو اس کے مناسب حال دعا دی جاسکتی ہے۔ یہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور نوعِ انسانی کے ساتھ اس کے شریفانہ رویہ کا فطری تقاضا ہے۔

غیر مسلم کا اکرام

حسنِ سلوک کا تعلق مالی مدد ہی سے نہیں، اخلاقی رویہ سے بھی ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ بات چیت میں، ملنے جلنے اور تعلقات میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ ہو۔ ان میں جو سماجی اور معاشرتی لحاظ سے جس حیثیت کا مالک ہو اس کے مطابق اسے عزت و احترام کا مقام دیا جائے۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق کی خدمت میں ایک ذمی پہنچا تو انھوں نے اس کی

---

۱ بغوی، شرح السنۃ: ۱۲/ ۲۷۳

۲ ابوداؤد، کتاب الادب، باب کیف یُشمّت الذمی۔ ترمذی، ابواب الاستیذان، باب کیف یشمت العاطس

تعظیم و توقیر کی۔ حاضرین میں سے بعض نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا تو قاضی اسماعیل نے سورہ ممتحنہ کی آیت ۸ کا حوالہ دیا۔[۱]

مطلب یہ کہ قرآن مجید نے ذمیوں اور غیر محاربین کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کیا ہے۔ یہ احترام اسی حسنِ سلوک میں داخل ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ مسلمان کسی ذمی کے احترام میں کھڑا بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ علامہ عز الدین سلام نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ البتہ نہ کھڑا ہونے میں کسی بڑے ضرر کا خطرہ ہوتو فرماتے ہیں کہ کھڑا ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علماء احناف میں ابن وہبان اس کا ایک مثبت پہلو بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذمی کا اسلام کی طرف رجحان ہوتو قیام کی گنجائش ہے۔ بعض لوگوں نے ہر دینی مصلحت کو یہی حیثیت دی ہے۔[۲]

اس قسم کے مسائل کو بالعموم اس سوال سے جوڑ دیا گیا ہے کہ مسلمان جب برسر اقتدار ہوں تو ان کا ذمیوں کے ساتھ، جو اقتدار میں شریک نہیں ہیں، کیا رویہ ہونا چاہیے، لیکن اگر اسے اسلام کی عام اخلاقی تعلیمات اور اپنوں اور غیروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی اور احسان کی ہدایات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس سے زیادہ وسیع پس منظر میں ان پر غور وفکر ہوسکتا ہے۔

غیر مسلم کو مہمان رکھنا

اس سے پہلے حضرت اسماءؓ کا واقعہ گزر چکا ہے کہ ان کی مشرک والدہ مکہ سے مدینہ ان کے گھر آئیں، کچھ تحفے بھی لائیں، ان سے انھیں توقعات بھی تھیں، حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے انھیں اپنے گھر ٹھہرایا اور ان کی خدمت کی۔ اس حدیث کے ذیل میں علاّمہ شوکانی لکھتے ہیں:

---

[۱] ابن العربی مالکی، احکام القرآن: ۲ /۲۵۰۔ اس آیت کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔
[۲] آلوسی، روح المعانی، جزء ۲۸، ص ۲۵

فیه دلیل علیٰ جواز قبول ھدیة المشرک کما دلت علی ذٰلک الاَحادیث السالفة و علیٰ جواز انزاله منازل المسلمین[۱]

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ مشرک کا ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ اس باب میں جو حدیثیں گزر چکی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے۔ اس حدیث میں اس امر کا جواز بھی موجود ہے کہ مشرک کو مسلمانوں کے گھروں میں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

غیر مسلم کی عیادت

سماجی تقاضوں میں ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص بیمار ہو تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے اور اس سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ اسلام نے مریض کی عیادت کی ترغیب دی ہے اور اسے بہت بڑا کارِ ثواب بتایا ہے۔[۲]

احادیث سے غیر مسلم کی عیادت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بہ نفس نفیس غیر مسلم اشخاص کی عیادت کی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپ بنونجار کے ایک شخص کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ (اس دوران میں) اس سے کہا اے ماموں! آپ 'لاَ اِلٰـهَ اِلاّ اللّٰه' کا اقرار کیجیے۔ اس نے کہا کہ میں ماموں ہوں یا چچا؟ آپ نے فرمایا: نہیں، ماموں ہیں (اس لیے کہ آپ کی والدہ حضرت آمنہ کا تعلق مدینہ سے تھا) اس نے کہا کہ کیا لاَ اِلٰـهَ اِلاّ اللّٰه کا اقرار میرے حق میں بہتر ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔[۳]

حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت

۱۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۶/۱۰۷۔ غیر مسلم کو تحفے دینے کا ثبوت حضرت عمرؓ کے اس واقعہ سے بھی ملتا ہے جو اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ انھوں نے رشتہ کے ایک مشرک بھائی کو ایک چادر، جو رسول اللہ ﷺ نے انھیں دی تھی، تحفے میں بھیجی۔ اس موضوع پر مستقل بحث آگے آرہی ہے۔

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' ص ۳۶۵-۳۶۹

۳۔ مسند احمد: ۳/۱۵۲، ۱۵۴، ۲۶۸

کیا کرتا تھا۔ وہ بیمار ہوا تو آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کے سرہانے بیٹھے۔ اس سے کہا کہ تم اسلام لے آؤ۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، جو اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے کہا: ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لو۔ چناں چہ وہ اسلام لے آیا۔ نبی ﷺ وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس بچہ کو جہنم سے بچالیا[۱]

ان روایات سے مشرکین اور یہود کی عیادت کا ثبوت ملتا ہے۔ اسلام کا پیش کرنا تو خیرخواہی کا تقاضا ہے۔ آدمی جسے حق سمجھے گا اسے وہ ہر حال میں پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ فقہاء نے رسولِ اکرم ﷺ کے اس اسوہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ غیرمسلموں کی عیادت اور تعزیت جائز ہے، اس میں ازروئے شرع کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ کوئی غیرمسلم بیمار ہوجائے تو اس کے مسلمان رشتہ دار کو اس کی عیادت کرنی چاہیے:

ان كانت قرابة قريبة بين مسلم و كافر فليعد المسلم الكافر[۲]	اگر مسلمان اور کافر کے درمیان قریبی رشتہ داری ہے تو مسلمان کو کافر کی عیادت کرنی چاہیے۔

کسی سے قرابت اور رشتہ داری ہو تو اس کے حقوق زیادہ ہیں، لیکن یہ عیادت کے لیے شرط نہیں ہے۔ یہ ایک دینی، اخلاقی، بلکہ انسانی تقاضا ہے، جسے پورا ہونا چاہیے۔ سلیمان بن موسیٰ کہتے ہیں:

نعود بني النصارىٰ و ان لم تكن بيننا و بينهم قرابة[۳]	ہم لوگ نصاریٰ کی اولاد کی عیادت کرتے ہیں، اگرچہ کہ ہمارے اور ان کے درمیان قرابت نہیں ہے۔

۱۔ بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات الخ۔ مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۲۴ میں اسی مفہوم کی ایک روایت ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کا ایک یہودی پڑوسی تھا، جو اخلاقی طور پر برا نہ تھا۔ آپ نے اس کی عیادت کی۔ پھر اوپر ہی کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ ممکن ہے، یہ کوئی دوسرا واقعہ ہو۔

۲۔ عبدالرزاق، المصنف: ۶/ ۳۵ ۳۔ حوالہ سابق: ۶/ ۳۶

فقہ حنفی میں عمومی انداز میں کہا گیا ہے:

و لاَ بأس بعیادة الیھودی و النصرانی لِانّه نوع برّ فی حقھم و ما نھینا عن ذٰلک[1]	یہودی اور نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ان کے حق میں ایک طرح کی بھلائی اور حسن سلوک ہے۔ اس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا ہے۔

درمختار میں ہے کہ 'اس بات پر اجماع ہے کہ ذمی کی عیادت جائز ہے۔' مجوسی کی عیادت کو بھی صحیح قول کے مطابق جائز قرار دیا گیا ہے۔[2]

غیر مسلم کے جنازے کا احترام

حضرت سہل بن حنیفؓ اور قیس بن سعدؓ قادسیہ میں تھے۔ ایک جنازہ گزرا تو وہ کھڑے ہوگئے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ ذمی کا جنازہ تھا۔ انھوں نے جواب دیا: اسی طرح رسول اللہ ﷺ ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ آپؐ کے سامنے سے جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہوگئے۔ عرض کیا گیا کہ یہ یہودی کا جنازہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا: کیا وہ نفس (جان) نہیں ہے؟ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: موت سے ایک گھبراہٹ ہوتی ہے (اس کا تعلق مسلم یا غیر مسلم سے نہیں ہے)[3]

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ کسی بھی انسان کی موت ایک الم ناک حادثہ ہے۔ اس سے مومن کو اپنی موت یاد آتی ہے اور وہ عبرت حاصل کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم تجہیز و تکفین اور اس نوع کے دیگر مذہبی مراسم آزادی سے انجام دے سکتے ہیں۔[4]

---

[1] ہدایہ: ۴/ ۴۷۲ [2] ردالمحتار علی الدر المختار: ۵/ ۳۴۱

[3] بخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازة الیھودی۔ مسلم، کتاب الجنائز۔ باب القیام للجنازة

[4] علماء نے لکھا ہے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کے طریقوں میں فرق ہونا چاہیے اور ان کی تجہیز و تکفین کے اوقات بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ اس حدیث سے بعض علماء کے بقول ان اجتہادات کی تردید ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ و استدل بحدیث الباب علیٰ جوازِ (باقی اگلے صفحہ پر)

غیر مسلم کی تجہیز و تکفین

کافر والدین یا عزیزوں کا انتقال ہوجائے تو مسلمان اولاد ضرورت پر ان کے کفن دفن کا نظم کرے گی۔ رسولِ اکرم ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب بیمار ہوئے تو آپ نے ان کی عیادت فرمائی[1] جب انتقال ہوا تو حضرت علیؓ نے آپ کو اس کی اطلاع دی۔ یہ خبر سن کر آپ رو پڑے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ان کی مغفرت کی دعا بھی کرتے رہے، بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا تو رک گئے[2]

حضرت علیؓ نے دریافت کیا کہ انھیں کون دفن کرے گا؟ آپ نے فرمایا: جاؤ اپنے باپ کو دفن کرو۔ پھر اور کوئی کام کیے بغیر سیدھے میرے پاس آؤ۔ میں گیا، انھیں دفن کیا[3] اور آپ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے مجھے غسل کا حکم دیا اور دعا دی۔ ایسی دعا کہ اس کے عوض مجھے سرخ و سیاہ اونٹ (دنیا جہان کی دولت) بھی پسند نہیں[4]

غیر مسلم کے غسل اور تدفین کو بعض فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اور بعض نے صرف اس صورت میں اس کی اجازت دی ہے، جب کہ اس کی تدفین کا نظم نہ ہو۔

معمر کہتے ہیں کہ میرے ساتھ یہودی یا نصرانی ہو، اس کا انتقال ہوجائے اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اخراج جنائز اهل الذمة نهارا غیر متمیزة عن جنائز المسلمین۔ اشار الیٰ ذٰلک الزین بن المنیرقال و الزامهم بمخالفة رسوم المسلمین وقع اجتهادًا من الأئمة۔ فتح الباری: ۱۸۱/۳

[1] مصنف عبد الرزاق: ۳۶/۶

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۲۳، ۱۲۴۔ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کی ممانعت سورۂ توبہ آیت ۱۱۳ میں آئی ہے۔

[3] بعض روایات میں غسل اور کفن کا بھی ذکر ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ زیلعی، نصب الرایۃ: ۲۸۱/۲، ۲۸۲

[4] ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب الرجل یموت لہ قرابۃ مشرک۔ نسائی، کتاب الطہارۃ، باب الغسل من مواراۃ المشرک۔ کتاب الجنائز، باب مواراۃ المشرک۔ مسند احمد: ۱۳۶/۲۔ حدیث نمبر ۸۰۷، ۱۰۷۴۔ تحقیق احمد محمد شاکر۔

اس کے اہلِ مذہب میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہو جو اسے دفن کرسکے تو میں اسے دفن کروں گا، اسے درندوں کو کھانے کے لیے نہیں چھوڑ دوں گا۔[۱]

فقہ حنبلی میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کسی کافر کا انتقال ہوجائے تو وہ اسے غسل نہیں دیں گے اور دفن نہیں کریں گے، چاہے وہ ان کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، الاّ یہ کہ اسے دفن کرنے والا کوئی نہ ہو۔ (اس صورت میں مسلمان اسے دفن کردیں گے) یہی امام مالک کی رائے ہے۔ لیکن ابوحفص عبکری کہتے ہیں کہ مسلمان کے لیے اپنے کافر قریبی رشتہ دار کو غسل دینا اور دفن کرنا جائز ہے۔ یہ رائے بھی امام احمد سے منقول ہے۔ امام شافعی کا مسلک یہی ہے۔[۲]

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ ہمارے علماء (احناف) نے کہا ہے کہ کسی مسلمان کے کافر ماں باپ کا انتقال ہوجائے تو وہ انھیں غسل دے گا، جنازہ کا ساتھ دے گا اور دفن کرے گا، اس لیے کہ ان کے ساتھ معروف کے مطابق حسنِ سلوک کا جو حکم دیا گیا ہے یہ اس میں شامل ہے۔[۳]

ہدایہ میں قدوری کی عبارت ہے:

و اذا مات الکافر و له ولی مسلم فانه یغسله و یکفنه و یدفنه[۴]	کسی کافر کا انتقال ہوجائے اور مسلمان اس کا ولی ہو تو وہ اسے غسل دے گا اور اس کی تکفین اور تدفین کرے گا۔

۱۔ عبدالرزاق، مصنف: ۶/۴۲

۲۔ ابن قدامہ، المغنی: ۳/۴۶۶

۳۔ احکام القرآن: ۲/۲۳۶

۴۔ صاحب ہدایہ کا انداز سخت ہے۔ قدروی کی عبارت کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جیسے ناپاک کپڑا دھویا جاتا ہے اس طرح ناپاک سمجھ کر لاش پر پانی بہا دے گا۔ کفن اور دفن میں سنت کی رعایت نہ ہوگی، بلکہ چھوٹا سا گڑھا کھودا جائے گا، میت کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اس میں ڈال دیا جائے گا اور پھر مٹی سے ڈھک دیا جائے گا۔ ہدایہ: ۱/۱۶۱-۱۶۲۔ اس میں شک نہیں کہ غیر مسلم کی تدفین اسلامی شریعت کے مطابق نہیں ہوگی، لیکن مسلمان کسی بھی وجہ سے اس کی تدفین کر رہا ہو تو اس میں میت کے احترام کا پہلو ہمارے خیال میں بہرحال ملحوظ رہنا چاہیے۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ مسلمان کو کسی غیر مسلم رشتہ دار کی تجہیز و تکفین کرنی پڑے۔ اگر اس کے اہل مذہب اپنے طریقہ پر عمل کریں تو مسلمان اس میں اسی حد تک شریک ہوگا، جس حد تک شریعت اجازت دے۔

جنازہ میں شرکت

غیر مسلم سے خونی رشتہ یا اور کوئی قریبی تعلق ہو تو اس کے جنازہ میں شرکت کی بھی اجازت ہے۔

مشہور تابعی مکحول کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔ کنارے کنارے چلے، ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ فرمایا: ''رشتہ نے آپ کو مجھ سے جوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔'' ان کی قبر پر آپ کھڑے نہیں ہوئے۔[1]

امام شعبی کہتے ہیں کہ حارث بن ابی ربیعہ کی والدہ نصرانی تھیں۔ ان کا انتقال ہوا تو (بعض) صحابہ نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی۔[2]

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں:

ان کانت قرابة قریبة بین مسلم و کافر فلیتبع جنازته[3] اگر قریبی رشتہ داری ہے مسلمان اور کافر کے درمیان تو مسلمان کو کافر کے جنازہ کے پیچھے چلنا چاہیے۔

غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت ہو تو اس بات کی احتیاط کرنی ہوگی کہ مسلمان کا امتیاز باقی رہے، انسانی تعلق اور ہمدردی کا اظہار بھی ہو اور یہ بات بھی واضح ہو کہ اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو وہ صحیح نہیں سمجھتا۔ اس کے لیے مختلف صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

ابو وائل کہتے ہیں کہ میری ماں کا انتقال ہوا۔ وہ نصرانیہ تھیں۔ میں نے حضرت

---

[1] مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۳۸۔ حضرت علیؓ کی روایت گزر چکی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر ابوطالب کی تدفین کی تھی اور بعد میں اس کی اطلاع دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے آپ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ روایت اس سے مختلف ہے۔

[2] مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۳۶ [3] حوالہ سابق

عمرؓ سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا: جب اس کا جنازہ روانہ ہو تو تم سواری پر آگے آگے چلو۔

امام احمد بن حنبل اس کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ کسی یہودی یا نصرانی کا انتقال ہو جائے تو اس کی مسلمان اولاد سواری پر جنازہ کے آگے چلے اور دفن کے وقت واپس ہو جائے[1]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ نصرانیہ تھی۔ کیا میں اس کی تدفین میں شریک ہوسکتا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا کہ جنازہ کے آگے چلو، اس لیے کہ تم (دینی لحاظ سے) اس کے ساتھ نہیں ہو[2]

قتادہ کہتے ہیں کہ مسلمان کافر کے جنازہ کے پیچھے چلے گا اور کنارے رہے گا، اس سے قریب نہیں ہوگا[3]

غیر مسلم میت کے اہل مذہب موجود ہوں تو وہ اپنے طریقہ پر عمل کریں گے۔ یہ ان کا مذہبی حق ہے۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ مسلمان رشتہ دار صرف جنازہ میں شریک ہوگا۔

خالد بن عبد اللہ قسری کی ماں کا انتقال ہوا۔ وہ نصرانیہ تھیں۔ خالد نے دمشق کے پادریوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی تجہیز و تکفین میں وہ طریقہ اختیار کرو جو بادشاہوں کی لڑکیوں کے لیے اختیار کرتے ہو، اس لیے کہ اس کا تعلق بھی بادشاہوں کی اولاد سے تھا۔ پھر گھر کی عورتوں نے پادریوں کی ہدایت کے مطابق انھیں غسل دیا اور تجہیز و تکفین کی۔ جنازہ جب چلا تو خالد اپنی سواری پر نکلے، نمایاں اشخاص بھی ساتھ تھے۔ کنارے کنارے چلتے رہے۔ قبر تک پہنچے تو اپنی سواری کا رُخ موڑا اور واپس ہوگئے۔ کہا: یہ ہماری ماں کے ساتھ آخری سلوک ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۳/۴۶۶

[2] مصنف عبد الرزاق: ۶/۳۷

[3] حوالہ سابق

شیخ عبد اللہ بن ابو زکریا نے اپنی ماں کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ان کا شمار شام کی نمایاں شخصیات میں ہوتا تھا۔ بڑے عابد و زاہد اور فقیہ تھے۔

مکحول (تابعی) کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بھی اسی پر عمل کرتے تھے[1]

جنازہ کے آگے یا پیچھے چلنا، درمیان میں یا کنارے چلنا، سواری پر یا پیدل چلنا، ان میں سے ہر ایک کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، البتہ ایسے کسی بھی موقع پر اپنے دینی تشخص اور انفرادیت کو کھو دینا صحیح نہیں ہے۔ اسے باقی رکھتے ہوئے آدمی حالات کے لحاظ سے خود فیصلہ کرسکتا ہے۔ اس سے بہرحال اتنی بات ثابت ہے کہ وقت ضرورت غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت ناروا نہیں ہے۔

غیر مسلم عزیز کی قبر کی زیارت

کافر ماں باپ یا قریبی عزیز کے انتقال کے بعد اگر ان کی یاد آجائے تو آدمی ان کی قبر پر بھی جاسکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ (حضرت آمنہ) کی قبر کی زیارت فرمائی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ جو صحابہ کرام ساتھ تھے وہ بھی رو پڑے۔ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کے لیے استغفار کی اجازت مانگی، لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت طلب کی تو اجازت دے دی گئی۔ تم لوگ قبروں کی زیارت کرو۔ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔[2]

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں:

فیہ جواز زیارۃ المشرکین فی الحیٰوۃ و قبورھم بعد الوفاۃ لِاَنہٗ اذا	اس سے مشرکین کی ان کی زندگی میں زیارت اور ملاقات اور مرنے کے بعد ان کی قبور کی

---

[1] مصنف عبد الرزاق: ۶/۷،۳۸،۳

[2] مسلم، کتاب الجنائز، باب استئذان النبیؐ ربہ فی زیارۃ قبر امہ۔ ابو داؤد، کتاب الجنائز، باب فی زیارۃ القبور۔

جازت زیارتھم بعد الوفاۃ ففی الحیٰوۃ اولٰی۔[۱]

زیارت کا جواز نکلتا ہے، اس لیے کہ جب ان کی زیارت ان کی وفات کے بعد جائز ہے تو زندگی میں بدرجہ اولیٰ جائز ہونی چاہیے۔

غیر مسلم کی تعزیت

کسی کے عزیز و قریب کا انتقال ہوتو اس کا یہ حق ہے کہ اس کی تعزیت کی جائے اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہو۔ جس طرح مسلمان کی تعزیت کی جاتی ہے، غیر مسلم کی بھی تعزیت کی جانی چاہیے۔ یہ ایک سماجی تقاضا بھی ہے اور اسلام کی تعلیم کے عین مطابق بھی۔ البتہ اس موقعے پر کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکلنی چاہیے جو ایک مسلمان کے عقیدہ کے خلاف ہو۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے دریافت کیا کہ یہودی یا نصرانی کی اولاد یا قرابت دار کا انتقال ہوجائے تو کیسے تعزیت کی جائے؟ فرمایا: اس طرح کہے:

''اللہ تعالیٰ نے موت اپنی ہر مخلوق کے لیے لکھ دی ہے (اس سے کسی کو رستگاری نہیں) ہماری دعا ہے کہ موت، جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، جب آئے تو خیر کے ساتھ آئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ جو مصیبت آئی ہے اس پر صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری تعداد نہ گھٹائے (تمھاری نسل میں کمی نہ ہو)۔[۲]

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ کے پاس ایک نصرانی آتا اور آپ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس کے بھائی سے تعزیت کی۔ فرمایا: تم پر جو مصیبت آئی ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس کا وہ ثواب عطا کرے جو تمہارے ہم مذہب لوگوں کو عطا کرتا ہے۔ موت کو ہم سب کے لیے برکت کا باعث

---

[۱] نووی، شرح مسلم: ج ۳، جزء ۵ ۴

[۲] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۱۶

بنائے اور وہ موجبِ خیر ہو جس کا ہم انتظار کریں۔ جو مصیبت آئی ہے اس پر صبر کا دامن نہ چھوڑو[1]

اس طرح تعزیت کا نہ صرف یہ کہ جواز ہے، بلکہ کہا گیا ہے کہ کسی یہودی یا مجوسی کے بچہ کا انتقال ہوجائے تو اس کے مسلمان پڑوسی کو اس کی تعزیت کرنی چاہیے اور کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہت اچھا جانشین عطا فرمائے اور آپ کے حالات کو بہتر بنائے[2]

یہ ہے اس رویہ کی ایک جھلک جسے غیر مسلموں کے سلسلے میں اپنانے کی قرآن وحدیث نے تعلیم دی ہے اور جس کی قانونی اور اخلاقی حیثیت سے ہمارے علماء وفقہاء نے بحث کی ہے۔

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۱۷۔ اس طرح کے مناسب الفاظ بعض اور اصحاب سے بھی منقول ہیں۔ ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغنی: ۳/۴۸۶، ۴۸۷

[2] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵/۳۴۱

ازدواجی تعلقات

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں اور مسلمانوں کے تعلقات کو بہتر اور مضبوط بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے درمیان شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوں، تاکہ آپس میں جو تہذیبی دوری اور بیگانگی ہے وہ ختم ہو اور وہ ایک دوسرے کے کلچر اور تہذیب سے قریب ہوں اور اسے اختیار کرسکیں۔ اسلام اس اندازِ فکر کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک جن مذاہب کے عقائد اور نظریات میں بنیادی اختلاف ہے ان کے ماننے والوں کا ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونا صحیح نہیں ہے۔ ان رشتوں کو اس نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔

اسلام کے اس موقف پر ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردی کی تعلیم دی ہے، ان کے ساتھ معاشی اور سماجی تعلقات کو جائز قرار دیا ہے، مختلف امور و مسائل میں ان سے تعاون کو روا رکھا ہے تو پھر شادی بیاہ کے معاملے میں اس سخت رویہ کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ کیا یہ اس کی مجموعی تعلیمات

تضاد طرزِ عمل نہیں ہے؟ کیا اس سے تعصب، عناد اور دوری نہ پیدا ہوگی؟

اب یہ ہے کہ یہ محض خام خیالی ہے کہ بین الملّی یا بین المذاہب
یعہ ہیں۔ اس طرح کے سطحی اقدامات سے قربت نہیں پیدا
ں بنیاد کی ضرورت ہے۔ اگر جذبات سے ہٹ کر غور کیا جائے تو

محسوس ہوگا کہ اسلام کا موقف معقول اور مدلل بھی ہے اور عملی بھی۔ اسے سمجھنے کے لیے بعض بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ازدواجی زندگی میں عورت اور مرد کے درمیان الفت و محبت کی فضا کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ فضا وقتی اور ہنگامی طور پر نہیں، بلکہ مستقل اور پائیدار ہونی چاہیے، تاکہ وہ مل جل کر گھر اور خاندان کی بہتر تعمیر کرسکیں اور اسے صحیح رخ دے سکیں۔

بعض اوقات کسی ہنگامی محرک، وقتی جوش یا جنسی جذبہ کے تحت ازدواجی رشتہ قائم ہو جاتا ہے، لیکن اس میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ اس طرح کے رشتے بالعموم تلخی اور ناکامی پر ختم ہوجاتے ہیں۔ مغرب اس بھیانک تجربہ سے گزر رہا ہے۔ خوش گوار ازدواجی زندگی اسی وقت ممکن ہے جب کہ میاں بیوی کے مابین محبت کا مضبوط رشتہ پایا جائے اور اسے کم زور کرنے والے عوامل اور نزاع و اختلاف کو ابھارنے والے اسباب نہ پائے جائیں، ورنہ دونوں کی زندگی نفسیاتی اور عملی الجھنوں کا شکار ہوگی اور وہ یکسوئی کے ساتھ ازدواجی زندگی کے مقاصد پورے نہ کرسکیں گے۔ دین و مذہب اور عقیدہ کا اختلاف بنیادی اختلاف ہے، جو زندگی کا رخ متعین کرتا ہے۔ اس اختلاف کو میاں بیوی کا نازک رشتہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتا۔ دیر سویر یہ ٹوٹے گا اور اس کے ٹوٹنے سے خاندان کا پورا شیرازہ بکھر جائے گا۔ یہ کوئی معمولی نقصان نہیں، بلکہ بہت بڑا نقصان ہے، جو پورے معاشرہ کو اٹھانا پڑے گا۔

بعض ایسی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں جن میں میاں بیوی نے مذہبی اختلاف کے باوجود خوش گوار زندگی گزاری اور ان کے تعلقات میں کوئی خرابی نہیں دیکھی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ رشتے ہیں، جن میں طرفین میں سے کسی کا کوئی عقیدہ اور مذہب نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی حیثیت ایک بے جان روایت کی ہوتی ہے۔ اس سے عملاً انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جب طرفین کا ذہن مذہب اور اس کے تقاضوں سے خالی ہو تو اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ جس کا کوئی

عقیدہ و مذہب ہے اور اس کی صحت وصداقت پر وہ مطمئن ہے تو اس کی فطری خواہش ہوگی اور ہونی چاہیے کہ اس کا شریک حیات بھی اسی عقیدہ اور فکر کا حامل ہو۔ فریقین میں عقیدہ کا اختلاف خاندانی زندگی کو سکون سے محروم کرسکتا ہے۔

آیئے، اس مسئلہ پر خالص اسلامی نقطۂ نظر سے بھی غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس سے کیا الجھنیں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے اس کے مجموعی مزاج اور اس کے اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اسی سے اس کا موقف سمجھا جاسکتا ہے۔

اسلام خاص قسم کی معاشرت وجود میں لانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے طہارت اور پاکی صفائی، غذا، لباس اور وضع قطع سے متعلق تفصیلی احکام دیے ہیں۔ بعض چیزیں اس کے نزدیک حلال اور طیب ہیں تو بعض چیزیں حرام اور ناپاک ہیں، رشتہ داروں کے درمیان اس نے محرم اور نامحرم اور قریب اور دور کا فرق رکھا ہے اور اسی بنیاد پر ان سے شادی بیاہ، حجاب اور عدم حجاب کے احکام بیان کیے ہیں۔ اسی طرح پیدائش سے لے کر موت تک خوشی اور غم کے تمام مواقع کے لیے اس کی ہدایات ہیں۔ ان سب کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ خاندانی زندگی سے ہے۔ یہ قدم قدم پر عورت اور مرد کے باہم تعاون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ تہذیب اور معاشرت وجود میں نہیں آسکتی جو اسلام کو مطلوب ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس تعاون کے بغیر اسلام کے بنیادی تقاضے پورے نہیں ہوسکتے اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسی عبادات کی بھی، جو پورے دین کی بنیاد ہیں، پابندی ممکن نہیں ہے۔ ایمان اور عقیدہ کے اختلاف کے ساتھ اس راہ میں بھرپور تعاون کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اسلام چاہتا ہے کہ ازدواجی تعلق کے نتیجہ میں جو اولاد ہو وہ 'ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً' ہو اور ایک نسل سے دوسری نسل تک خدا کا دین، اس سے محبت اور تعلق اور اس کی عبادت و اطاعت کا جذبہ منتقل ہوتا رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ والدین کے قلوب روحِ ایمان

سے سرشار ہوں، ان کی شب و روز کی زندگی نیکی اور تقویٰ اور خدا ترسی کی زندگی ہو اور وہ شعوری طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ اولاد کے اندر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو اور پروان چڑھے، دینی حمیت سے اس کا سینہ سرشار ہو اور وہ دین کو اپنے لیے سب سے بڑا سرمایہ سمجھنے لگے اور کسی حال میں اس سے دست بردار ہونے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ یہ چیز ماں باپ کی مشترکہ اور مسلسل جدوجہد چاہتی ہے۔ اختلافِ دین کے ساتھ یہ مہم انجام نہیں پاسکتی۔ ماں باپ کی زندگی اولاد کے لیے نمونہ ہوتی ہے۔ یہ نمونہ بہتر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ دونوں کا سمتِ سفر صحیح بھی ہو اور وہ اسی پر گام زن بھی رہیں۔ ماں باپ اگر بے دین یا دین سے بے تعلق ہوں تو اولاد دین دار بن کر نہیں ابھر سکتی۔

اسلام جس ازدواجی تعلق کو صحیح نہیں تسلیم کرتا اس کی بنیاد پر حقوق اور ذمہ داریوں کا سوال بھی اس کے نزدیک بے معنی ہے۔ جب کوئی عورت اسلامی قانون کی رو سے کسی کی بیوی اور وہ اس کا شوہر نہیں ہے تو دونوں کے حقوق اور ذمہ داریاں از خود ختم ہوجاتی ہیں۔ عورت نہ تو اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہے اور نہ مرد کے مطالبات کی تعمیل اس کے لیے لازمی ہوگی۔ اس تعلق کے نتیجہ میں جو اولاد ہوگی وہ بھی اپنے نان و نفقہ، تعلیم و تربیت جیسے قانونی حقوق سے محروم ہوگی، ان کے درمیان قانونِ وراثت نافذ نہیں ہوگا۔ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ اس ناجائز تعلق پر عورت اور مرد دونوں پر اسلامی ریاست میں حدِ شرعی نافذ ہوگی۔

اہلِ شرک سے ازدواجی تعلقات کی ممانعت

مشرکین سے ازدواجی تعلقات کے بارے میں قرآن مجید نے صریح الفاظ میں ممانعت کی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو جب تک کہ

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۝ (البقرۃ:۲۲۱)

وہ ایمان نہ لے آئیں۔ مومن لونڈی (آزاد) مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو اچھی لگے اور مشرکین جب تک ایمان نہ لے آئیں ان سے اپنی عورتوں کا نکاح مت کرو اور مومن غلام (آزاد) مشرک سے بہتر ہے چاہے وہ تمھیں پسند ہی کیوں نہ آئے۔ یہ لوگ نارِ جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے اور اپنے احکام کھول کھول کر لوگوں کو بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو مشرک عورتوں سے نکاح کرنے سے اور مسلمان عورتوں کو مشرکین کے نکاح میں دینے سے صاف منع کیا گیا ہے کہ کوئی مشرکہ اگر حسین و جمیل، صاحب ثروت ور اعلیٰ حسب ونسب والی ہے تو بھی اس کے مقابلہ میں ایک مسلمان باندی بہتر ہے، خواہ اسے ان میں سے بیش تر چیزیں حاصل نہ ہوں۔ اسی طرح ایک مشرک کے مقابلہ میں مسلمان غلام اچھا ہے، چاہے مادی لحاظ سے وہ مشرک سے کم تر ہی کیوں نہ ہو۔

آیت کے آخر میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مناکحت کے عدم جواز کی وجہ بیان کردی گئی ہے۔ وہ یہ کہ شرک اور توحید دو متضاد تصورات ہیں۔ دونوں کی راہیں جدا ہیں۔ مشرکین دینِ شرک کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں، اسلام توحید کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک شرک کا راستہ تباہی کا راستہ ہے جو جہنم تک انسان کو پہنچاتا ہے اور اسلام سے دنیا اور آخرت کی کامیابی وابستہ ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان جہاں عقیدہ کا یہ زبردست فرق پایا جائے وہاں ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ میاں بیوی میں سے ایک کی زندگی مشرکانہ تصورات پر مبنی ہو اور دوسرا توحید کی راہ پر چلنا چاہے تو قدم قدم پر تصادم ہوگا اور گھر کا نظم اور سکون باقی نہیں رہ سکے گا۔

صلح حدیبیہ ذی قعدہ ۶ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد سورۂ ممتحنہ ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی۔ اس میں کہا گیا کہ مکہ میں جو مسلمان عورتیں کفار کے نکاح میں ہیں وہ وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ آجائیں تو انھیں دوبارہ مکہ نہ بھیجو، اس لیے کہ ان کے ازدواجی رشتے ختم ہوگئے ہیں۔[1]

ارشاد ہے:

لاَ هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلاَ هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (الممتحنۃ:۱۰) یہ مسلمان عورتیں نہ ان کافروں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافر مردان مسلمان عورتوں کے لیے۔

اس فقرہ کے تحت حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

هٰذه الاٰية هى التى حرمت المسلمات على المشركين و قد كان جائزا فى ابتداء الاسلام ان يتزوج المشرك المؤمنة[2] یہی آیت ہے، جس نے مسلمان عورتوں کے مشرکین سے نکاح کو حرام قرار دیا۔ آغاز اسلام میں مشرک کا مومنہ سے شادی کرنا جائز تھا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں: **لاَ هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ** یہ جملہ اسمیہ ہے۔ عربی قواعد کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جدائی ثابت ہے اور جو نکاح ہو چکے ہیں وہ ختم ہوگئے۔ **وَلاَ هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ** جملہ فعلیہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مستقبل میں بھی ان سے نکاح جائز نہیں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تکرارِ حرمت اور قطع تعلق پر زور دینے اور اسے مؤکد کرنے کے لیے ہو۔[3]

اسی آیت میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ مسلمان اپنی کافر بیویوں کو (جو مکہ میں رہ

---

[1] اس آیت کا ایک خاص پس منظر ہے اور اس سے متعلق بعض قانونی مباحث ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ: 'تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث' کا مضمون 'غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات' ص:۱۰۷ تا ۱۳۶۔

[2] ابن کثیر، تفسیر: ۳۵۱/۴

[3] آلوسی، روح المعانی، جزء ۲۸، ص۷۶

رہی تھیں) چھوڑ دیں:

وَ لاَ تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں مت روکے رکھو۔
(الممتحنۃ:۱۰)

امام نخعی اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

و كان الكفار يتزوجون المسلمات والمسلمون يتزوجون المشركات ثم نسخ ذلك في هٰذه الاٰية[۱] کفار مسلمان عورتوں سے اور مسلمان مشرک عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ اس آیت میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔

علامہ ابن جریر طبری آیت کے اس فقرہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

هٰذا نهي من الله للمؤمنين عن الاقدام علىٰ نكاح النساء المشركات من اهل الاوثان وا مر لهن بفراقهن.[۲] اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو مشرک عورتوں سے، جو بت پرست ہیں، نکاح کا اقدام کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان کو چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

دورِ صحابہ میں اس پر عمل درآمد کی مثالیں

اس حکم پر جس طرح عمل ہوا اس کا ذکر امام زہری ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فطلق المومنون حين انزلت هٰذه الاٰية كل امرأة كافرة كانت تحت رجل منهم[۳] جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے ہر اس کافر عورت کو، جو ان میں سے کسی کے عقد میں تھی، طلاق دے دی۔

اس حکم کے آنے کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنی دو مشرک بیویوں کو، جو مکہ ہی

---

۱ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/ ۶۵

۲ ابن جریر طبری، تفسیر: جزء ۲۸ ص ۴۷

۳ حوالہ سابق

میں مقیم تھیں، طلاق دے دی۔ ان میں سے ایک قریبہ بنت ابو امیہ تھی، جس کا نکاح حضرت معاویہؓ سے ہوا، جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ دوسری ام کلثوم بنت عمرو بن جرول الخزاعی تھی، جس سے اسی کے خاندان کے ایک شخص ابو جہم بن حذیفہ بن غانم نے شادی کرلی۔[۱]

حضرت عیاض بن غنمؓ نے اپنی بیوی ام الحکم بنت ابوسفیان کو طلاق دی۔ ان سے عبد اللہ بن عثمان ثقفی نے شادی کرلی۔[۲]

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ نے اروىٰ بنت ربیعہ کو طلاق دی۔ بعد میں یہ اسلام لائیں اور ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص سے ان کا نکاح ہوا۔[۳]

جو مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور جن کے شوہر کافر تھے، ان سے ان کا ازدواجی رشتہ ختم ہوگیا:

سبیعہ بنت الحارث الاسلمیہؓ: روایات میں آتا ہے کہ حدیبیہ میں معاہدۂ صلح کی کتابت جیسے ہی مکمل ہوئی وہ خدمت میں پہنچیں تو ان کے شوہر بھی، جن کا نام مسافر مخزومی یا صیفی بن الراہب تھا، پہنچ گئے اور کہا کہ میری بیوی کو واپس بھیجئے، اس لیے کہ معاہدہ کی شرائط میں یہ داخل ہے اور ابھی کتابت کی روشنائی خشک بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے بعد سورۂ ممتحنہ کی آیت نازل ہوئی اور بقول زمخشری معاہدہ میں جو اجمال تھا اسے اس نے کھول دیا۔ آپ نے انھیں واپس نہیں بھیجا۔ مدینہ میں ان کی شادی حضرت عمرؓ

۱۔ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۳/۷۷۳، طبری، تاریخ الرسل والملوک: ۲/ ۶۴۔ اس سلسلہ کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتح الباری: ۹/ ۹

۲۔ بخاری، کتاب الطلاق، باب نکاح من اسلم من المشرکات وعدتہن۔ ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، علیٰ ہامش الاصابۃ لابن حجر: ۴/ ۴۴۵

۳۔ ابن حجر، فتح الباری: ۹/ ۴۱۹۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/ ۶۶

سے ہوئی[۱]

امیمہ بنت بشرؓ: اسلام لانے کے بعد یہ اپنے کافر شوہر حسان بن دحداح اور طبری کی روایت کے مطابق ثابت بن دحداح سے فرار ہوکر مدینہ پہنچیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس رشتہ کو ختم کر کے سہل بن حنیف سے ان کا نکاح کر دیا، جن سے ان کے صاحب زادے عبد اللہ بن سہل ہیں۔ روایت میں ہے کہ سورۂ ممتحنہ کی آیت ان کے سلسلے میں نازل ہوئی[۲]

اس طرح کی بعض اور خواتین کا بھی ذکر ملتا ہے، لیکن ان سے متعلق تفصیلات میں اختلاف ہے، اس لیے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے[۳]

کتابیات سے نکاح کا جواز[۴]

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ کے معاملہ میں تمام مذاہب کو ایک صف میں رکھا ہے یا ان میں فرق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اس معاملہ میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کے درمیان فرق کرتا ہے۔ چناں چہ جہاں اس نے مشرکین سے ازدواجی تعلقات رکھنے سے منع کیا ہے وہیں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کو

---

۱ زمخشری، الکشاف: ۴/ ۹۳۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/ ۶۱۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۳۴۸۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/ ۳۲۵

۲ طبری، تفسیر، جزء ۲۸، ص ۴۴۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۳۴۸۔ علامہ ابن اثیر اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ امیمہ بنت بشر کا تعلق انصار کے خاندان بنو عمرو بن عوف سے تھا اور آیت مہاجرین کے سلسلے میں نازل ہوئی۔ اسد الغابہ: ۷/ ۲۵۔ حافظ ابن حجر نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہوسکتا ہے، امیمہ بنت بشر کے شوہر انصار سے متعلق نہ ہوں، وہ ان کو مکہ منتقل کر کے لے گئے ہوں اور پھر وہ وہاں سے مدینہ آئی ہوں۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/ ۲۳۹

۳ ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۳۴۸

۴ کتابیات سے نکاح کے مسئلہ پر راقم نے اپنے مقالہ 'غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: 'تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث'۔ یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

جائز قرار دیا ہے۔ چناں چہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

..... وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○ (المائدۃ:۵)

(تمھارے لیے حلال ہیں) اہلِ ایمان میں کی پاک دامن[1] عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب کہ تم انھیں ان کے مہر ادا کرو، انھیں قید نکاح میں لاؤ، بدکاری نہ کرو اور چوری چھپے دوستی نہ کرو (یاد رکھو) جو شخص ایمان کا انکار کردے اس کا عمل رائیگاں گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والا ہوگا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان جس طرح شریف مسلمان عورت سے نکاح کرسکتا ہے اسی طرح شریف کتابیہ سے بھی نکاح کرنا اس کے لیے جائز ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان عقائد کا بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے، وہ خدا کو مانتے ہیں، اصولاً توحید کے بھی قائل ہیں، وحی و رسالت کو تسلیم کرتے ہیں، آخرت اور وہاں کی جزا و سزا کا بھی تصور رکھتے ہیں۔ ان کے عقائد میں انحراف بھی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی کوئی عورت کسی مسلمان کے حبالۂ عقد میں آئے تو دونوں اس طرح کی دوری نہیں محسوس کریں گے جس طرح کی دوری کسی مشرک عورت سے مسلمان کے نکاح کی صورت میں پائی جاسکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اہل کتاب مشرکین کے زمرے میں نہیں آتے؟ کیا ان کے اندر کسی نہ کسی نوعیت کا شرک نہیں پایا جاتا، یا یہ کہ وہ ہر طرح کے شرک سے پاک ہیں؟ اگر ان میں بھی شرک ہے تو پھر سورۂ مائدہ کے حکم کی نوعیت کیا ہے؟

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ بقرہ میں مشرکات سے نکاح کی ممانعت کی گئی، پھر سورۂ مائدہ کی آیت کے ذریعہ اہل کتاب کو اس سے مستثنیٰ

---

[1] محصنات کا ترجمہ بالعموم پاک دامن عورتیں کیا گیا ہے۔ اس کے معنی آزاد عورتوں کے بھی لیے گئے ہیں۔

کیا گیا[1]

یہی بات متعدد تابعین نے کہی ہے۔ علاّمہ ابن جریر طبری ان آراء کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سورہ بقرہ میں جن مشرکات کا ذکر ہے اس میں اہل کتاب کی عورتیں نہیں آتیں۔ ان سے نکاح کو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے۔ یہی حضرت قتادہؓ سے منقول ہے اور اسی کو ترجیح حاصل ہے[2]

قرآن مجید نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ کوئی مسلمان عورت اہل کتاب میں سے کسی کے عقد میں چلی جائے۔ یہ ہر حال میں ناجائز ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مرفوع حدیث بھی حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نتزوج نساء اهل الكتاب ولاَ يتزوجون نساء نا[3]

ہم اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کریں گے، لیکن ہماری عورتوں سے نکاح کی انھیں اجازت نہ ہوگی۔

ان دلائل کی بنا پر جمہور کے نزدیک کتابیہ سے نکاح جائز ہے، بلکہ بعض اصحابِ علم نے تو لکھا ہے کہ اس کے جواز پر امت کا اجماع ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کا شکر ہے کہ اہل علم کے درمیان اہل کتاب کی آزاد عورتوں سے نکاح کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جن اصحاب سے اس کا جواز منقول ہے ان میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت سلمانؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ شامل ہیں۔ علامہ ابن المنذر فرماتے ہیں کہ امت کے ابتدائی دور

۱؎ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۴/ ۳۶۲

۲؎ حوالہ سابق، ص ۳۶۵

۳؎ اس حدیث میں کسی قدر ضعف ہے، لیکن قابل احتجاج ہے۔ طبری، جامع البیان: ۴/ ۳۶۷، حاشیہ ۳

کے اصحاب میں سے کسی سے بھی اس کی حرمت منقول نہیں ہے۔ خلال کی روایت ہے کہ حضرت حذیفہؓ، حضرت طلحہؓ، جارود بن المعلّی اور اذینۃ العبدی نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کیا ہے۔ یہی بات تمام اہل علم نے کہی ہے۔ البتہ شیعہ میں فرقہ امامیہ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور سورۂ بقرہ اور سورۂ ممتحنہ کی آیات سے اس پر استدلال کیا ہے[1]

صحابہ کرام میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان کے نزدیک وہ بھی مشرکین میں شامل ہیں۔ چناں چہ جب ان سے یہودیہ یا نصرانیہ سے نکاح کے متعلق دریافت کیا جاتا تو جواب دیتے:

ان اللّٰہ حرّم المشرکات علی المؤمنین ولاَ اعلم من الْاشراک شیئا اکبر من ان تقول المرأۃ ربھا عیسٰی وھو عبد من عباد اللّٰہ[2]	اللہ تعالیٰ نے مشرکات کو مومنین کے لیے حرام ٹھہرایا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑا شرک کوئی اور ہوسکتا ہے کہ عورت کہے کہ عیسیٰؑ اس کے رب ہیں۔ حالاں کہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک ہیں۔

احتیاط پسندیدہ ہے

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیات سے نکاح پر حضرت عمرؓ نے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ چناں چہ مشہور تابعی حضرت شقیق کی (صحیح سند کے ساتھ) روایت ہے کہ

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۹/۵۴۵

[2] بخاری، کتاب الطلاق، باب قول اللہ ولاَ تنکحوا المشرکات۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے علاوہ تابعین میں محمد بن الحنفیہ اور شیعوں میں فرقہ زیدیہ کے امام ہادی نے بھی کتابیات سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ رازی، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)۔ اس رائے کی کم زوری کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مذکورہ بالا مضمون 'غیر مسلموں سے ازدواجی تعلقات'۔

حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودیہ سے شادی کی تو حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اسے وہ طلاق دے دیں۔ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ اسے حرام سمجھتے ہیں تو بتائیں، میں اسے چھوڑ دوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا:

لاَ اَزْعم انها حرام و لٰکن اخاف ان تعاطوا المومسات منهن[1] — میں نہیں کہتا کہ وہ حرام ہے، لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم ان کی بدکار عورتوں سے نکاح نہ کرنے لگو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس بات کے تو قائل تھے کہ کتابیات سے نکاح جائز ہے، لیکن انھیں اندیشہ تھا کہ اس پر عمل ہو تو ان کی صالح عورتیں ہی نہیں، ان کی غلط کار عورتیں بھی مسلمانوں کے گھروں میں پہنچنے لگیں گی۔ اس اندیشہ کی بنیادیں غالبًا دو تھیں: ایک یہ کہ اس وقت یہود و نصاریٰ انتہائی اخلاقی گراوٹ میں مبتلا تھے۔ اس حالت میں ان سے ازدواجی رشتے مسلمانوں کے اخلاقی زوال کا سبب بن سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید نے عفیف اور پاک دامن عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ حضرت عمرؓ شاید یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس کی معلومات کا کوئی اطمینان بخش ذریعہ نہیں ہے۔ بہر حال حضرت عمرؓ کے بارے میں یہی بات صحیح ہے کہ وہ اصولاً کتابیات سے نکاح کے جواز کے قائل تھے، لیکن مسلم معاشرہ میں اس کے رواج کو ناپسند فرماتے تھے۔

---

[1] طبری، جامع البیان: ۴/۳۶۶، ۳۶۷۔ نیز ملاحظہ ہو قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۳/۶۸

کاروباری تعلقات

اسلام نے انسان کی زندگی کے لیے حلال وحرام کے حدود مقرر کردیے ہیں۔ ان حدود کے دائرہ میں تجارت، کاروبار اور لین دین بھی آتا ہے۔ ایک مسلمان تو ان حدود کا لازماً پابند ہوگا، لیکن غیرمسلم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ ان سے آزاد ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر شراب اسلام کے نزدیک حرام ہے۔ اس کے پینے، پلانے، کشید اور تیار کرنے، اس کی خرید وفروخت، اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے لے جانے، ہر چیز کی اس نے ممانعت کی ہے۔ اسی طرح خنزیر کو وہ ناپاک قرار دیتا ہے اور اس کے گوشت ہی سے نہیں، اس کی کسی بھی چیز سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک مسلمان کے لیے اس طرح کے تمام محرمات کا کاروبار یا لین دین ناجائز ہے، وہ براہِ راست ہی نہیں، بالواسطہ بھی اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ سوال یہ ہے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال ٹھہرایا ہے ان کی تجارت یا مالی لین دین غیر مسلم سے ہوسکتا ہے یا نہیں جب کہ وہ جائز و ناجائز کی پابندی سے آزاد ہے اور اس کے ذرائع آمدنی حلال وحرام دونوں طرح کے ہیں؟ احادیث سے اس کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

ان النبیﷺ اشتری طعامًا من یهودی الی اجل و رهنه درعه من حدید[1]

رسول اللہﷺ نے ایک یہودی سے ایک مدت کے لیے غلہ خریدا اور اس کے پاس اپنی لوہے کی زرہ رہن رکھی۔

---

[1] بخاری، کتاب البیوع، باب شراء النبیؐ بالنسیئہ۔ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب الرہن وجوازہ فی الحضر والسفر۔ اسی مفہوم کی روایت حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ بخاری، حوالہ سابق۔

حضرت عائشہؓ کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیات مبارکہ کے آخری دور کا واقعہ ہے۔ فرماتی ہیں:

توفی رسول اللہ ﷺ و درعه مرهونة عند یهودی بثلاثین صاعا من شعیر[1] رسول اللہ ﷺ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے عوض رہن تھی۔

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے علامہ حافظ ابن دقیق العید 'احکام الاحکام' میں فرماتے ہیں:

(الحدیث) **دلیل علی جواز معاملة الکفار و عدم اعتبار الفساد فی معاملتهم** یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کفار سے معاملہ کرنا جائز ہے اور یہ کہ ان کے آپس کے معاملات کے فساد کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اس کے محشی اور تعلیق نگار، صاحب عمدہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ کفار سے اس بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ خنزیر کا کاروبار کرتے ہیں یا سود کھاتے ہیں یا یہ کہ ان کے پاس مال کیسے آیا؟ اسلامی ریاست ان سے جزیہ لے گی، اس کے بعد ان سے بیع وشراء اور خرید وفروخت کا معاملہ اسی طرح کرے گی جیسے ان کے پاس حلال مال ہو، الاّ یہ کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت مل جائے[2]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اس حدیث سے کئی باتیں نکلتی ہیں: (۱) کفار سے معاملہ کرنا جائز ہے، بشرطے کہ جس چیز کا معاملہ کیا جا رہا ہے وہ حرام نہ ہو۔ اس میں ان کے عقائد کے فساد اور ان کے آپس کے معاملات کے غلط ہونے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ (۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم اگر حربی نہیں ہے تو اسے ہتھیار فروخت کیے

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب ما قیل فی درع النبی والقمیص فی الحرب۔ یہی بیان حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا بھی ہے۔ فرماتے ہیں: قبض النبی ﷺ و درعه مرهونة عند رجل من یهود علی ثلاثین صاعا من شعیر اخذها رزقا لعیاله۔ مسند احمد، مرویات ابن عباس، حدیث نمبر ۲۱۰۹، ج ۳، ص ۳۵۵۔ نسائی، کتاب البیوع، مبایعة اهل الکتاب۔

[2] احکام الاحکام: ۳/۱۹۶، ۱۹۷

جاسکتے ہیں اور اس کے پاس رہن رکھا جاسکتا ہے۔ (۳) اس سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ ذمیوں کی املاک ان کے ہاتھوں میں رہیں گی۔ (ان پر قبضہ نہیں کیا جائے گا)[۱]

حضرت عبد الرحمٰن بن ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہم لوگ موجود تھے کہ ایک مشرک، جو پراگندہ بال اور دراز قد تھا، کچھ بکریاں لے کر پہنچا۔ آپ نے اس سے سوال کیا کہ کیا یہ فروخت کے لیے ہیں یا تحفہ ہیں؟ اس نے کہا: فروخت کے لیے ہیں۔ آپ نے اس سے ایک بکری خریدی۔[۲]

اس حدیث سے بھی مشرکین سے خرید وفروخت کا ثبوت ملتا ہے۔ محدث ابن بطال اس کے ذیل میں کہتے ہیں کہ کفار کے ساتھ معاملہ جائز ہے، سوائے اس کے کہ ایسی بیع ہو جس سے اہل حرب مسلمانوں کے خلاف فائدہ اٹھائیں۔

حافظ ابن حجر اس قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سے ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم کی بیع جائز ہے، دوسرے یہ کہ جو چیز اس کی ملکیت میں ہے وہ اسی کے پاس باقی رہے گی۔[۳]

علامہ ابن العربی مالکی نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ حضرت عمرؓ کا ایک فرمان نقل کرتے ہیں کہ ذمیوں سے شراب بطور جزیہ نہیں لی جائے گی، لیکن اگر وہ اسے اپنے لوگوں میں فروخت کر کے جزیہ ادا کریں تو قبول کرلیا جائے گا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

والحاسم لداء الشک و الخلاف شک کی بیماری اور اختلاف کو ختم کرنے والی بات
اتفاق الائمة علی جواز التجارة مع یہ ہے کہ ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اہل حرب

۱۔ فتح الباری: ۵/۱۴۱۔ یہی استدلالات علامہ بدر الدین عینی کے ہاں بھی موجود ہیں۔ عمدۃ القاری: ۱۰/۳۹۴، ۳۹۵۔ نیز ملاحظہ ہو۔ نووی: شرح مسلم، ج ۴، جزء ۱۱، ص ۴۰

۲۔ بخاری، کتاب البیوع، باب الشراء والبیع مع المشرکین و اہل الحرب۔

۳۔ فتح الباری: ۴/۴۱۰۔ نیز دیکھی جائے عینی: ۱۰/۱۱

اھل الحرب[۱] سے تجارت ہوسکتی ہے۔

غیر مسلم کے کاروباری حقوق

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کیا کاروباری حقوق حاصل ہوں گے اور ان پر کتنی پابندیاں ہوں گی اس کا جواب فقہ میں یہ دیا گیا ہے:

و اھل الذمۃ فی البیاعات کالمسلمین. تجارت اور کاروبار میں ذمی بھی مسلمانوں کی طرح ہیں (ان کے درمیان فرق نہیں کیا جائے گا)

اس کی تائید میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے:

ان لھم ما للمسلمین و علیھم ما علی المسلمین[۲] ذمیوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ ان پر وہ پابندیاں بھی ہوں گی جو مسلمانوں پر ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر وہ کوئی سودی کاروبار نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اسلام کے نزدیک سود اور اس کی تمام شکلیں ناجائز ہیں۔ البتہ خنزیر اور شراب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ذمی آپس میں ان کی تجارت کر سکتے ہیں۔ اس کی دلیل میں حضرت عمرؓ کا وہ قول پیش کیا گیا ہے، جس کا ابھی ذکر ہوا کہ جب انھیں معلوم ہوا کہ جزیہ میں ذمیوں سے شراب اور خنزیر بھی لیے جاتے ہیں اور پھر انھیں فروخت کر دیا جاتا ہے تو آپ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر ذمی اسے (دوسرے ذمیوں کو) فروخت کریں اور اس کی قیمت سے جزیہ ادا کریں تو یہ قبول کیا جاسکتا ہے۔[۳] اس لیے کہ مسلمانوں کا خنزیر اور شراب فروخت کرنا، چاہے وہ ذمیوں ہی کو فروخت کریں

۱۔ احکام القرآن: ۱/ ۲۱۴

۲۔ ہدایہ: ۳/ ۱۰۳۔ امام زیلعی فرماتے ہیں: ایسی کوئی حدیث میرے علم میں نہیں ہے۔
نصب الرایۃ لاحادیث الھدایۃ: ۴/ ۵۵

۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ہدایہ مع فتح القدیر: ۵/ ۳۶۰۔ حضرت عمرؓ کے قول کے حوالہ کے لیے دیکھی جائے۔ نصب الرایۃ لاحادیث الھدایۃ: ۴/ ۵۵

ناجائز ہے، البتہ ذمی اپنے درمیان اس کا معاملہ کرسکتے ہیں۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ کافر شراب فروخت کر کے مسلمان کا قرض ادا کرتا ہے تو مسلمان کے لیے اس کا لینا جائز ہے، اس لیے کہ شراب اس کے نزدیک قیمت رکھتی ہے، اس کی بیع اس کے لیے صحیح ہے۔ اس کے برخلاف مسلمان اگر شراب فروخت کر کے کسی کا قرض ادا کرے تو یہ ناجائز ہوگا، اس لیے کہ اس کے نقطۂ نظر سے شراب مال متقوم نہیں ہے (اس کی کوئی قیمت نہیں ہے)[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ سود کی ممانعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہوگی، البتہ شراب کی یہ حیثیت نہ ہوگی۔ غیر مسلموں کو اس کے استعمال کی اجازت ہوگی اور وہ اپنے درمیان اس کی خرید و فروخت بھی کرسکیں گے۔ یہی معاملہ خنزیر کی فروخت اور اس سے بنی ہوئی اشیاء کا ہوگا۔ لیکن اگر اسلامی ریاست شراب کے استعمال کو ملکی قانون کی رو سے ممنوع قرار دینا چاہے تو ہمارے خیال میں اسے اس کا حق ہوگا۔ اس صورت میں غیر مسلموں کو بھی اس کے استعمال کی اجازت نہ ہوگی۔

کاروبار میں شرکت

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ مسلمان کی یہودی کے ساتھ کاروباری شرکت ہو۔ امام شافعیؒ نے یہودی یا نصرانی کے ساتھ مشارکت کو مطلقاً ناپسند کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں، اسی طرح ان کے مال میں شراب اور خنزیر کی آمدنی بھی شامل ہوتی ہے۔ امام مالک، امام احمد اور سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اگر کاروبار میں مسلمان کی موثر شرکت ہو تو اسے سود سے پاک رکھا جاسکتا ہے، اس کے بغیر شرکت صحیح نہ ہوگی۔ جمہور کے نزدیک غیر مسلموں کے ساتھ کاروبار میں شرکت جائز ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر (کی فتح کے بعد) یہود کو اس شرط کے

---

[1] ہدایہ: ۴/ ۴۵۴

ساتھ مقبوضہ زمین پر کاشت کی اجازت دی کہ انھیں پیداوار کا نصف ملے گا۔[1]

جب کھیتی باڑی اور کاشت کاری میں شرکت جائز ہے تو دوسرے معاملات میں بھی اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان سے جزیہ لیا جاتا ہے، جب کہ ان کے اموال شرعی نقطۂ نظر سے بالکل پاک نہیں ہوتے، اس کا ایک حصہ ناپاک ہوتا ہے۔[2]

صحیح بات یہ ہے کہ لین دین اور کاروبار میں غیر مسلموں کے ساتھ شرکت کو اسلام نے روا رکھا ہے۔ کاروبار اگر ناجائز نہ ہو تو غیر مسلم اور مسلم کے درمیان مشارکت ہوسکتی ہے۔

اجرت پر غیر مسلم کی خدمت

جائز کاموں میں اجرت پر غیر مسلم کی خدمات شخصی طور پر بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ آگے یہ بحث تفصیل سے آئے گی کہ اسلامی ریاست بھی ان کی خدمات سے بالمعاوضہ فائدہ اٹھاسکتی ہے۔ یہاں اس کے بالکل برعکس پہلو کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی مسلمان اجرت پر کسی غیر مسلم کی خدمت کرسکتا ہے یا نہیں؟

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم کی خدمت کرنا اور اس پر اجرت حاصل کرنا صحیح ہے اور یہ ایک جائز اجرت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ پر فاقہ کی کیفیت تھی۔ حضرت علیؓ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ کسی کام کی تلاش میں نکلے، تاکہ اس کی آمدنی سے آپ کے لیے کھانے کا سامان کرسکیں۔ ایک یہودی کے باغ میں پہنچے۔ اس کی سینچائی کی۔ سترہ ڈول کھینچے اور ہر ڈول پر ایک عمدہ کھجور ملی۔ اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[3]

---

[1] بخاری، کتاب الشرکۃ، باب مشارکۃ الذمی والمشرکین فی المزارعۃ

[2] ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغنی: ۷/ ۱۰۹، ۱۱۰۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۱۳۵

[3] ابن ماجہ، کتاب الرہون، باب الرجل یستقی کل دلو بتمرۃ۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری نے آپ سے عرض کیا کہ (آج) میں آپ (کے چہرہ) کا رنگ متغیر دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: بھوک کی وجہ سے ہے۔ وہ گھر پہنچے، لیکن وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ وہ باہر تلاش میں نکلے تو دیکھا کہ ایک یہودی اپنے باغ میں آب پاشی کر رہا تھا۔ انصاری نے یہودی سے پوچھا کہ کیا میں اسے سیراب کردوں؟ اس نے کہا: اچھا۔ انھوں نے کہا: ہر ڈول پر ایک کھجور دینی ہوگی، جو نہ تو زیادہ پکی ہوگی نہ کچی، بلکہ عمدہ ہوگی۔ اس نے مان لیا۔ انھوں نے اس طرح دو صاع کھجوریں حاصل کیں، اور آپ کی خدمت میں پیش کیں[1]

یہ مدنی دور کے واقعات ہیں۔ مکہ میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت خبابؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک لوہار تھا۔ میں نے مکہ میں عاص بن وائل کا کام کیا۔ میری اجرت اس کے پاس جمع ہوگئی۔ میں نے اس کا تقاضا کیا تو اس نے کہا: قسم خدا کی، میں اس وقت تک ادا نہیں کروں گا، جب تک کہ تم محمد (ﷺ کی رسالت) کا انکار نہ کرو۔ میں نے کہا: قسم خدا کی، تمہارے مرکر دوبارہ زندہ ہونے تک بھی یہ نہیں ہوگا۔ اس نے سوال کیا کہ کیا مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہوکر اٹھوں گا؟ میں نے جواب دیا: ہاں یہ ہوگا۔ اس نے کہا: اگر ایسا ہوا تو اس وقت میرے پاس مال اور اولاد سب ہی کچھ ہوگا۔ تمہارا قرض بھی ادا کردوں گا[2]

اس حدیث کے ذیل میں محدث مہلب کے حوالہ سے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

---

[1] ابن ماجہ، حوالہ سابق۔ ان دونوں احادیث میں کسی قدر ضعف ہے، لیکن فقہاء نے ان سے استدلال کیا ہے۔

[2] بخاری، کتاب الاجارۃ، باب ہل یواجر الرجل نفسہ من مشرک فی ارض الحرب۔ فقہ حنفی میں اس کی بھی اجازت ہے کہ مسلمان کنیسہ کی تعمیر میں اجرت پر کام کرے (رد المحتار علی الدر المختار: ۵/ ۳۴۴، ۳۴۵) اس پر بعض دوسرے پہلوؤں سے گفتگو ہوسکتی ہے۔

کرہ اھل العلم ذٰلک الّا لضرورۃ بشرطین: احد ھما ان یکون عملہ فی ما یحلّ للمسلم فعلہ والاٰخران لاَ یعینہ علی ما یعود ضررہ علی المسلمین۔[۱]

اہلِ علم نے اجرت پر غیر مسلم کا کام کرنے کو ناپسند کیا ہے۔ ہاں مجبوری ہو تو دو شرطوں کے ساتھ یہ جائز ہوگا: ایک یہ کہ غیر مسلم جو کام لے اس کا کرنا مسلمان کے لیے حلال ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی ایسے کام میں اس کی معاونت نہ کرے، جس کا نقصان بالآخر مسلمانوں کو پہنچے۔

اس کے ناپسندیدہ ہونے کا جہاں تک تعلق ہے ایک خود دار قوم شاید دوسروں کی غلامی اور نوکری کو پسند نہیں کرے گی۔ جن شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی گئی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ غیر مسلم کا جو بھی کام کیا جائے اسے اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا مفاد پیش نظر رہنا چاہیے، اس کے خلاف کوئی عمل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دونوں شرائط اس لیے رکھی گئی ہیں کہ غیر مسلم ان کی رعایت نہیں کرے گا۔ وہ ان کے خلاف بھی کوئی خدمت لینے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اس پہلو سے ان کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ایک سوال یہ ہے کہ کیا کسی غیر مسلم کی ملازمت یا نوکری مسلمان کے لیے عار اور ذلت کا باعث ہے؟ اس کا جواب فقہ کی روشنی میں علامہ ابن المنیّر نے یہ دیا ہے کہ مذاہب فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلمان کاریگروں کا اپنی دکانوں میں بیٹھ کر ذمیوں کے لیے کام کرنا جائز ہے، اس میں ذلت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ایک مسلمان کا کسی ذمی کے گھر اس کی خدمت کرنا اور اس کی ماتحتی اختیار کرنا صحیح نہیں ہے، اس میں ذلت ہے۔[۲]

امام احمد کے نزدیک اجرت پر کسی ذمی (غیر مسلم) کی ذاتی خدمت کرنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی سے اس کے جواز اور عدم جواز دونوں طرح کی روایات منقول

۱۔ فتح الباری: ۴/۴۵۲

۲۔ حوالہ سابق

ہیں۔ جواز کے حق میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جب اجرت پر ذمی کا کوئی کام کرنا جائز ہے تو اس کی خدمت کو بھی جائز ہونا چاہیے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ اس کے اندر مسلمان کی تذلیل ہے، اس لیے وہ ناجائز ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان اجرت پر ذمی کا کوئی کام انجام دے، جیسے کپڑے کی سلائی یا دھلائی۔ اسی طرح مدت متعین کے لیے کام کرنا بھی جائز ہے[1]

اس میں ذمی کی بالواسطہ خدمت اور بلاواسطہ خدمت میں فرق کیا گیا ہے۔ پہلی صورت کو جائز اور دوسری کو ناجائز کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی مسلمان درزی، لوہار، بڑھئی، نان بائی یا کسی بھی قسم کا کاریگر ہے تو اس کا اپنی دکان کے ذریعہ ذمیوں کی ضرورت پوری کرنا اور اس پر اجرت لینا صحیح ہے، البتہ ذمی کا شخصی ملازم اور خدمت گار بننا اس کے وقار کے منافی ہے۔

موجودہ دور میں معاشرہ کی اس طرح کی عمومی ضروریات بڑے بڑے اداروں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے ذریعے پوری کی جاتی ہیں۔ یہ ادارے بالکل نجی اور شخصی بھی ہوتے ہیں، لیکن بالعموم انھیں کئی کئی افراد کے گروپ چلاتے ہیں اور بعض ادارے قومی ملکیت میں بھی ہوتے ہیں۔ ان میں فنی ماہرین ہوں یا عام محنت مزدوری کرنے والے، سب ہی افراد ادارہ کے ملازم یا کارکن ہوتے ہیں۔ ادارہ اور کارکن دونوں کے حقوق بھی بڑی حد تک متعین ہوتے ہیں۔ اس میں شخصی خدمت میں ذلت کا جو تصور ہے وہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان اداروں کو چاہے مسلمان چلا رہے ہوں یا غیر مسلم، ان میں کسی مسلمان کا ملازمت اختیار کرنا غلط یا پسندیدہ نہ ہوگا، بشرطے کہ ادارے حرام چیز نہ پیدا کر رہے ہوں۔

☆☆

---

۱ ابن قدامہ، المغنی: ۸/ ۱۳۵، ۱۳۶

۲ حوالہ سابق

۱- غیر مسلم کو سلام کا حکم

حدیث میں سلام کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے اور اسے عام کرنے کا حکم ہے[۱] زیادہ تر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ انھیں آپس کے تعلقات میں جن باتوں کی ہدایت کی گئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ملاقات کے وقت سلام کریں۔ بعض احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاَ تدخلوا الجنّة حتّٰی تومنوا، ولاَ تومنُوا حتّٰی تحابُّوا، اَوَلاَ ادلُّکم علٰی شیء اذا فعلتموہ تحاببتم، افشو السّلام بینکم[۲]

تم جنت میں نہیں داخل ہوگے تا آں کہ ایمان نہ لاؤ اور ایمان (کامل) نہ لاؤ گے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اس پر عمل کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟ وہ یہ ہے کہ اپنے درمیان سلام کو عام کرو۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان سلام کا زیادہ سے زیادہ رواج ہونا چاہیے۔ اس سے اجنبیت اور دوری ختم ہوگی اور تعلقات مضبوط ہوں گے۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: راقم کا مضمون 'سلام کی اہمیت اور غیر مسلم کو سلام کا حکم' مطبوعہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء

۲۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان انہ لا یدخل الجنۃ الا المؤمنون الخ. ابوداؤد، کتاب السلام، باب افشاء السلام۔ ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی افشاء السلام

غیر مسلموں کو سلام کرنے کی ممانعت

سلام کو چوں کہ مسلمانوں کے درمیان عام کرنے کا حکم ہے اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جائے گا۔ اس کی تائید میں حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ایک اور حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاَ تبدءو اليهود والنصارى بالسلام فاذا لقيتم احدهم فى طريق فاضطروه الى اضيقه[1]

یہود و نصاریٰ کو سلام کا آغاز تمھاری طرف سے نہ ہو۔ ان میں سے کسی سے راستہ میں تمھاری ملاقات ہوجائے تو اسے اس کے تنگ حصہ میں چلنے پر مجبور کرو۔

اس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پیش قدمی نہیں کی جائے گی اور انھیں راستہ کے کنارے چلنے پر مجبور کیا جائے گا۔[2]

ممانعت کی نوعیت

سوال یہ ہے کہ کیا یہ حکم مستقل نوعیت کا ہے یا اس وقت کے مخصوص حالات کے تحت دیا گیا ہے؟ اس پر کسی قدر تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن اہل الکتاب بالسلام۔ ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی کراہیۃ التسلیم علی الذمی۔ ابوداؤد، کتاب السلام، باب فی السلام علی اہل الذمہ۔ مسند احمد: ۱۹/ ۴۷۔ حدیث نمبر ۹۹۲۱۔ مسند کی ایک روایت میں یہود کی جگہ مشرکین کا لفظ آیا ہے: ۱۹/ ۱۵، حدیث نمبر ۹۷۲۴

[2] راستہ سے متعلق اس ہدایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انھیں راستہ سے دھکا دے کر کنارے کر دیا جائے، تاکہ وہ آسانی سے نہ چل سکیں، بلکہ بھیڑ بھاڑ اور اژدحام ہو تو ان کے احترام میں خود کنارے ہوکر انھیں درمیانی راستہ نہ دیا جائے، بلکہ اسی زحمت اور تنگی سے گزرنے دیا جائے۔ اگر راستہ کشادہ ہو اور کسی کے گزرنے میں کوئی زحمت نہ ہو تو وہ سب کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں انھیں کنارے چلنے کا پابند بنانا بلاوجہ کی اذیت رسانی ہے، جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔ فتح الباری: ۱۱/ ۴

رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ پہنچنے کے فوراً بعد یہود کے ساتھ امن و امان، مذہبی آزادی اور باہمی تعاون کا معاہدہ ہوا[1] لیکن انھوں نے کبھی اس کی پاس داری نہ کی۔ اسلام دشمنی، سازشیں اور خیانتیں روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ سلام و کلام میں ان کے غیر شریفانہ رویہ کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ان کی ان تمام حرکتوں کے باوجود قرآن نے درگزر کا حکم دیا (البقرۃ:۱۰۹) جب یہ سازشیں آخری حد کو پہنچ گئیں تو ان سے جنگ بھی ہوئی اور انھیں جلاوطن بھی کیا گیا۔ (الحشر:۱-۵) اس طرح حالات کے لحاظ سے ان کے سلسلے میں اسلام کے رویہ میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سلام میں پیش قدمی نہ کرنے اور راستہ میں ان کا احترام نہ کرنے کی ہدایت اسی طرح کے حالات میں دی گئی ہو۔ ظاہر ہے، حالات کے بدل جانے کے بعد حکم بھی بدل جائے گا۔ اس کی تائید بعض صحابہ و تابعین کے عمل سے ہوتی ہے۔

غیر مسلم کو سلام کرنے کا ثبوت

روایت ہے کہ حضرت ابو امامہؓ کا راستہ چلتے ہوئے جس کسی کے پاس سے بھی گزر ہوتا، چاہے وہ مسلمان ہو یا نصرانی، چھوٹا ہو یا بڑا اسے سلام کرتے۔ جب ان سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ ہمیں سلام کے عام کرنے اور پھیلانے کا حکم ہے۔[2]

بیہقی کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو امامہؓ نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے لیے برکت کی دعا اور ذمیوں کے لیے امن و امان کا اظہار ہے۔[3]

امام ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ سلف سے مروی ہے کہ وہ اہل کتاب کو سلام کیا کرتے تھے۔[4]

---

[1] معاہدہ کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۲/۱۱۹-۱۲۳۔ اس کی بعض دفعات کا حوالہ اسی کتاب میں موجود ہے۔

[2] قال الحافظ اخرجہ الطبری بسند جید۔ فتح الباری: ۱۱/۴۱

[3] ابن حجر، فتح الباری: ۱۱/۳۹۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/۱۱۲

[4] قرطبی، حوالہ سابق

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت ابودرداءؓ اور فضالہ بن عبیدؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ اہل کتاب کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے[۱]

عون بن عبد اللہؒ کہتے ہیں کہ محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا کہ انھوں نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے دریافت کیا کہ ذمیوں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کی جاسکتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہماری طرف سے سلام کی ابتدا صحیح نہیں ہے، البتہ ان کے سلام کا جواب دیا جائے گا۔ عون بن عبد اللہ نے اس مسئلہ میں خود محمد بن کعب قرظی کی رائے دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ انھیں آگے بڑھ کر سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے[۲]

امام اوزاعی سے سوال کیا گیا کہ کیا کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے پاس سے گزرتے وقت اسے سلام کرسکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اگر تم نے سلام کیا تو اس سے پہلے صالحین نے سلام کیا ہے اور اگر تم نے سلام نہیں کیا تو صالحین نے سلام نہیں بھی کیا ہے۔ (یعنی سلف سے دونوں طرح کے عمل منقول ہیں)[۳]

سماجی تقاضوں کے تحت غیر مسلم کو سلام کا جواز

ایک خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تو سلام کو ہر موقع اور ملاقات پر عام کرنے کا حکم ہے، غیر مسلموں کے بارے میں اس طرح کی ہدایت نہیں ہے، البتہ سماجی ضروریات اس کا تقاضا کر رہی ہوں تو انھیں سلام کیا جاسکتا ہے۔

حضرت علقمہؒ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ بعض دہقان (ذمی) بھی شریک سفر تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کا راستہ الگ ہوگیا اور وہ اس پر چلنے لگے تو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے انھیں سلام کیا۔

---

۱ عینی، عمدۃ القاری: ۱۲ / ۱۹

۲ ابن حجر، فتح الباری: ۱۱ / ۳۹

۳ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱ / ۱۱۲۔ نووی، شرح مسلم، ج ۵، جزء ۱۴، ص ۱۴۵

میں نے عرض کیا کہ کیا ذمیوں کو سلام کرنا ناپسندیدہ نہیں ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ یہ تو حقِ صحبت ہے[۱]

بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کا اپنی کسی حاجت اور ضرورت کے تحت غیر مسلم کو سلام کرنا جائز ہے۔ قاضی عیاض کے بقول یہ حضرت علقمہ اور امام نخعی کا قول ہے[۲]

سلیمان الاعمش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے کہا کہ ایک نصرانی طبیب کے ہاں میری آمد و رفت رہتی ہے۔ کیا میں اسے سلام کرسکتا ہوں؟ آپ نے جواب دیا کہ جب تمہاری اس سے کوئی حاجت ہے تو سلام کرو[۳]

حضرت ابراہیم نخعی کا قول علامہ قرطبی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اذا کانت لک حاجة عند یهودی او نصرانی فابدأه بالسلام	جب تمہیں کسی یہودی یا نصرانی سے کوئی حاجت درپیش ہو تو اس سے ملاقات کا آغاز سلام سے کرو۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

۱۔ قال الحافظ اخرجہ الطبری بسند صحیح، فتح الباری: ۱۱/۴۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/۱۱۲۔ مصنف عبد الرزاق کی روایت میں علقمہ کے سوال اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے جواب کا ذکر نہیں ہے: ۶/۱۲۔ امام محمد کی روایت ہے کہ ایک ذمی نے، جو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ساتھ تھا، جدا ہوتے وقت سلام کیا تھا اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا تھا۔ کتاب الآثار، ص ۱۲۸۔ (مطبع اسلامی لاہور ۱۹۱۱ء) علامہ ابو بکر جصاص حضرت علقمہ کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: 'ظاهره **یدل علی ان عبد اللہ بدأهم بالسلام لان الرد لا یکره عند احد، احکام القرآن: ۳/۵۲۵** یعنی بظاہر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ان لوگوں کو سلام کیا تھا، اس لیے کہ جہاں تک سلام کے جواب کا تعلق ہے وہ کسی کے بھی نزدیک ناپسندیدہ نہیں ہے۔

۲۔ نووی، شرح مسلم، ج ۵، جزء ۱۴، ص ۱۴۵

۳۔ جصاص، احکام القرآن: ۳/۵۲۶

فبان بهذا ان حديث ابی هريرة ... اذا كان لغير سبب يدعوكم الى ان تبدوهم بالسلام من قضاء زمام او حاجة تعرض لكم قبلهم او حق صحبة او جوار او سفر[1]

اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت (جس میں غیر مسلم کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے) کا تعلق بغیر کسی سبب کے سلام کرنے سے ہے، جیسے کسی حق کی ادائیگی یا کوئی حاجت جو تمہیں ان سے پیش آئے یا صحبت، ہمسائیگی اور سفر کا حق (اس طرح کا کوئی سبب ہو تو سلام کیا جاسکتا ہے)۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ ضرورت پر ذمی کو سلام کیا جاسکتا ہے۔ ہاں بغیر کسی ضرورت کے سلام کرنا ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح کہا گیا ہے کہ ضرورت کے تحت مصافحہ بھی جائز ہے، لیکن بے ضرورت ناپسندیدہ ہے۔ بطور مثال ایک ضرورت یہ بیان ہوئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ محسوس کرے کہ سفر سے واپسی کے بعد وہ اپنے نصرانی پڑوسی سے مصافحہ نہ کرے تو اسے تکلیف پہنچے گی تو اسے مصافحہ کرنا چاہیے[2]

اس طرح کی سماجی، معاشرتی، معاشی، طبی، علمی اور عملی ضروریات کی کوئی متعین فہرست نہیں ہے، آدمی اپنے حالات اور ماحول کے لحاظ سے ان کا تعین کرے گا۔ جہاں کسی ضرورت کا تقاضا ہو غیر مسلم سے ملاقات، سلام اور مصافحہ کو بلا کراہت جائز سمجھنا چاہیے۔

تالیفِ قلب کے لیے سلام کی گنجائش

ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں شاید تالیف قلب کے لیے غیر مسلموں کو سلام کرنے کی اجازت تھی، لیکن جب اسلام کو اقتدار اور استحکام حاصل ہوگیا تو اس کی ضرورت نہیں رہی[3]

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱ / ۱۱۲

[2] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵ / ۲۶۳

[3] ابن حجر، فتح الباری: ۱ / ۵۶۔ عینی۔ عمدۃ القاری: ۱ / ۱۵۷

یہ بات اس وقت صحیح ہوگی جب کہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ افشاءِ سلام کا حکم پہلے اور ممانعت کا بعد میں دیا گیا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ تالیفِ قلب کا مقصد، جیسا کہ فقہاء نے کہا ہے 'غیر مسلموں کے قلوب کو اپنی زبان اور اپنے حسن سلوک سے اسلام کی طرف مائل کرنا' ہے،[۱] یہ کوئی وقتی اور ہنگامی مقصد نہیں ہے، بلکہ مضبوط سے مضبوط اسلامی حکومت قائم ہوجائے تو بھی باقی رہے گا، اِلاّ یہ کہ ریاست میں کوئی غیر مسلم ہی نہ ہو۔ صحیح بات یہ کہ اسلام نے جن اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی ہے، سلام اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس پر اسی پہلو سے غور کرنا چاہیے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مشترک مجمع کو سلام

اگر مجلس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں موجود ہوں تو سلام کیا جاسکتا ہے۔ اس کا ثبوت صراحتاً حدیث سے ملتا ہے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ بدر سے پہلے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ سواری گدھے کی تھی۔ اس پر زین اور فدک کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ پیچھے آپ نے حضرت اسامہؓ کو بٹھا لیا۔ راستہ میں ایک ایسی مجلس سے گزر ہوا جس میں مسلمان، بت پرست مشرکین اور یہود تھے۔ ان میں مشہور منافق عبد اللہ بن ابی بھی تھا۔ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ بھی مجلس میں موجود تھے۔ جب آپ قریب پہنچے تو سواری کی گرد وغبار اڑنے لگی۔ عبد اللہ بن ابی نے چادر سے اپنی ناک ڈھانک لی اور کہا کہ ہم لوگوں پر گرد وغبار نہ اڑاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے سلام کیا اور سواری سے اتر گئے۔ ان لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور قرآن کی تلاوت کی۔ عبد اللہ بن ابی نے اس کے جواب میں کہا: اگر آپ کی بات حق ہے تو اس سے اچھی کون سی بات ہوسکتی ہے، لیکن آپ ہمیں ہماری مجالس میں آکر پریشان نہ کریں۔

۱؎ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵/۳۴۶

آپ اپنے مقام پر جائیں، ہم میں سے جو آپ کے پاس پہنچے اس کے سامنے اپنی بات رکھیں۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنی باتیں ہماری مجالس میں پیش فرمائیں، ہم انھیں پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اور مشرکین اور یہود ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور مار پیٹ شروع ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں خاموش اور پرسکون رہنے کی تلقین فرمائی۔ پھر آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور حضرت سعد بن عبادہؓ کے پاس پہنچے۔ فرمایا: اے سعد! کیا تم نے ابوحباب (عبداللہ بن ابی) کی باتیں سنیں۔ اس نے یہ اور یہ کہا ہے۔ انھوں نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! اسے معاف فرمایئے۔ قسم خدا کی! اللہ نے آپ کو بڑا اونچا مقام عطا کیا ہے۔ مدینہ کے لوگوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اسے تاج پہنائیں گے (بادشاہ بنائیں گے)۔ اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ذریعے، جو اس نے آپ کو عطا کیا ہے، اس منصوبہ کو ختم کر دیا۔ اس وجہ سے اس کا دم گھٹنے لگا ہے اور یہ حرکت اس نے اسی وجہ سے کی ہے۔ چناں چہ آپؐ نے اسے درگزر فرما دیا[1]

اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس سے آپ کی دعوتی جدوجہد، مخالفین تک اسے پہنچانے کی فکر، آپ کا صبر، حلم اور عفو و درگزر اور چھوٹوں کی خبر گیری اور عیادت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی ملی جلی مجلس کو سلام کیا جاسکتا ہے۔

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ جب تمہارا گزر کسی ایسی مجلس پر ہو جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہوں تو سلام کرو[2]

اس حدیث کی بنیاد پر امام نووی فرماتے ہیں کہ جس مجلس میں مسلمان اور کافر دونوں ہوں یا ایک بھی مسلمان ہو تو اسے سلام کیا جاسکتا ہے، لیکن سلام کرتے وقت

---

[1] بخاری، کتاب الاستیذان، باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین و المشرکین، کتاب المرضٰی، باب عیادۃ المریض راکبا و ماشیا۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب ما لقی النبیؐ من اذی المشرکین والمنافقین

[2] عبد الرزاق، المصنف: ۶/ ۱۶ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/ ۱۱۲

مسلمانوں کو مخاطب سمجھا جائے[1]

حضرت اسامہؓ کی اس حدیث میں جس مجلس کا ذکر ہے اس میں مسلمانوں میں عبد اللہ بن رواحہؓ کی موجودگی کا تو ثبوت ملتا ہے، لیکن یہ صراحت نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ان کو مخاطب سمجھ کر سلام کیا تھا۔ یہ بات ان احادیث کی بنیاد پر کہی گئی ہے جن میں یہود کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان کا موقع و محل دوسرا ہے۔

اس سلسلہ کا ایک سوال یہ ہے کہ صرف غیر مسلموں کے مجمع میں دعوت و تبلیغ کے لیے جانا ہو تو کیا اسے سلام کیا جاسکتا ہے؟ میرے خیال میں اس کی گنجائش ہے، اس لیے کہ جب انفرادی نوعیت کی سماجی، معاشرتی اور طبی ضروریات کے تحت غیر مسلم کو سلام کرنے کی فقہاء کے ہاں اجازت ملتی ہے تو دین کے عمومی مفاد اور دعوت و تبلیغ کے لیے بھی اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس سے تالیفِ قلب کا بھی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے، جس کی طرف بعض فقہاء نے اشارہ کیا ہے۔

غیر مسلم کے سلام کا جواب

قرآن مجید کا حکم ہے کہ سلام کا جواب بہتر طریقہ سے دیا جائے یا کم از کم اس طرح جواب دیا جائے جس طرح سلام کیا گیا ہے۔ (النساء:۸۶) سوال یہ ہے کہ غیر مسلم کے سلام کا جواب دیا جائے گا یا نہیں؟ سورۂ نساء کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

ردوا السلام علی من کان یهودیا او نصرانیا او مجوسیا[2]	ہر ایک کے سلام کا جواب دو، چاہے وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی ہو۔

۱؎ نووی، شرح مسلم، ج۵، جزء ۱۴، ص ۱۴۵

۲؎ بخاری، الادب المفرد مع فضل اللہ الصمد: ۲/ ۵۳۳۔ اس کے ایک راوی ولید بن عبد اللہ بن ثور پر بعض محدثین نے جرح کی ہے۔ لیکن یہی روایت کسی قدر اختصار کے ساتھ (باقی اگلے صفحہ پر)

علاّمہ ماوردی فرماتے ہیں کہ سلام کرنا نفل اور مستحب ہے، لیکن اس کا جواب دینا فرض ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، قتادہؒ اور ابن زیدؒ کے نزدیک مسلم اور کافر دونوں کے سلام کا جواب دینا فرض ہے، لیکن حضرت عطاءؒ کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کے سلام کا جواب دینا تو فرض ہے، کافر کے سلام کا جواب دینا فرض نہیں ہے۔[۱]

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: ذمیوں کے سلام کا جواب دینے یا نہ دینے کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ جس طرح مسلمان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے، کیا اسی طرح ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے؟ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، شعبیؒ اور قتادہؒ سورۂ نساء کی آیت سے تمسک کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے، لیکن امام مالکؒ، جیسا کہ اشہب اور ابن وہب نے ان سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ یہ واجب نہیں ہے۔ اگر جواب دیا بھی جائے تو صرف **(علیک)** کہا جائے۔[۲]

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: مشرک کو سلام نہیں کیا جائے گا، البتہ اس کے سلام کا جواب دیا جائے گا۔ امام محمد کے بقول یہی ہمارے عام فقہاء کا قول ہے۔[۳]

امام نووی فرماتے ہیں: شوافع کا مسلک یہ ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرنا حرام ہے، لیکن جواب دینا واجب ہے۔ البتہ جواب میں وعلیکم یا علیکم کہا جائے گا، اس سے زیادہ نہیں۔ یہی اکثر علماء اور عام سلف کی رائے ہے۔[۴]

(گزشتہ سے پیوستہ) طبری میں ہے۔ اس کے راویوں میں یہ مجروح راوی نہیں ہے۔ طبری کے الفاظ ہیں: **من سلّم علیک من خلق اللہ فاردد علیہ و ان کان مجوسیًّا**۔ تفسیر طبری، طبع جدید: ۸/۵۸۷۔ چناں چہ حافظ ابن حجر نے اس کی سند پر کوئی جرح نہیں کی ہے، بلکہ اس کی توثیق کی ہے۔ فتح الباری: ۱۱/۴۲

[۱] ماوردی، النکت والعیون: ۱/۴۱۱

[۲] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵/۳۰۵۔ نیز ملاحظہ ہو: ۱۷/۲۹۳

[۳] جصاص، احکام القرآن: ۳/۵۲۵

[۴] نووی، شرح مسلم، ج۵، جزء ۱۴، ص ۱۴۵

غیر مسلم کے سلام کا جواب کس طرح دیا جائے؟

سلف میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ سورۂ نساء میں سلام کا جواب بہتر طریقے سے دینے یا سلام کے الفاظ دہرا دینے کا حکم ہے۔ ان میں سے پہلی صورت مسلمانوں سے اور دوسری صورت غیر مسلموں سے متعلق ہے۔

ابن زیدؒ کہتے ہیں:

حق علی کل مسلم حیّ بتحیة ان یحیّ باحسن و اذا حیّاہ غیر اھل اسلام ان یردّ علیه مثل ما قال[1]

جس کسی مسلمان کو بھی سلام کیا جائے اس پر واجب ہے کہ بہتر طریقہ سے جواب دے اور جب اسے اہل اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا سلام کرے تو اسی جیسا جواب دے۔

حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ بہتر طریقہ سے جواب مسلمان کے لیے ہے اور سلام کرنے والے کے الفاظ ہی کو لوٹا دینا اہل کتاب کے لیے ہے۔[2]

آیت میں بظاہر مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، اس کے پیچھے یہ خیال ہو کہ ایک مسلمان کا اخلاقی حق غیر مسلم کے حق سے زیادہ ہے، اس لیے غیر مسلم کے سلام کا جن الفاظ میں جواب دیا جاتا ہے ان سے بہتر الفاظ میں مسلمان کے سلام کا جواب دیا جانا چاہیے۔

یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ اس امر میں علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غیر مسلم کے سلام کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات نے اسے ضروری بھی قرار دیا ہے، البتہ یہ بحث ضرور ہے کہ جواب کن حدود میں ہو اور اس کے لیے کیا الفاظ استعمال کیے جائیں؟

اس طرح کے اختلافی امور میں حالات کے لحاظ سے اور غیر مسلموں سے معاشرتی تعلقات کی بنیاد پر کوئی بھی رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اسے غلط نہیں کہا جائے گا۔

۱؎ طبری، جامع البیان: ۸/ ۵۸۸

۲؎ حوالہ سابق: ۸/ ۵۸۷

سلام کرنے میں یہود کی شرارت اور اس کا جواب

ہمارے خیال میں اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایک غیر مسلم کا مجموعی رویہ کیا ہے اور کن الفاظ میں وہ سلام کرتا ہے۔ یہود مدینہ کی عداوت اور دشمنی بالکل نمایاں تھی۔ جب بھی موقع ملتا ان کے بغض وعناد کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سلام بھی کرتے تو نازیبا اور غیر شائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ قرآن مجید کا بیان ہے:

وَ اِذَا جَآؤُکَ حَیُّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِهِ اللّٰهُ وَ یَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ یَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ○ (المجادلة:۸)

جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو سلام اس طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ پر سلام نہیں بھیجا ہے اور اپنے جی میں کہتے ہیں کہ ہماری اس حرکت پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ جہنم ان کے لیے کافی ہے، اس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

یہود کے اس رویہ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے انھیں سلام کرنے سے منع کیا اور ہدایت فرمائی کہ ان کے شرارت آمیز سلام کے جواب میں صرف یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ وہی کچھ کرے جو تم ہمارے ساتھ چاہتے ہو۔ احادیث میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہاں بعض احادیث پیش کی جا رہی ہیں:

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا۔

اِن اهل الکتاب یسلّمون علینا فکیف نردّ علیهم قال قولوا و علیکم[1]

اہلِ کتاب ہمیں سلام کرتے ہیں ہم انھیں جواب کس طرح دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: 'وعلیکم' کہو۔

حضرت انسؓ ہی کی ایک اور روایت ہے:

اذا سلّم علیکم اهل الکتاب فقولوا

جب اہل کتاب تمھیں سلام کریں تو تم

---

[1] مسلم، کتاب السلام، باب النّھی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام و کیف یرد علیھم۔ ابوداؤد، ابواب السلام، باب فی السلام علی اہل الذمۃ

و علیکم[۱] 'وعلیکم' کہو۔

بعض دوسری روایات سے اس جواب کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا سلّم علیکم الیهود فانما یقول احدهم السام علیکم فقل و علیک[۲] یہود تمھیں جب سلام کرتے ہیں تو 'السام علیکم' کہتے ہیں۔ تم جواب میں 'وعلیک' کہہ دو۔"

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک یہودی نے 'السام علیکم' کہا۔ خدمت میں جو صحابہؓ موجود تھے انھوں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا: تمھیں معلوم ہےکہ اس نے کیا کہا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس نے سلام کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! اس نے 'السام علیکم' کہا (تمھیں موت آئے یا تم اپنے دین سے اکتا جاؤ) اسے واپس بلاؤ تاکہ دریافت کیا جائے۔ اسے واپس بلایا گیا۔ دریافت کرنے پر اس نے اعتراف کیا کہ اس نے 'السام علیکم' ہی کہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب اہل کتاب تمھیں سلام کریں تو تم 'علیکم ما قلتم' کہو۔ (یعنی تم پر وہ چیز طاری ہو جس کی تم نے ہمارے لیے دعا کی ہے)۔[۳]

ان روایات سے واضح ہے کہ یہود سلام کرنے میں شرارتِ نفس اور خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کا شریفانہ اور باوقار انداز میں جواب دینے کی ہدایت کی گئی کہ تمھارے یہ الفاظ تمھارے ہی لیے مبارک ہوں۔ تم ہماری تباہی اور بربادی کے آرزو مند ہو۔ خدا تمھیں اسی سے دوچار کرے۔ اس سے آگے بڑھ کر جواب میں بدزبانی اور بدکلامی سے منع کیا گیا ہے۔

---

۱ بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف الرد علی اہل الذمۃ، مسلم، کتاب السلام، باب النّہی عن ابتداء اہل الکتاب الخ

۲ بخاری و مسلم، حوالہ سابق

۳ رواہ البزار و ابن حبان۔ فتح الباری: ۱۱/ ۴۳، و رواہ البخاری فی الادب المفرد مختصراً: ۲/ ۵۳۲، ۵۳۳

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہود کے کچھ افراد آئے اور 'السام علیک' کہا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا: '**علیکم السام و اللّعنة**' (موت تمھیں آئے اور خدا کی لعنت تم پر ہو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عائشہ، صبر سے کام لو، درشت کلامی سے احتراز کرو، اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں رفق و ملاطفت اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا: انھوں نے جو کہا کیا وہ آپ نے نہیں سنا؟ آپ نے فرمایا: میں نے سنا ہے اور اس کے جواب میں '**وعلیکم**' کہہ دیا ہے۔ (یعنی موت اور اکتاہٹ تم پر آئے) یہ جواب کافی ہے[1]

جواب میں نازیبا الفاظ کے استعمال کی ممانعت

اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہود کی سازشوں اور ان کے طنز و تعریض سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ سلام کرتے وقت غیر مہذب الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن جواب میں زبان مبارک نامناسب کلمات سے پاک رہی۔ اسی کی تعلیم آپ نے صحابہ کرامؓ کو دی اور فرمایا: ''ہم ان کے حق میں جو دعا کریں گے وہ تو قبول ہوگی، لیکن وہ جو بد دعا کر رہے ہیں وہ قبول نہیں ہوگی۔''[2] اس لیے کہ ہم مظلوم اور وہ ظالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت مظلوم کو حاصل ہوتی ہے اور ظالم اس سے محروم رہتا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے: یہود جس طرح 'السلام علیکم' کو زبان کی لوچ سے 'السام علیکم' کر دیتے ہیں، اسی طرح ان کے جواب میں زبان کو گھما کر 'علیکم السام' کہنا چاہیے۔ اس کے معنی ہیں: تم پر پتھر پڑیں یا 'علاکم السلام' کہا جائے، یعنی تم سے سلامتی

---

[1] بخاری، کتاب الاستیذان، باب **کیف الرد علی اھل الذمة**۔ مسلم، کتاب السلام، باب النھی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام الخ

[2] بخاری، کتاب الدعوات، باب قول النبیؐ **یستجاب لنا فی الیھود** الخ۔ مسلم، کتاب السلام، باب النھی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام الخ

اٹھ جائے، لیکن جیسا کہ علامہ ابن عبد البر نے کہا ہے، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ذمیوں کو برا بھلا کہنا اور ان کے ساتھ بد زبانی کرنا جائز نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جب انھیں برا بھلا کہنا چاہا تو آپؐ نے اسے ناپسند فرمایا[۱]

اوپر کی روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے بغض و عناد، ان کی شرارت اور ان کی بد زبانی اور بدکلامی کی وجہ سے انھیں سلام نہ کرنے یا ان کے سلام کا خاص طریقہ سے جواب دینے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن جہاں غیر مسلموں سے بہتر روابط ہوں اور وہ مسلمانوں کے ساتھ عداوت اور مخاصمت کا رویہ نہ رکھتے ہوں، وہاں اگر کوئی غیر مسلم، اسلامی تعلیمات یا اسلامی معاشرہ کے زیر اثر کسی مسلمان کو 'السلام علیکم' کے ذریعے خطاب کرے تو جواب میں اس کا رویہ بھی بظاہر مختلف ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے بعض علماء نے ممانعت کے حکم کو ایسا حکم نہیں مانا ہے جو ابدی ہو اور جس پر عمل ہر حال میں لازم ہو۔ ان کے نزدیک غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اسی طرح وعلیکم السلام کہا جاسکتا ہے جیسے مسلمان کے سلام کے جواب میں کہا جاتا ہے[۲]

شوافع میں سے بعض کی یہ رائے ہے کہ وعلیکم السلام تو کہا جاسکتا ہے، لیکن اس سے آگے 'ورحمۃ اللہ' کا اضافہ غلط ہوگا[۳]

لیکن امام شعبی اسے غلط نہیں سمجھتے۔ ایک نصرانی نے انھیں سلام کیا تو انھوں نے جواب میں 'وعلیک السلام و رحمۃ اللہ' کہا۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں جی نہیں رہا ہے؟[۴]

---

۱ فتح الباری: ۱۱/۴۵

۲ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: و ذھب جماعۃ من السلف الی انہ یجوز ان یقال فی الرد علیھم و علیکم السلام کما یرد علی المسلم فتح الباری: ۱۱/۴۵۔ نیز ملاحظہ ہو۔ عینی، عمدۃ القاری: ۱۸/۳۰۶

۳ نووی: شرح مسلم جلد۵، جزء ۱۴، ص ۱۴۵ ۴ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۵۵۰

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں: اگر اہل کتاب میں سے کوئی السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہتا ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ جواب بھی اس طرح دیا جائے۔[۱]

سلام کے معاملہ میں ذمی اور حربی کا فرق

بعض حضرات نے اس معاملہ میں ذمی اور حربی کا فرق کیا ہے۔[۲] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی مملکت کے شہری ہیں جن کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس کے ذمہ ہے اور جو اس کے امن و امان میں ہیں ان کے ساتھ سلام و کلام کا وہ انداز نہیں ہوگا جو ان لوگوں کے ساتھ اختیار کیا جاسکتا ہے جو اسلامی مملکت سے برسرِ پیکار ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک ذمی کو خط میں سلام لکھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ کیا آپ غیر مسلم کو سلام لکھ رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، اس نے اپنے خط میں مجھے سلام لکھا تھا، میں نے اس کا جواب دیا ہے۔[۳]

مشہور محدث ابن عیینہؒ سے سوال کیا گیا:

هل يجوز السّلام على الكافر؟ کیا کافر کو سلام کرنا جائز ہے؟

انھوں نے جواب دیا: 'نعم' ہاں، دیا جاسکتا ہے اور پھر سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت پڑھی لاينهاكم الله الاية جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک سے منع نہیں کرتا جنھوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں اپنے وطن سے نہیں نکالا۔ وہ تو ان لوگوں سے قریبی تعلق رکھنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے جنگ کی، تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور اس معاملہ میں دوسروں کی مدد کی۔" (ممتحنہ: ۸،۹)[۴]

---

۱ احکام اہل الذمۃ: ج ۱، ص ۴۲۶

۲ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: **و عن بعضهم التفرقة بين اهل الذمة و اهل الحرب۔** فتح الباری ۱۱/ ۴۵۔ نیز ملاحظہ ہو: عینی، عمدۃ القاری: ۱۸/۳۰۶

۳ بخاری، الادب المفرد: ۲/۵۲۹ ۴ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/۱۱۱

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حربی اور غیر حربی یا معاہد اور غیر معاہد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن چوں کہ غیر حربی کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا، اس لیے اسے سلام بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی حسن سلوک میں داخل ہے۔

غیر مسلم کو سلام کے لیے مناسب الفاظ

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سلام اور اس کے جواب کے الفاظ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر مسلموں کے لیے دوسرے الفاظ استعمال کیے جانے چاہئیں۔ اس کی تائید میں وہ خط پیش کیا جاتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے شاہِ روم، ہرقل کو لکھا تھا۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم من محمّد عبد اللّٰہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم، السلام علٰی من اتبع الھدیٰ. اما بعد ...[1]

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ محمد (ﷺ) کی جانب سے جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، ہرقل کی طرف جو روم کا سربراہ ہے۔ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔ اما بعد۔

محدث ابن بطال کہتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کی دلیل ہے جن کے نزدیک اہلِ کتاب سے مراسلت میں وقت ضرورت انھیں سلام لکھنا جائز ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ **والسلام علی من اتبع الھدی** کا سیاق وسباق دوسرا ہے۔ اس میں ایک اصولی بات کہی گئی ہے کہ جو حق اور ہدایت پر عمل کرے اس کے لیے سلامتی ہے۔ اس میں وہ شخص شامل نہ ہوگا جو حق کی اتباع نہ کرے۔ غیر مسلموں کو جو خطوط لکھے جائیں ان میں اس طرح کا عمومی انداز اختیار کیا جاسکتا ہے۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف یکتب الی اہل الکتاب۔ گرامی نامہ کے پورے مضمون اور اس سلسلہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بخاری، کتاب بدء الوحی۔ نیز کتاب الجہاد، باب دعاء النبیؐ الناس الی الاسلام والنبوۃ

[2] فتح الباری: ۱۱/ ۴۷۔ نیز ۱/ ۳۸

قتادہ کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے گھر جاؤ تو کہو '**السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ**' (سلامتی ہے ہر اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے)[۱] یہی بات امام ابو یوسف نے کہی ہے۔[۲] '**السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین**' (سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر) جیسے الفاظ بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔[۳]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک شخص کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا۔ بعد میں آپ کو بتایا گیا کہ یہ شخص نصرانی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور فرمایا کہ میرا سلام واپس کردو۔[۴]

امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔[۵] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا بھی ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ غیر مسلم کے علم میں یہ بات آجائے گی کہ سلام کے مخصوص الفاظ غیر مسلموں کے لیے استعمال نہیں کیے جاتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خصوصاً جس شخص کے عمل کو لوگ نمونہ اور دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوں اسے ایسا نہ کرنا چاہیے، تاکہ دوسرے اس سے احتراز کریں۔[۶] حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے عمل کی اس سے توجیہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کو ایک شخص نے، جو صورت شکل سے مسلمان لگ رہا تھا، سلام کیا۔ انھوں نے جواب میں '**و علیک و رحمۃ اللہ و برکاتہ**' کہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص نصرانی ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ اس کے پاس گئے اور کہا کہ اللہ کی رحمت مسلمان کے لیے ہے (لہٰذا یہ الفاظ اسی کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں) پھر اسے دعا

---

۱ عبد الرزاق، المصنّف: ۶/ ۱۲

۲ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۵۵۰

۳ فتح الباری: ۱۱/ ۴۰

۴ بخاری، الادب المفرد: ۲/ ۵۳۹

۵ موطا، کتاب السلام، باب ماجاء فی السلام علی الیہود والنصاریٰ

۶ فتح الباری: ۱۱/ ۴۸

دی۔ 'اطال اللّٰہ حیاتک و اکثر مالک و ولدک' (اللہ تعالیٰ تمھاری عمر دراز کرے اور تمھارے مال و اولاد میں اضافہ فرمائے)[1]

علامہ زمخشری کہتے ہیں:

ولاَ بأس بالدعاء له بما يصلحه في دنياه.[2] اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اسے دنیا کی صلاح اور بہتری کی دعا دی جائے۔

خلاصۂ بحث

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ سلام اسلامی تہذیب کا شعار ہے۔ زیادہ تر علماء سلف اس کے قائل ہیں کہ غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جائے گا اور اس کے سلام کا جواب بھی **و علیک** یا **و علیکم** کی حد تک دیا جائے گا، اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن سلف ہی میں جن اصحاب نے اس سے اختلاف کیا ہے ان کے نزدیک سلام کو عام کرنے کا حکم ہے، اس لیے غیر مسلم کو بھی سلام کیا جاسکتا ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق صحیح نہیں ہے۔ بعض حضرات نے اس مسئلہ میں سماجی و معاشرتی تعلقات کو بھی اہمیت دی ہے۔ بعض نے ذمی اور حربی کا فرق کیا ہے، اس لیے کہ خود قرآن میں یہ فرق موجود ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ غیر مسلموں کے لیے **'السلام علیکم و رحمة اللّٰہ'** کے مسنون الفاظ کی جگہ ان کی ہدایت اور فلاح و کامیابی کی دعا کی جائے۔ ان سب رایوں کی روشنی میں ہمیں ایک ایسے معاشرہ کے بارے میں سوچنا چاہیے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ملاجلا اور مخلوط معاشرہ ہے، جہاں دونوں کے درمیان ثقافتی، سماجی، معاشی، غرض مختلف نوعیت کے تعلقات موجود ہیں اور دونوں قانونی اور دستوری روابط میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے معاشرہ میں غیر مسلموں کو مسنون طریقہ سے سلام کیا

---

[1] بخاری، الادب المفرد: ۲/ ۵۳۸

[2] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۵۵۰

جائے تو یہ مخالفِ سلف عمل نہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے، اس طرح وہ آہستہ آہستہ اسلامی آداب سے مانوس ہوتے چلے جائیں اور ان کی معنویت ان پر زیادہ بہتر طریقہ سے واضح ہوجائے۔ اس میں قباحت محسوس ہوتو ان کے لیے عزت و احترام اور محبت و خیر خواہی کے دوسرے الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں، البتہ اس بات کا ضرور خیال رکھنا ہوگا کہ تعلقات کے اظہار میں ایسے طریقے نہ اختیار کیے جائیں، جو کسی دوسرے مذہب یا تہذیب کے مخصوص شعار کی حیثیت رکھتے ہوں اور ایسے الفاظ نہ استعمال کیے جائیں، جو اسلامی عقائد سے متصادم ہوں۔

ﮨﮩ

۲- مسجد میں غیر مسلم کا داخلہ

مسجد کی تعمیر خدا کی عبادت کے لیے ہوتی ہے۔ اس پہلو سے اس کی حیثیت مقدس مقام کی ہے۔ اس کی پاکی صفائی کا اہتمام ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس مقدس اور پاک جگہ میں کوئی غیر مسلم داخل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

مسجد حرام میں مشرکین کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے

قرآن مجید میں مسجد حرام کے سلسلے میں اہل ایمان کو ہدایت ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ○ (التوبة:۲۸)

اے ایمان والو! بے شک مشرک نجس (ناپاک) ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔ اگر تم تنگ دستی سے ڈرتے ہو تو اللہ تعالیٰ جلد ہی تمھیں اپنے فضل سے غنی کردے گا۔ بے شک اللہ علم اور حکمت والا ہے۔

یہ اعلان سنہ ۹ھ میں ہوا تھا۔ اس کے بعد مشرکین کو مسجد حرام میں حج، عمرہ اور زیارت کے لیے آنے سے منع کر دیا گیا۔

اس آیت کی روشنی میں علماء نے غیر مسلم کے حرم، حدودِ حرم اور عام مساجد میں داخلہ سے بحث کی ہے اور اس کے احکام بیان کیے ہیں۔

کیا حدودِ حرم کا بھی یہی حکم ہے؟

اس مسئلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ آیت میں مشرکین کے مسجد حرام میں داخلہ کی ممانعت ہے۔ حدودِ حرم میں وہ داخل ہوسکتے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ حدودِ حرم میں بھی انھیں داخلہ کی اجازت نہیں ہے[1]

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ مسجد حرام میں ذمی (غیر مسلم) کبھی داخل نہیں ہوسکتا۔ مسجدِ حرام ہی کے حکم میں حدودِ حرم بھی آتے ہیں۔

اس کی دلیل 'وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً' (اگر تم تنگ دستی سے ڈرتے ہو) کے الفاظ ہیں۔ انھیں اس کا اندیشہ نہیں تھا کہ مسجد حرام سے چیزیں نہیں پہنچ پائیں گی، بلکہ یہ خطرہ تھا کہ حدودِ حرم سے نہیں پہنچ سکیں گی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں حدودِ حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی ...	پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔ (الاسراء:۱)

اس آیت میں معراج کا ذکر ہے۔ معراج کا سفر حضرت ام ہانیؓ کے گھر سے شروع ہوا تھا، جو حدودِ حرم میں تھا، لیکن کہا گیا کہ یہ مسجد حرام سے شروع ہوا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حدودِ حرم بھی مسجد حرام ہی کے حکم میں آتے ہیں۔

فرماتے ہیں: اس بنا پر غیر مسلم حدودِ حرم میں داخل ہونا چاہے تو اسلامی ریاست اسے منع کرے گی۔ تاجروں اور سفیروں کو بھی اس کی اجازت نہ ہوگی۔ اگر کسی غیر مسلم کے ساتھ سامانِ تجارت اور غلہ ہے تو وہ حرم سے باہر قیام کرے گا، جو لوگ خریدنا چاہیں گے وہاں پہنچ کر خریدیں گے۔ اسی طرح غیر مسلم سفیر اپنا پیغام مسلمان کے ذریعہ

---

[1] شوکانی، فتح القدیر: ۲/۳۴۶

پہنچائے گا اور ضرورت ہو تو حاکم اس سے حرم سے باہر ملاقات کرے گا۔ وہ جانتے بوجھتے حدود حرم میں داخل ہو تو اس کی تعزیر ہوگی اور ناواقفیت سے داخل ہو تو تنبیہ ہوگی[۱]

امام شافعی بھی حرم اور حدودِ حرم میں غیر مسلم کے داخلہ کو صحیح نہیں سمجھتے۔

عام مساجد میں غیر مسلم داخل ہوسکتا ہے

کیا دوسری مساجد کا بھی یہی حکم ہے یا اس سے مختلف ان کا حکم ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ دوسری مساجد کا بھی یہی حکم ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد میں تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ان کے پاس پہنچے۔ ان کے ہاتھ میں رجسٹر تھا، جس میں اپنے علاقہ کے امور و اعمال کی تفصیل تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس نے یہ رجسٹر لکھا ہے اسے بلاؤ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ وہ نصرانی ہے، مسجد میں نہیں آسکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان یہ بات مشہور تھی اور اس پر اتفاق تھا کہ غیر مسلم مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا۔

دوسری بات یہ کہ جنابت، حیض و نفاس کی حالت میں مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ شرک کی گندگی تو اس سے بڑی ہے۔ لہٰذا مسجد میں مشرک کے قیام کو بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہونا چاہیے[۲]

امام مالکؒ بھی حرم اور حدودِ حرم میں غیر مسلم کے داخلہ کو صحیح نہیں سمجھتے۔ انھوں نے مسجدِ حرام ہی پر دوسری مساجد کو قیاس کیا ہے۔ چناں چہ ان کے نزدیک غیر مسلم کسی بھی مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا، الاّ یہ کہ کوئی مجبوری اسے لاحق ہو۔ جیسے مسجد میں عدالت قائم ہو اور وہاں اسے اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں جانا پڑے[۳]

شوافع میں امام مزنی بھی مسجد میں غیر مسلم کے داخلہ کو جائز نہیں سمجھتے۔

---

۱ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۴۵، ۲۴۶

۲ حوالہ سابق: ۱۳/ ۲۴۶

۳ جصاص احکام القرآن: ۳/ ۱۰۹

فقہ حنبلی میں کہا گیا ہے کہ حرم کے علاوہ دوسری مساجد میں ذمی (غیر مسلم) مسلمانوں کی اجازت سے داخل ہوسکتے ہیں۔ بغیر اجازت داخلہ کا ان کو حق نہیں ہے۔ حضرت علیؓ خطبہ دے رہے تھے کہ مسجد میں ایک مجوسی کو دیکھا۔ منبر سے اترے اور اسے مار کر باہر نکال دیا[1]

امام شافعی فرماتے ہیں کہ مسجد حرام اور حدود حرم میں تو غیر مسلم کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے، البتہ دیگر مساجد میں اس کی اجازت ہے۔ وہ وقت ضرورت ان میں جاسکتا ہے، بلاضرورت اس کا مسجد میں جانا صحیح نہیں ہے۔

احناف کے نزدیک حدودِ حرم میں غیر مسلم صرف ایامِ حج میں نہیں جاسکتا

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قرآن مجید کی اس ممانعت کا تعلق حج سے ہے۔ حج کے دنوں میں غیر مسلم کا خانۂ کعبہ اور مقاماتِ حج میں داخلہ ممنوع ہے۔ دوسرے ایام میں یہ ممانعت ختم ہوجاتی ہے۔ وہ خانہ کعبہ میں اور مقامات حج پر جاسکتا ہے۔ ہاں وہ اسے حجاز کی طرح وطن نہیں بنا سکتا، ضرورت کے تحت آمد و رفت رکھ سکتا ہے۔ دیگر مساجد کے سلسلے میں اس طرح کی پابندی بھی نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں اسے ان میں داخلہ کی اجازت ہے۔[2]

پھر اس آیت کا کیا مفہوم ہے؟ علامہ ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ اس کی دو توجیہیں کی جاسکتی ہیں: ایک یہ کہ اس کا تعلق خاص مشرکین عرب سے ہے، اس لیے کہ اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں ان سے جنگ کا حکم تھا۔ وہ ذمی نہیں بنائے جاسکتے تھے۔ یہ حکم دوسرے مشرکین کا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کا تعلق حج سے ہے۔ آیت کے الفاظ **فلا یقربوا المسجد الحرام** (مسجد حرام کے قریب وہ نہ جائیں) اس پر

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۴۶

[2] مختلف فقہی مسالک کی تفصیل کے لیے حسب ذیل تفسیریں دیکھی جاسکتی ہیں: خازن، **لباب التاویل فی معانی التنزیل مع بغوی معالم التنزیل**: ۳/ ۶۳۔ زمخشری، **الکشاف عن حقائق التنزیل**: ۲/ ۱۸۳۔ شوکانی، فتح القدیر: ۲/ ۴۴۶، ۴۴۷

دلالت کرتے ہیں۔ اس میں خانہ کعبہ کے ساتھ حج سے متعلق مقامات بھی شامل ہیں۔ اس لیے کہ وہ خانہ کعبہ سے قریب ہیں، جیسے عرفات اور مزدلفہ۔ ان مقامات پر ایام حج میں کسی مشرک کو داخلہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ جب آیت میں حرم اور مقاماتِ حج دونوں شامل ہیں تو دونوں کا حکم بھی ایک ہونا چاہیے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ایام حج کے علاوہ دوسرے ایام میں عرفات اور مزدلفہ میں ذمی کا داخلہ ممنوع نہیں ہے تو یہی حکم خانہ کعبہ کا بھی ہوگا۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً (اگرتم فقر و فاقہ سے ڈرتے ہو) کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ آیت کا تعلق موسم حج سے ہے۔ اسی میں تجارتی میلے لگتے تھے اور کاروباری منافع حاصل ہوتے تھے۔ مشرکین کو منع کرنے سے یہ تجارتی فائدہ ختم ہوسکتا تھا، اس لیے فرمایا کہ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ دوسرے طریقہ سے تمھاری مدد کرے گا۔[1]

مشرک کے نجس ہونے کا مفہوم

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیت میں مشرک کو 'نجس' (ناپاک) کہا گیا ہے۔ اگر وہ نجس ہے تو مسجد میں کیسے داخل ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں جسمانی اور مادّی نجاست کا نہیں، عقیدہ کی نجاست کا ذکر ہے۔

علّامہ ابوبکر جصّاص کہتے ہیں:

اطلاق اسم النجس على المشرك من جهة ان الشرك الذى يعتقده يجب اجتنابه كما يجب اجتناب النجاسات والاقذار فلذلك سماهم نجسا[2]	مشرک پر اسم نجس کا اطلاق اس پہلو سے ہے کہ شرک سے جس پر کہ اس کا عقیدہ ہے اسی طرح اجتناب ضروری ہے، جس طرح نجاسات اور گندگیوں سے پرہیز لازمی ہے، اسی لیے انھیں نجس کہا گیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے، جصاص، احکام القرآن: ۳/۱۰۸-۱۱۱

[2] حوالہ سابق: ۳/۱۰۸

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جن کے نزدیک مشرک نجس الذات ہوتا ہے۔ بعض اہلِ ظاہر اور شیعوں میں فرقہ زیدیہ کی یہی رائے ہے۔ حضرت حسن بصری سے اسی طرح کی روایت کی جاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی بھی یہی رائے بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

و ذهب الجمهور من السّلف و الخلف و منهم اهل المذاهب الاربعة الى ان الكافر ليس بنجس الذات لاَنَّ اللّٰه سبحانه احل طعامهم و ثبت عن النبیﷺ فی ذٰلک من فعله و قوله ما يفيد عدم نجاسة ذواتهم فاكل فی آنيتهم و شرب منها و توضأ فيها و انزلهم فی مسجده[1]

جمہور سلف و خلف، جن میں ائمہ اربعہ بھی داخل ہیں، اس طرف گئے ہیں کہ کافر اپنی ذات میں نجس نہیں ہوتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے حلال کیے ہیں اور نبی ﷺ کے قول و عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں نجس نہیں ہیں۔ آپ نے ان کے برتنوں میں کھایا ہے، ان میں پیا ہے، ان سے وضو فرمایا ہے اور انھیں اپنی مسجد میں ٹھہرایا ہے۔

امام نووی نے غیر مسلم کی طہارت و عدم طہارت کے مسئلہ پر شوافع اور جمہور فقہاء کا مسلک کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں ان کے الفاظ پیش کیے جارہے ہیں۔

.... اما الكافر فحكمه فی الطهارة و النجاسة حكم المسلم، هٰذا مذهبنا و مذهب الجماهير من السلف والخلف، و اما قول اللّٰه عزو جل اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فالمراد نجاسة الاعتقاد والاستقذار وليس المراد ان اعضاء هم نجسة

..... کافر کا حکم بھی طہارت اور نجاست میں مسلمان ہی کا حکم ہے۔ یہی ہمارا (شوافع) اور جمہور سلف و خلف کا مسلک ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد 'انما المشرکون نجس' تو اس سے اعتقاد کی نجاست اور گندگی مراد ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے اعضاء جسم پیشاب پاخانہ جیسی چیزوں کی طرح نجس ہیں۔

كنجاسة البول والغائط ونحوهما فاذا ثبت طهارة الأدمي مسلما كان او كافرا فعرقه و لعابه و دمعه طاهرات سواء كان محدثا او جنبا او حائضا او نفساء و هذا كله باجماع المسلمين[1]	جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ آدمی طاہر ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر تو اس کا پسینہ، لعاب اور آنسو بھی پاک ہیں، چاہے وہ بے وضو ہو یا جنابت کی حالت میں، عورت حیض اور نفاس کی حالت میں ہوتو بھی پاک ہے۔ ان سب باتوں پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

غیر مسلم کے مسجد میں داخلہ کا ثبوت

سب سے بڑی بات یہ کہ مسجد میں غیر مسلم کے داخلہ کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے۔

جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے کہ عمیر بن وہب، جو اس وقت مشرک تھے، رسول اللہ ﷺ کے قتل کے ارادہ سے مدینہ پہنچے۔ مسجد نبوی کے سامنے اترے۔ آپؐ سے ملاقات ہوئی تو دریافت فرمایا کہ کس لیے آئے ہو؟ کہا! میرا لڑکا جنگ بدر میں آپ کے ہاں قید ہے، اس کی رہائی کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا: صحیح کہو، تم تو میرے قتل کے ارادہ سے آئے ہو۔ صفوان بن امیہ سے حرم میں تمھاری بات چیت ہوچکی ہے۔ اس نے تمھارا قرض ادا کرنے اور تمھارے بال بچوں کے کفالت کی ذمہ داری لی ہے۔ یہ سن کر وہ ششدر رہ گئے اور بے اختیار کہا کہ بے شک آپ خدا کے رسول ہیں۔ ہم آپ کے اس دعویٰ کی وجہ سے آپ کی مخالفت کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ میرے اور صفوان کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کا علم ہم دونوں کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ جس خدا نے آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی یقیناً وہی آپ کے پاس اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ کرام کو

---

[1] نووی، شرح مسلم، ج ۲، جزء ۴، ص ٦٦

ہدایت فرمائی کہ انھیں دین کی تعلیم دی جائے اور ان کے قیدی کو رہا کر دیا جائے[۱]

اس واقعہ کا حوالہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے ان الفاظ میں دیا ہے:

و قدم عمیر بن وهب فدخل المسجد والنبیؐ فیه لیفتک به فرزقه اللّٰه الاُسلام[۲]

عمیر بن وہب مکہ سے مدینہ پہنچے۔ اس وقت نبی ﷺ مسجد میں تھے۔ وہ مسجد میں داخل ہوئے، تاکہ آپ کو قتل کردیں، لیکن اللہ نے انھیں اسلام کی دولت سے نوازا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوسفیان تجدیدِ معاہدہ کے ارادہ سے مدینہ پہنچے۔ لیکن قریش کی بدعہدی کی وجہ سے تجدید سے انکار کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ کے مشورہ سے وہ مسجد نبوی میں پہنچے اور اعلان کیا کہ وہ لوگوں کو جنگ سے دور رکھیں گے اور پھر روانہ ہو گئے[۳]

علامہ ابن قدامہ حضرت سعید بن مسیّبؒ کے حوالے سے کہتے ہیں:

قد کان ابو سفیان یدخل مسجد المدینة وهو علٰی شرکه[۴]

حضرت ابوسفیانؓ اپنی شرک کی حالت میں مسجد نبوی میں جایا کرتے تھے۔

حضرت ثمامہ بن اثال جنگ میں گرفتار ہوئے تو انھیں مسجد نبوی میں ایک ستون سے باندھ کر رکھا گیا (تاکہ فرار نہ ہوں) رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو حکم دیا کہ رسی کھول دی جائے اور انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ آپ کے حسن سلوک کا یہ اثر ہوا کہ دو تین روز بعد وہ اسلام لے آئے[۵]

---

۱ واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے: ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲/ ۳۰۸، ۳۰۹۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمیر بن وہبؓ نے مکہ جانے کی اجازت چاہی، تاکہ وہاں دعوت کا کام کرسکیں۔ انھیں اس کی اجازت دی گئی۔ وہ مکہ گئے اور مخالفتوں کا سخت مقابلہ کیا۔ ان کے ذریعے بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔

۲ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۴۶ ۳ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۴/ ۱۳، ۱۴۔ قریش کی بدعہدی کا ذکر آگے آرہا ہے، جس کی وجہ سے ان کے خلاف جنگ ہوئی اور مکہ فتح ہوا۔

۴ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۴۶ ۵ اس واقعہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری، کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفہ و حدیث ثمامۃ بن اثال۔

اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ غیر مسلم فرد ہی کو نہیں، پورے غیر مسلم وفد کو مسجد میں ٹھہرایا گیا ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے: حضرت عثمان بن ابو العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ قبیلۂ ثقیف کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے مسجد میں ٹھہرایا تا کہ (مسلمانوں کے طریقۂ عبادت، ان کی اجتماعیت اور سیرت و اخلاق کو دیکھ کر) اس کے دل نرم پڑیں۔ چناں چہ وفد کے لوگ اسلام لے آئے۔ آپ نے ان کے ساتھ شروع میں بعض احکامِ شریعت کی رعایت بھی کی، لیکن نماز کی پابندی کا حکم دیا۔[1]

ابوداؤد کی مراسیل میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ثقیف کے وفد کے لیے مسجد میں خیمہ لگوایا، تاکہ وہ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھیں۔ آپ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول اللہ ﷺ! آپ انھیں مسجد میں ٹھہرا رہے ہیں، جب کہ وہ مشرک ہیں (اور مشرک نجس ہوتا ہے) آپ نے فرمایا: زمین نجس نہیں ہوتی، نجس تو ابن آدم ہوتا ہے۔[2]

حضرت عثمان بن ابو العاص کی روایت کے ذیل میں علامہ خطابی لکھتے ہیں:

و فی ھٰذا الحدیث من العلم ان الکافر یجوز له دخول المسجد لحاجة له فیه او للمسلم الیه[3]	اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ کافر کو اگر مسجد میں کوئی حاجت ہو یا مسلمان کی اس سے کوئی حاجت ہو تو وہ اس میں داخل ہوسکتا ہے۔

مسجد میں عدالت اور اس میں غیر مسلم کی حاضری

ایک مسئلہ ہمارے فقہاء کے ہاں یہ زیر بحث رہا ہے کہ فصل مقدمات کے لیے عدالت مسجد میں قائم ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوتو اس میں غیرمسلم کی شرکت کا کیا حکم ہے؟

امام شافعی فرماتے ہیں کہ عدالت میں مسلم اور غیر مسلم، پاک اور ناپاک سب ہی طرح کے لوگ پہنچتے ہیں، اس لیے مسجد میں عدالت نہیں ہونی چاہیے۔ مسجد اصلاً

---

[1] ابوداؤد، کتاب الخراج، باب ماجاء فی خبر الطائف

[2] زیلعی، نصب الرایۃ: ۲۷۰/۴

[3] خطابی، معالم السنن: ۳۵/۳

عبادت کے لیے ہے۔ یہ اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔

احناف کے نزدیک عدالت کے لیے قاضی کو مسجد میں، بہتر ہے جامع مسجد میں، یا کسی ایسی جگہ بیٹھنا چاہیے جہاں آسانی سے لوگ مقدمات لے کر پہنچ سکیں اور انھیں اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ یہی امام احمد کی رائے ہے۔ امام مالک کے متعلق صحیح یہی ہے کہ وہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

احناف کی دلیل یہ ہے کہ قضاء یعنی شریعت کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرنا خود عبادت ہے، اس لیے مسجد میں عدالت قائم ہوسکتی ہے۔ پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین مسجد میں مقدمات کی سماعت فرماتے اور فیصلے کرتے تھے۔ رہا مساجد میں قائم ان عدالتوں میں مشرک کا پہنچنا، یہ ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ:

نجاسة المشرک فی اعتقاده لاَ فی ظاهره[۱] — مشرک کی نجاست اس کے عقیدہ میں ہے نہ کہ اس کے ظاہر میں۔

اس مسئلہ میں فقہاء کے خیالات اوپر کسی قدر تفصیل سے پیش کردیے گئے ہیں۔ زیادہ تر فقہاء حرم میں اور ان میں سے بعض حدود حرم میں غیر مسلم کے داخلہ کو ناجائز تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک چوں کہ اس کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے ان کے خیالات میں شدت بھی ہے۔ احناف بعض شرائط کے ساتھ اس میں قباحت نہیں سمجھتے۔ دوسری مساجد میں غیر مسلم کے داخلہ کو جمہورِ امت نے جائز قرار دیا ہے۔ وہ کفر وشرک کو تو ناپاک کہتے ہیں، لیکن کافر ومشرک کو ناپاک یا نجس نہیں ٹھہراتے کہ اس کے مسجد میں داخل ہونے سے وہ ناپاک ہوجائے گی۔ اس سے یہ خیال کتنا بے بنیاد اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ تعصب، نفرت، حقارت اور عدم رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ جب اس نے مسجد کے سلسلے میں، جو مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے، یہ وسعت اور گنجائش رکھی ہے تو مسجد سے باہر اس کے رویہ کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ہدایہ مع فتح القدیر: ۵/ ۴۶۵، ۴۶۶

۳- غیر مسلم سے تحائف کا تبادلہ

تحفے تحائف کا تبادلہ سماج اور معاشرتی زندگی کا ایک خوش گوار تقاضا ہے۔ اس سے تعلقات کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ بعض اوقات اس سے سیاسی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا شاہانِ عجم سے تحائف کا تبادلہ

احادیث میں غیر مسلموں کو تحفے دینے اور ان کے تحفے قبول کرنے کا ثبوت موجود ہے۔ رسولِ خدا ﷺ کو غیر مسلم سلاطین اور سربراہانِ مملکت نے تحفے پیش کیے اور آپ نے قبول فرمائے۔ بعض اوقات آپ نے خود بھی انھیں تحفے عنایت کیے[۱]

یہاں اس سلسلے کے بعض واقعات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

ان کسریٰ اھدیٰ لہ فقبل و ان الملوک اھدوا الیہ فقبل منھم[۲]

کسریٰ (شاہ ایران) نے آپ کو ہدیہ پیش کیا، آپ نے قبول کیا، (اسی طرح) بادشاہوں نے آپ کو ہدیے دیے، آپ نے قبول فرمائے۔

---

[۱] مسلمانوں کو آپس میں تحفے دینے اور قبول کرنے کی احادیث میں بڑی ترغیب ہے اور خود رسول اکرمؐ نے اس پر عمل فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ 'تحائف کی سیاسی و سماجی اہمیت' مطبوعہ سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی۔ جنوری تا مارچ ۱۹۹۶ء

[۲] ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی قبول ہدایا المشرکین۔

حضرت علیؓ ہی کی ایک اور روایت میں کسریٰ کے ساتھ قیصر کا بھی ذکر ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

اهدیٰ کسری لرسول اللهﷺ فقبل منه و اهدیٰ له قیصر فقبل منه و اهدت له الملوک فقبل منهم[1]

کسریٰ نے رسول اللہﷺ کو ہدیہ دیا۔ آپ نے قبول کیا، قیصر نے ہدیہ دیا، آپ نے قبول کیا اور (دوسرے) بادشاہوں نے آپ کو ہدیے، دیے آپ نے قبول فرمائے۔

غزوۂ تبوک سنہ ۹ھ میں ہوا تھا۔ حضرت ابوحمید ساعدیؓ اس کے واقعات کے ذیل میں بیان کرتے ہیں کہ اَیلہ کے بادشاہ[2] نے رسول اللہﷺ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک سفید خچر پیش کیا اور ایک چادر پہنائی (اس نے آپ سے صالحت کی اور جزیہ ادا کیا) آپ نے اس کے علاقہ پر اس کا قبضہ باقی رکھا۔[3]

---

[1] مسند احمد: ۲/۱۰۷، حدیث نمبر ۷۴۷۔ تحقیق احمد محمد شاکر۔ ترمذی اور مسند دونوں ہی کی روایتوں میں ایک راوی ثویر بن فاختہ ہے۔ اسے محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ لیکن آگے کی روایات اور واقعات سے غیر مسلموں سے ہدایا کے قبول کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

[2] ایلہ کے بارے میں حافظ ابن حجر کہتے ہیں: **ایلة بلدة قدیمة بساحل البحر** فتح الباری: ۳/۲۳۱ (ایلہ ساحل سمندر پر ایک قدیم شہر ہے) عینی لکھتے ہیں: **بلدة معروفة بساحل البحر فی طریق المصریین الیٰ مکة وهی الاٰن خراب**۔ عینی: ۱۱/۷۵ (وہ ایک معروف شہر تھا، جو مصریوں کے مکہ جانے کے راستہ میں پڑتا تھا۔ اب وہ ویران ہو چکا ہے) امام نووی نے کچھ زیادہ تفصیل فراہم کی ہے۔ فرماتے ہیں: ایلہ شام کے کنارے ساحل سمندر پر ایک مشہور شہر ہے، جو مدینہ منورہ، دمشق اور مصر کے درمیان واقع ہے۔ مدینہ سے اس کا فاصلہ پانچ مراحل، دمشق سے بارہ مراحل اور مصر سے آٹھ مراحل کا ہے۔ ابو عبید نے اسے شام کا ایک شہر کہا ہے۔ حازمی اسے ایک ساحلی شہر کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ حجاز کا آخری اور شام کا ابتدائی حصہ ہے۔ نووی، تہذیب الاسماء واللغات: ۱/۱۹۔ ایلہ کے بادشاہ کا نام یحنہ بن رؤبہ تھا۔ یہ اس صلح نامہ سے بھی واضح ہے جو رسول اللہﷺ نے اسے عطا کیا تھا۔ (ابن ہشام: ۴/۱۷۹۔ نیز ملاحظہ ہو فتح الباری: ۳/۳۴۵)

[3] بخاری کے الفاظ ہیں **واهدیٰ ملک ایلة للنبیﷺ بغلة بیضاء و کساه بردا و کتب له ببحرهم** (کتاب الزکوٰۃ، باب خرص التمر۔ مسلم: کتاب الفضائل، باب معجزات النبیؐ) مسلم کی ایک روایت میں ملک ایلہ کی جگہ فروہ بن نفاثہ الجذامی آیا ہے۔ (کتاب الجہاد، باب غزوۃ حنین) [باقی حاشیہ آگے]

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ اکیدر دومہ[۱] نے رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی کرتا

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لیکن فروہ بن نفاثہ کا واقعہ دوسرا ہے۔اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ علماء نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے استعمال میں ایک سفید خچر کے علاوہ اور کوئی خچر نہ تھا۔ اسے دلدل کہا جاتا ہے۔ شرح مسلم، ج ۴، جزء ۱۲، ص ۱۱۳۔ امام نووی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے کافر کا ہدیہ قبول کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ حدیث کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خچر، جو دلدل کے نام سے معروف تھا، غزوۂ تبوک میں پیش کیا گیا۔ غزوۂ تبوک ۹ھ میں ہوا تھا، جب کہ یہ خچر، آپ کے استعمال میں اس سے قبل بھی رہا۔ چناں چہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ غزوۂ حنین میں آپ نے اس کی سواری کی تھی۔ غزوۂ حنین ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد ہوا تھا۔ اسے اس بات پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ ملک ایلہ نے یہ خچر پہلے ہی ہدیہ کیا تھا، لیکن راوی نے اس کا ذکر تبوک میں اس کی آمد کے ساتھ کیا ہے۔ اس میں کوئی زمانی ترتیب نہیں ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ آپ کی سواریوں میں دلدل کے علاوہ کسی اور خچر کا روایات میں ذکر نہیں ہے۔ نووی، شرح مسلم، ج ۵، جزء ۱۵، ص ۴۲، ۴۳۔ علامہ ابن کثیر نے بھی آپ کی سواریوں میں اسی ایک خچر کا ذکر کیا ہے، السیرۃ النبویۃ: ۴ / ۱۴ا۷۔ لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اور خچر بھی استعمال کیے ہیں۔ مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ کسریٰ نے آپ کو ایک خچر ہدیہ کیا تھا۔ اس کے لیے بال سے بٹی ہوئی رسی آپ نے استعمال کی۔ آپ سوار ہوئے اور مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ یہ دلدل کے علاوہ ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ نجاشی اور دومۃ الجندل کے بادشاہ نے بھی آپ کو ایک ایک خچر پیش کیے۔ دلدل اس خچر کا نام ہے جو مقوقس نے دیا تھا۔ سہیلی نے کہا ہے کہ جنگ حنین میں آپ جس خچر پر سوار تھے اسے فضّہ یا شہباء کہا جاتا تھا۔ اسے فروہ جذامی نے پیش کیا تھا۔ فتح الباری: ۳ / ۳۴۵، ۳۴۶۔ علامہ ابن قیمؒ نے آپ کی سواریوں میں چار خچروں کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ ایک خچر نجاشی نے بھی ہدیہ کیا تھا۔ زاد المعاد: ۱ / ۱۳۴

[۱] اکیدر بن عبد الملک الکندی: یہ دومہ کا بادشاہ تھا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا تھا۔ لیکن علامہ ابن اثیر نے اس کی تردید کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اصحاب سیرت کے ہاں اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ بھیجا، آپ سے صلح کی، لیکن اسلام نہیں لایا۔ وہ نصرانی تھا۔ رسول اللہ ﷺ سے مصالحت کے بعد وہ واپس ہوا اور اپنے قلعہ میں رہا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت خالدؓ نے دومہ کا محاصرہ کیا، اس سے جنگ ہوئی اور وہ مارا گیا۔ بلاذری کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اسلام لے آیا، لیکن بعد میں مرتد ہوگیا اور جو (زکوٰۃ) دیا کرتا تھا اس کے دینے سے انکار کر دیا۔ اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے تو بہرحال (باقی اگلے صفحہ پر)

بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے تو آپ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، جنت میں سعد بن معاذؓ کے رومال اس سے عمدہ ہیں[1]

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اکیدر دومہ نے نبی ﷺ کو ایک ریشمی جوڑا تحفہ میں بھیجا۔ یہ آپ نے مجھے عطا فرمایا۔ میں نے اسے گھر کی خواتین میں تقسیم کر دیا[2]

ابن ابی شیبہ، احمد اور بزار نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ اکیدر نے رسول اللہ ﷺ کو 'منّ' (شہد کی قسم کی ایک چیز جو شبنم کے جمع ہونے سے بنتی ہے) کا ایک گھڑا تحفہ میں بھیجا۔ آپ نے قبول فرمایا اور صحابہ کے درمیان تقسیم کیا[3]

رسولِ اکرم ﷺ نے ۶ھ میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کو اسکندریہ (مصر) کے حاکم مقوقس کے پاس اسلام کے پیغام کے ساتھ بھیجا۔ اس نے حضرت حاطب کو

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ایک مرتد کا شمار صحابہ میں نہیں ہوگا (اسد الغابۃ: ۱/۱۳۵) ابن ہشام کی روایت ہے کہ حضرت خالدؓ اسے گرفتار کر کے لائے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اسے معاف فرمایا، جزیہ کی بنیاد پر صلح کی اور رہا کر دیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھی جائے سیرۃ ابن ہشام: ۴/۱۸۱) ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو ایک ریشمی قبا، جس پر سونے کا کام تھا، ہدیتاً پیش کی۔ آپ نے اسے لوٹا دیا۔ لیکن پھر آپ نے مناسب نہیں سمجھا تو کہا کہ اسے حضرت عمرؓ کے حوالہ کردو۔ فتح الباری: ۵/۳۳۱

دَوْمَہ شہر، جسے دومۃ الجندل بھی کہا جاتا ہے، یہ حجاز اور شام کے درمیان تبوک کے قریب واقع ہے۔ مدینہ سے اس کا فاصلہ تیرہ اور دمشق سے دس مراحل کا ہے۔ کوفہ سے بھی تقریباً دس مراحل کی دوری ہے۔ یہاں کھجور کے باغات تھے اور کھیتی ہوتی تھی، چشمے کم تھے، اونٹنیوں کے ذریعے آب پاشی ہوتی تھی، زیادہ پیداوار گیہوں کی تھی، یہاں ایک قلعہ بھی تھا (نووی، شرح مسلم، جلد۵، جزء ۱۴، ص۵۰۔ ابن حجر، فتح الباری: ۵/۲۳۱

[1] بخاری، کتاب الھبۃ، باب قبول الھدیۃ من المشرکین۔

[2] مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم الذھب والحریر علی الرجال و اباحتہ للنساء

[3] عینی، عمدۃ القاری: ۱۱/۲۳

دربار میں بلایا اور آپ کی رسالت کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت حاطب کے جواب سے خوش ہوکر کہا کہ تم ایک دانا آدمی ہو اور ایک دانا شخص کے پاس سے آئے ہو۔ اس نے حضرت حاطبؓ کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو کچھ ہدایا بھیجے۔ ان میں دو باندیاں بھی تھیں[1] حضرت حاطبؓ سنہ ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو حضرت ماریہؓ کو آپ نے اپنی ملکیت میں لے لیا۔ان سے ذی الحجہ ۸ھ میں آپ کے صاحب زادے ابراہیمؓ پیدا ہوئے۔ آپ نے ساتویں دن ان کا عقیقہ کیا۔ سر کے بال اتروائے اور اس کے وزن کی چاندی کا صدقہ کیا۔ اٹھارہ ماہ بعد حضرت ابراہیمؓ کا انتقال ہوگیا۔[2]

حضرت ماریہؓ کی وفات عہد فاروقی میں سنہ ۱۶ھ میں ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کے انتقال کا اعلان فرمایا اور خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور بقیع میں تدفین عمل میں آئی۔[3]

مقوقس نے ان کے علاوہ جو ہدیے بھجوائے وہ یہ تھے:

ایک ہزار مثقال سونا، بیس عدد ملائم کپڑے، ایک خچر جس کا نام دلدل تھا۔[4]

۱؎ سیرت نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ دوسری باندی حضرت ماریہ کی بہن سیرین تھیں۔ یہ حضرت حسان بن ثابت کو عطا کی گئیں۔ ان کے لڑکے عبد الرحمٰن ان ہی سے تھے۔ (طبری: ۳/۲۱، ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۴/۴۱۰-۴۱۳) ابن اثیر نے ایک اور باندی کا بھی ذکر کیا ہے جو آپ نے ابوجہم بن حذیفہؓ کو عنایت کی۔ (اسد الغابۃ: ۲۱/۴۳۲، ۴۳۳) واقدی اور ابونعیم کے بقول مقوقس نے چار باندیاں بھجوائی تھیں۔ (اسد الغابۃ: ۷/۲۶۱۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴/۶۰۰)

۲؎ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۱/۴۹

۳؎ ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۴/۴۱۰-۴۱۳

۴؎ دلدل کے بارے میں ابن اثیر نے لکھا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اسے سواری کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پھر یہ حضرت حسنؓ اور ان کے بعد امام حسینؓ اور ان دونوں کے بعد محمد بن الحنفیہ کے استعمال میں رہا۔ اسد الغابۃ ۱/۷۳۔ اس طرح وہ طویل عرصہ تک زندہ رہا۔ محمد بن الحنفیہ اسے گیہوں پیس کر کھلایا کرتے تھے۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴/۶۰۔ طبری نے عفیر کا ذکر کیا ہے۔ دلدل کے بارے میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ حضرت معاویہ کے زمانہ تک تھا۔ طبری، تاریخ الرسل والملوک: ۳/۱۷۴

ایک گدھا جسے عفیر یا یعفور کہا جاتا تھا اور مابور نامی ایک غلام کو، جو حضرت ماریہ کا چچا زاد بھائی تھا، مقوقس نے دونوں باندیوں کے ساتھ بھیجا تھا، تاکہ وہ انھیں حفاظت کے ساتھ پہنچائے۔[1]

بزار کی ایک روایت میں ہے کہ مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کو شیشہ کا پیالہ 'قدح قواریر' نذر کیا تھا۔ اسے آپ پینے کے لیے استعمال فرماتے تھے۔[2]

طبرانی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کو لکڑی کی شامی سرمہ دانی، آئینہ اور کنگھی تحفہ میں دی تھی۔[3]

یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ ساری چیزیں حضرت حاطب ہی کے ذریعہ پہنچیں یا کوئی اور ذریعہ بھی تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے اخراجات کا نظم حضرت بلالؓ کیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں: وقت ضرورت میں اس کے لیے قرض لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مشرک نے پیش کش کی کہ تم مجھ سے قرض لے لیا کرو، میں بہ آسانی دے سکتا ہوں۔ چناں چہ میں نے اس سے قرض لے لیا۔ ایک دن اس نے مجھے دیکھا تو کہا کہ وعدہ پورا ہونے میں صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ اگر وقت پر تم نے قرض ادا نہ کیا تو پھر بکریاں چرانے میں لگا دوں گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: جاؤ فلاں قبائل سے جو مسلمان ہوگئے ہیں، قرض لے کر اسے ادا کردو۔ میں صبح سویرے اس مقصد سے نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ تمھیں طلب کر رہے ہیں۔ میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: خوش ہوجاؤ۔ یہ چار اونٹنیاں، جو تم دیکھ رہے ہو اور جو غلہ

---

[1] مابور مدینہ پہنچ کر اسلام لے آیا۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۴/۴۰۴، ۴۰۵۔ اس کے کردار کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار ہوا، جو غلط ثابت ہوا۔ طبری، تاریخ الرسل والملوک: ۳/۱۷۲۔ ابن عبد البر، الاستیعاب: ۴/۴۱۰-۴۱۳

[2] عینی، عمدۃ القاری: ۱۱/۴۷

[3] حوالہ سابق

اور کپڑے سے لدی ہوئی ہیں، فدک کے حکم راں نے مجھے بطور ہدیہ بھجوائی ہیں[1] اس سے تم پر جو قرض ہے، اسے ادا کر سکتے ہو۔ چناں چہ میں نے اس سے آپ کا قرض ادا کیا۔ جو مال بچ گیا، فرمایا کہ اسے مستحقین میں تقسیم کردو، اسی سے مجھے راحت ملے گی۔ لیکن رات ہوگئی، یہ تقسیم نہ ہوسکا تو آپ نے مسجد ہی میں قیام فرمایا۔ اس کے تقسیم ہونے کے بعد آپ مکان میں تشریف لے گئے[2]

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ملک ذی یزن[3] نے رسول اللہ ﷺ کو ایک حلّہ

---

[1] فدک ایک یہودی بستی تھی۔ اس میں نخلستان اور پانی کا چشمہ تھا۔ مدینہ سے تین مراحل کی دوری پر تھا (یہاں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ فدک کی فتح سے پہلے کا ہے) خیبر کی فتح کے بعد اہل فدک نے رسول اللہ ﷺ سے اس شرط پر صلح کرلی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس طرح یہ بغیر جنگ کے فتح ہوگیا۔ یہ مال فے کے حصہ کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے پاس رہا۔ اس سے آپ اپنے اہل و عیال کی ضروریات پوری کرتے اور سماجی کاموں میں صرف فرماتے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے آپ کی وراثت کا مطالبہ کیا تو انھوں نے آپؐ کا یہ ارشاد یاد دلایا: لاَ نورث ما ترکنا صدقة (ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوگا)، البتہ رسول اللہ ﷺ جن افراد کا خرچ برداشت کرتے تھے ان پر بیت المال سے خرچ ہوتا رہے گا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بھی حضرت عباسؓ نے یہ مسئلہ چھیڑا۔ حضرت عمرؓ نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا۔ حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے اس کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو۔ بخاری، کتاب فرض الخمس، باب فرض الخمس۔ کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر۔ مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب حکم النبی۔ ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی صفایا رسول اللہ ﷺ من الاموال۔ اس کی مزید تفصیلات اور شیعہ حضرات کے نقطۂ نظر اور اس کی کم زوری کے لیے دیکھی جائے فتح الباری: ۶/۱۹۸-۲۰۹۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴/۵۶۶-۵۷۸

[2] ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی الامام یقبل هدایا المشرکین۔

[3] قاموس میں ہے کہ یزن (یمن میں) ایک وادی کا نام ہے۔ ذو یزن قبیلۂ حمیر کا ایک بادشاہ تھا۔ اس نے اس وادی کو گھیر کر قبضہ کیا تھا، اس لیے اسے ذو یزن کہا جاتا ہے۔ (مادہ ی، ز، ن) ابن منظور کہتے ہیں کہ ذو یزن قبیلۂ حمیر کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کی طرف منسوب نیزے رماح یزنیہ کہے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ابن کلبی کے بقول اسی نے سب سے پہلے یہ نیزے تیار کیے تھے۔ (لسان العرب، مادہ ی،ز،ن)۔

(جوڑا) کی سوغات بھیجی جو اس نے تیس اونٹ کے بدلہ خریدا تھا۔ آپ نے یہ جوڑا قبول فرمایا[۱]

اسحاق بن عبد اللہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیس سے زیادہ اونٹوں کے عوض ایک جوڑا خریدا اور ذی یزن کو تحفہ میں بھیجا[۲]

حضرت دحیہ کلبیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو صوف کا کرتا اور موزے تحفہ میں دیے۔ آپ نے وہ استعمال فرمائے، یہاں تک کہ وہ پھٹ گئے۔ آپ نے یہ نہیں دریافت فرمایا کہ موزے ذبیحہ جانور کے تھے یا نہیں[۳]

رسولِ اکرم ﷺ کے پاس جو تلواریں تھیں ان میں ایک کا نام ذو الفقار تھا[۴] طبرانی میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حجاج بن علاط نے یہ آپ کو ہدیہ میں پیش کی تھی[۵]

حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ شاہِ روم نے رسول اللہ ﷺ کو سونٹھ کا گھڑا ہدیہ میں بھیجا۔ اسے آپ نے صحابہ کے درمیان تقسیم فرمایا[۶]

۱؎ ابوداؤد، کتاب اللباس، باب لبس المرتفع۔ اس کے راوی عمارہ بن زاذان پر کئی ایک محدثین نے جرح کی ہے۔ مولانا شمس الحق، عون المعبود: ۴/ ۷۹

۲؎ ابوداؤد، کتاب اللباس، باب لبس المرتفع۔ یہ روایت مرسل ہے۔ اس کا ایک راوی علی بن زید بن جدعان نا قابل احتجاج ہے۔ عون المعبود: ۴/ ۷۹

۳؎ حضرت دحیہ کلبیؓ مشہور صحابی ہیں۔ روایت میں آتا ہے کہ جبرئیلؑ بعض اوقات ان کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ نے انھیں سنہ ۶ھ میں قیصر کے پاس سفیر کی حیثیت سے روانہ فرمایا (اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ: ۲/ ۱۵۸) جس واقعہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، وہ، جیسا کہ علامہ عینی نے کہا ہے، ان کے اسلام لانے سے قبل کا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱۱/ ۷۴)

۴؎ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۱/ ۳۷

۵؎ ابن عدی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے: عینی، عمدۃ القاری: ۱۱/ ۷۴۔ ابن سعد اور طبری کا بیان ہے کہ یہ تلوار منبہ بن الحجاج کی تھی۔ جنگ بدر میں یہ آپ کو مالِ غنیمت میں ملی۔ طبری، تاریخ الرسل والملوک، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم: ۳/ ۱۷۷۔ علامہ ابن قیم کے بیان سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ زاد المعاد: ۱/ ۱۳۰ ۶؎ عینی، عمدۃ القاری: ۱۱/ ۷۴

نجاشی کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو ایک خچر ہدیہ میں دیا تھا، جسے آپ سواری کے لیے استعمال فرماتے تھے۔[1]

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کو عطر مجموعہ (غالیہ) کی شیشی بہ طور سوغات بھیجی تھی۔ اس طرح کا عطر پہلی مرتبہ آپ کو اس کے ذریعے ملا۔[2]

یہودی عورت کی دعوت قبول کی

اوپر جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق ملوک وسلاطین سے ہے۔ اس کا بھی ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی غیر مسلم خاتون کا ہدیہ قبول فرمایا جس کا تعلق دشمن قوم سے تھا اور جس نے خود بھی انتہائی مذموم اور ناپاک ارادہ سے یہ ہدیہ پیش کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ خیبر کے بعد جب حالات پرسکون ہوگئے تو مشہور یہودی سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت الحارث نے لوگوں سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو بکری کے گوشت کا کون سا حصہ پسند ہے؟ اسے بتایا گیا کہ آپ بازو پسند کرتے ہیں۔ اس نے گوشت بھونا اور اس میں زہر ملا دیا اور بازو والے حصہ کو زیادہ زہر آلود کر دیا اور آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے جیسے ہی بھنا ہوا بازو چکھا فوراً تھوک دیا، اسے نوش نہیں فرمایا اور صحابہ کرام سے کہا کہ یہ ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے، لہٰذا اسے مت کھاؤ۔ آپ کے ایک ساتھی بشر بن براء بن معرورؓ نے جو لقمہ لیا تھا اسے وہ کھا گئے۔ چناں چہ اسی سے ان کی موت واقع ہوگئی۔ آپ نے یہود کو جمع کرکے اس حرکت کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے اس کا اعتراف کیا۔ اس یہودی عورت سے اس حرکت کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ نے

---

[1] ابن قیم، زاد المعاد: ۱/ ۱۳۴

[2] علامہ عینی کہتے ہیں کہ نجاشی اسلام لاچکا تھا۔ اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ واقعہ اس کے اسلام لانے سے قبل کا ہے یا بعد کا۔ ایک اور امکان بھی ہے، وہ یہ کہ شاہانِ حبش کا لقب نجاشی ہوا کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس سے وہ نجاشی مراد ہو جو اسلام کی دولت سے بہرہ یاب نہیں ہوا۔ عمدۃ القاری: ۱۱/ ۷۳

میری قوم پر فتح و کامرانی حاصل کی ہے اور اسے مغلوب کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر آپ محض بادشاہ ہوں گے تو اس سے مجھے قلبی راحت ملے گی، لیکن اگر پیغمبر ہوں گے تو اس کی آپ کو خبر ہوجائے گی۔ ویسے اس زہر کا اثر آپ پر رہا۔ مرض الموت میں آپ نے اس کا ذکر فرمایا۔ اس کے باوجود ابن ہشام کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔[1]

ایک حدیث کا صحیح مفہوم

ان واقعات کے برخلاف دو ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم کا تحفہ یا ہدیہ قبول کرنے سے انکار فرمایا ہے۔

حضرت عیاض بن حمارؓ کہتے ہیں کہ میں نے قبولِ اسلام سے قبل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک اونٹ بطور ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: **انی نهیت عن زبد المشركين** (مجھے مشرکین کے عطیات قبول کرنے سے منع کر دیا گیا ہے)۔[2]

حضرت عامر بن مالک، جنھیں ملاعب الاَسِنّہ کہا جاتا ہے، کی روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا: میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔[3]

اس حدیث میں سند کے لحاظ سے کچھ سقم ہے، لیکن حضرت عیاض بن حمار کی

---

[1] بخاری، **کتاب الجزیة والموادعة، باب اذا غدر المشركون بالمسلمين هل يعفٰى عنهم؟** ابن ہشام، سیرت النبی: ۳/۳۸۹، ۳۹۰ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بشر بن براء بن معرور کے انتقال کے بعد ان کے رشتہ داروں نے قصاص میں اسے قتل کر دیا۔ فتح الباری: ۷/۴۷۹

[2] ابوداؤد، کتاب الخراج، باب **فی الامام يقبل هدايا المشركين**۔ ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی قبول ہدایا المشرکین۔

[3] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اخرجہ موسیٰ بن عقبۃ فی المغازی ..... رجالہ ثقات الا انہ مرسل وقد وصلہ بعضھم عن الزہری ولا یصح۔ فتح الباری: ۵/۲۳۰

روایت سندِ صحیح سے ثابت ہے۔ اوپر کے واقعات اور اس حدیث میں جو تضاد سا محسوس ہوتا ہے اسے کئی ایک پہلوؤں سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ جن احادیث سے غیر مسلموں سے تحفہ قبول کرنے کا ثبوت ملتا ہے، انھیں وہ حدیث منسوخ کرتی ہے، جس سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو احادیث جواز کا ثبوت فراہم کرتی ہیں وہ ناسخ ہیں اور جن سے عدم جواز کا اظہار ہو رہا ہے وہ منسوخ ہیں۔

دونوں باتیں مجرد دعویٰ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کسی حکم کو ناسخ ماننے کے لیے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ منسوخ حکم کے بعد دیا گیا ہے اور یہاں یہ ثابت نہیں ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ غیر مسلم کا ہدیہ قبول کرنے کی رسول اللہ ﷺ کو اجازت تھی، کسی دوسرے کو اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن اس تخصیص کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ جب تک کسی معاملہ میں تخصیص ثابت نہ ہو آپ کا اسوہ سب کے لیے ہے۔

امام خطابی کہتے ہیں کہ حدیث میں مشرکین کے ہدایا قبول کرنے کی ممانعت ہے اور یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے نجاشی کا ہدیہ قبول فرمایا۔ ان دونوں میں تضاد نہیں ہے۔ اس لیے کہ نجاشی نصرانی تھا۔ شریعت نے بعض احکام میں اہل کتاب اور مشرکین کے درمیان فرق کیا ہے۔ یہ ان ہی میں سے ہے[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کے ہدایا تو قبول کیے جاسکتے ہیں، لیکن مشرکین کے ہدایا قبول کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اوپر کے واقعات صاف بتاتے ہیں کہ آپ نے مشرکین کے ہدایا بھی قبول فرمائے ہیں۔

اس معاملہ میں صحیح رائے یہ ہے اور یہی جمہور کی رائے ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ

---

[1] خطابی، معالم السنن: ۳/۴۱

کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کا مفاد رہا ہے۔ آپ نے جن لوگوں کے بارے میں دیکھا کہ ان کے ہدایا قبول کرنے سے ان کی تالیف قلب ہوگی اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوں گے ان کے ہدیے قبول فرمائے اور انھیں جواباً ہدیے اور تحفے بھی دیے، لیکن جہاں اس طرح کی مصلحت نہیں تھی وہاں آپ نے ہدیے رد بھی کردیے[1]

---

[1] مسئلہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نووی، شرح مسلم، ج ۴، جز ۱۲، ص ۱۱۴۔ فتح الباری: ۵/۲۳۱

☆☆☆

۴- غیر مسلم کی شہادت

مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم گواہی دے سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا ان کی گواہی ہر طرح کے معاملات میں قبول کی جائے گی یا صرف بعض معاملات میں؟ جن امور میں ان کی گواہی قبول کی جائے گی وہ کیا ہیں؟ کیا ہر حال میں ان کی گواہی قبول کی جائے گی یا بعض مخصوص حالات ہی میں وہ قابل قبول ہوگی؟ ان سوالات کا غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات اور ان سے تعلقات سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے یہاں ان سوالات پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی کوشش کی جائے گی۔

سفر میں وصیت کا حکم

قرآن مجید میں ایک خاص پس منظر میں غیر مسلموں کی شہادت کا ذکر ہے۔

ارشاد ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ

اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ وصیت کرے تو اپنوں میں سے دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنائے اور اگر تم سفر میں ہو اور موت کا وقت آ پہنچے تو دوسروں میں سے دو کو گواہ بنا سکتے ہو۔ اگر تمہیں گواہوں کے بارے میں شبہ ہوجائے تو تم ان کو نماز کے بعد روکو۔ وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم اس کے بدلہ میں کوئی

ارْتَبْتُمْ لاَ نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَناً وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی وَلاَ نَکْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّا اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ○ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰی اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا اِثْماً فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَا اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَیْنَا اِنَّا اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ○ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰی وَجْهِهَا اَوْ یَخَافُوْا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا وَ اللّٰهُ لاَ یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ○ (المائدۃ:۱۰۶-۱۰۸)

مالی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں خواہ ہمارا کوئی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپا رہے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گار ہوں گے۔ پھر اگر پتہ چل جائے کہ ان دونوں نے (حقیقت کو چھپا کر) گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو ان کی جگہ دو گواہ، جو میت سے سب سے زیادہ قریب ہیں اور جن کا حق مارا گیا ہے، کھڑے ہوں گے اور اللہ کی قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان کی گواہی کے مقابلے میں زیادہ سچی ہے۔ ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے، ورنہ ہم ظالم ہوں گے۔ اس طرح توقع ہے کہ لوگ شہادت صحیح طریقہ سے ادا کریں یا اس بات سے ڈریں کہ ان کی قسمیں دوسری قسموں کے بعد رد ہوجائیں گی۔ اللہ سے ڈرو اور بات سنو۔ اللہ فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا۔

ان آیات میں جو حکم بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان حالت سفر میں ہو، اسی حالت میں اس کا آخری وقت آن پہنچے اور وہ اپنے مال و اسباب یا کسی بھی چیز کی وصیت کرنا چاہے تو اپنے میں سے دو عادل افراد کو یا غیروں میں سے دو کو اپنی وصیت پر گواہ بنا دے۔(اس پر وصیت کرنے والے کے ورثاء کو اعتراض نہ ہو تو وصیت نافذ ہوجائے گی) لیکن اگر انھیں گواہوں کے بیان پر اعتماد نہ ہو تو گواہ قسم کھائیں گے کہ ان کا بیان صحیح ہے اور کسی دنیوی مفاد کے لیے انھوں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے (اس لیے کہ شریعت کا اصول ہے کہ مدعی کو دلیل فراہم کرنی ہوتی ہے اور وہ دلیل فراہم نہ کرسکے تو مدعا علیہ سے قسم لی جاتی ہے۔ یہاں ورثاء کی حیثیت مدعی کی اور گواہوں کی مدعا علیہ کی ہے) لیکن اگر ورثاء یہ دعویٰ کریں کہ گواہوں کے پاس وصیت کرنے والے کی فلاں چیز موجود ہے اور گواہ یہ کہیں کہ یہ اس سے خریدی گئی ہے۔

(تو اب گواہوں کی حیثیت مدعی کی ہوجائے گی اور انھیں اپنی خریداری کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا، اگر یہ ثبوت فراہم نہ کرسکے) تو دو قریب ترین ورثاء سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے دعویٰ پر قسم کھائیں۔ اس کے بعد اس چیز کا ان کے حق میں فیصلہ ہوجائے گا[۱]

کیا غیر مسلم گواہ ہوسکتا ہے

ان آیات سے متعلق مفسرین نے بہت سے سوالات چھیڑے ہیں:

وصیت پر جو لوگ گواہ بنائے جائیں گے ان کے متعلق فرمایا: **اِثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ** (دو عادل گواہ تمھارے اندر کے ہوں یا دو تمھارے غیروں میں سے)۔

اس فقرہ کا ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ گواہ تمھارے گھر اور خاندان کے لوگ ہوں۔ اگر وہ نہ ہوں تو خاندان کے باہر کے لوگ گواہ بنائے جائیں۔ حضرت عکرمہ، ابن سیرین اور امام زہری وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں:

اثنان ذو عدل منکم ای من عشیرته او اٰخران من غیرکم ای من غیر عشیرته

دو عادل گواہ ہوں تم میں سے، یعنی وصیت کرنے والے کے قبیلہ سے' یا دو گواہ تمھارے غیروں میں سے' یعنی وصیت کرنے والے کے قبیلہ کے باہر سے۔

ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ گواہ چاہے خاندان کے ہوں یا خاندان سے باہر کے، وہ سب مسلمان ہوں گے۔ غیر مسلم کو گواہ نہیں بنایا جاسکتا[۲]

بعد کے مفسرین میں زمخشری بھی اسی کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ خاندان کے لوگ وصیت کرنے والے کے حالات اور وصیت کے پس منظر سے بہتر طور پر واقف اور اس کے خیر خواہ ہوتے ہیں، اس لیے انھیں ترجیح دی گئی، ہاں ان کی عدم موجودگی میں

---

۱ جصاص، احکام القرآن: ۲/۶۰۱، ۶۰۲

۲ طبری، جامع البیان عن تاویل آی القرآن: ۱/۱۶۶-۱۶۸

دوسروں کو گواہ بنایا جاسکتا ہے۔[1]

یہی رائے علامہ ابو السعود کی بھی ہے۔[2]

لیکن علامہ ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ ان آیات کے آگے پیچھے خاندان اور قبیلہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لیے وہ مراد نہیں ہوسکتا۔[3]

کیا صرف اہلِ کتاب کی گواہی معتبر ہے؟

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، سعید بن مسیّبؒ، قاضی شریحؒ، ابن سیرینؒ، امام اوزاعیؒ، ثوریؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ اَوْ اٰخَرَانِ مِنْ غَیْرِکُمْ کے الفاظ یہاں اہل کتاب کے لیے ہیں۔ ان کے نزدیک سفر میں وصیت کی نوبت آجائے اور مسلمان موجود نہ ہوں تو اہل کتاب میں سے دو کو گواہ بنایا جاسکتا ہے۔[4]

اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو اس کے شانِ نزول میں آئی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ قبیلۂ بنوسہم کے ایک صاحب جو مسلمان تھے (جن کا نام بدیل یا بجیل بتایا گیا ہے) تمیم داری (جو اس وقت نصرانی تھے) اور عدی بن بدّا کے ساتھ سفر پر گئے۔ اس سفر میں ان کا ایک ایسی جگہ انتقال ہوگیا جہاں کوئی مسلمان نہ تھا۔ انتقال سے پہلے انھوں نے اپنا سامان ان دو اشخاص کے حوالے کر دیا اور کہا کہ اسے ان کے گھر والوں کو پہنچادیں۔ حضرت تمیم کہتے ہیں کہ اس شخص کے مرنے کے بعد ہم نے اس کا کچھ سامان رکھ لیا۔ اس میں چاندی کا ایک پیالہ بھی تھا، جس پر سونے کے نقش و نگار تھے۔ یہ اس کا سب سے قیمتی سامان تھا۔ اسے ہم نے ایک

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۶۵۰

[2] ابو السعود، ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم علی ہامش الرازی: ۴/ ۲۰۲

[3] جصاص، احکام القرآن: ۲/ ۵۹۷

[4] ابن حجر، فتح الباری: ۵/ ۴۱۳۔ ان میں سے صحابہ و تابعین کی رایوں کے لیے دیکھی جائے۔ طبری، تفسیر: ۱۱/ ۱۶۰ اور آگے کے صفحات

ہزار درہم میں فروخت کیا اور رقم آپس میں تقسیم کرلی۔ باقی سامان بدیل کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے اس میں وہ قیمتی پیالہ نہ دیکھا جو بدیل اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ایک روایت ہے کہ وہ سامان، جو اس نے ان دونوں کے حوالے کیا تھا، اس کی فہرست اسی سامان میں موجود تھی۔ سامان اس کے مطابق نہیں تھا، اس میں وہ پیالہ بھی غائب تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مقدمہ پیش ہوا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ تمیم اور عدی سے جب پیالہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے قسم کھا کر اپنی ناواقفیت ظاہر کردی، لیکن جلد ہی یہ پیالہ مکہ میں ایک شخص کے پاس دیکھا گیا[1]

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی گورنری کے زمانہ کی بات ہے کہ ایک مسلمان وقوقہ (عراق کا ایک شہر) میں تھے کہ ان کا آخری وقت آگیا۔ وہاں قریب میں کوئی مسلمان نہ تھا، جسے وہ اپنی وصیت کے سلسلے میں گواہ بناتے۔ چناں چہ انھوں نے اہل کتاب میں سے دو کو گواہ بنایا۔ یہ دونوں کوفہ آئے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کی خدمت میں پہنچے۔ اس مسلمان کے انتقال کی خبر دی، اس کی وصیت بیان کی اور اس نے جو چیزیں چھوڑی تھیں وہ واپس کیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا: اسی طرح کا ایک واقعہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں پیش آیا تھا۔ یہ دوسرا واقعہ ہے۔ پھر ان سے بعد عصر قسم لی کہ انھوں نے نہ تو کذب بیانی کی ہے اور نہ خیانت کی ہے اور نہ اس کی وصیت میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ یہ اسی کی وصیت اور اسی کا ترکہ ہے۔ انھوں نے قسم کھائی اور آپ نے اس پر عمل کیا[2]

اہلِ کتاب کے علاوہ دیگر غیر مسلموں کی گواہی بھی معتبر ہے

اس مسئلہ میں ایک رائے یہ بھی رہی ہے کہ آخران من غیرکم (تمھارے

---

[1] بخاری، کتاب الوصایا، باب قول اللہ عزوجل یَاأَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَینکم الخ مع فتح الباری: ۵/ ۴۱۰، ۴۱۱۔ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ المائدۃ۔ ابوداؤد، کتاب القضاء، باب شہادۃ اہل الذمہ والوصیۃ فی السفر [2] ابوداؤد، حوالہ سابق

غیروں میں سے دو) کو اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ الفاظ عام ہیں۔ ان میں سب ہی غیر مسلم آجاتے ہیں۔ یہ رائے سلف میں سعید بن جبیر، مجاہد، ابن سیرین، ابن زید، عبیدہ بن عمرو السلمانی وغیرہ کی ہے۔ انھوں نے 'مِنْ غَیْرِکُمْ' کی تشریح 'من غیر اهل دینکم' (جوتمھارے دین والے نہ ہوں) اور 'من غیر اهل ملتکم' (جو تمھاری ملت والے نہ ہوں) سے کی ہے[۱]

علاّمہ ابن جریر طبری نے اسی کی تائید کی ہے۔ کہتے ہیں 'وَآخَرَانِ مِنْ غَیْرِکُمْ' میں اللہ تعالیٰ نے کسی گروہ کی تخصیص نہیں کی ہے۔ الفاظ عام ہیں۔ جو لوگ اسلام سے باہر ہیں، چاہے وہ یہودی اور نصرانی ہوں یا مجوسی اور بت پرست، سب ہی اس میں آجاتے ہیں[۲]

یہی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔

کیا مسلمان کی عدم موجودگی میں غیر مسلم گواہ ہوں گے؟

قرآن مجید کے الفاظ سے ایک استدلال یہ کیا گیا ہے کہ سفر میں وصیت پر دو عادل مسلمانوں یا دو غیر مسلموں کو گواہ بنانے کا اختیار ہے۔ وصیت کرنے والا ان میں سے جن کو گواہ بنانا چاہے بنا سکتا ہے، لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس میں یہ اختیار نہیں ہے، بلکہ آیت کا منشا یہ ہے کہ سفر میں اگر مسلمان گواہ نہ ملیں تو غیر مسلموں کو گواہ بنایا جائے[۳]

غیر مسلم کی شہادت صرف حالتِ سفر میں قابلِ قبول ہوگی

جن اصحاب نے وصیت کے معاملہ میں غیر مسلم کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے

---

[۱] ابن جریر، تفسیر: ۱۱ / ۱۶۳-۱۶۶

[۲] ابن جریر، تفسیر: ۱۱ / ۱۶۹

[۳] ماوردی: النکت والعیون: ۱ / ۴۹۴

ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اس حکم کا تعلق خاص سفر سے ہے۔ حضر میں مسلمان کے معاملات میں غیر مسلم کی شہادت معتبر نہ ہوگی، اس لیے کہ ایک مسلمان کو اپنے وطن میں کسی غیر مسلم کو گواہ بنانے کی کوئی خاص مجبوری نہیں ہے۔ اسے آسانی سے مسلمان مل سکتے ہیں۔ البتہ سفر میں اس کا امکان ہے کہ وصیت پر گواہ بنانے کے لیے کوئی مسلمان نہ ملے۔ اس صورت میں غیر مسلم کو گواہ بنایا جاسکتا ہے۔

قاضی شریح کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی کی شہادت صرف سفر میں جائز ہے اور وہ بھی وصیت کی حد تک[1]

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ وہ اس قسم کی شہادت کو جائز سمجھتے تھے۔ اس کے ذیل میں علامہ خطابی لکھتے ہیں:

فیه دلیل علی ان شهادة اهل الذمة مقبولة علیٰ وصیة المسلم فی السفر خاصة.	اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ خاص سفر کی حالت میں مسلمان کی وصیت پر ذمیوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔

فرماتے ہیں: یہی قاضی شریح، ابراہیم نخعی اور امام اوزاعی کی رائے ہے[2]

وصیت کے مفہوم کی وسعت

قرآن مجید نے وصیت کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں بیع کا اقرار، قرض کا اقرار، ہبہ اور صدقہ جیسے بہت سے امور شامل ہوجاتے ہیں۔ علاّمہ ابوبکر جصّاص کے بقول اللہ تعالیٰ نے کسی خاص قسم کی وصیت کا حکم نہیں دیا ہے، اس لیے اسے محدود نہیں کیا جاسکتا۔[3]

---

1. ابن جریر، جامع البیان: ۱۱/ ۱٦۳
2. خطابی، معالم السنن: ۴/ ۱۷۱
3. جصاص، احکام القرآن: ۲/ ۵۹۸

قسم کس نماز کے بعد لی جائے؟

وصیت کے سلسلے میں گواہوں یا میت کے وارثوں سے قسم لینے کی ضرورت پیش آئے تو قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ بعد نماز قسم لی جائے۔ اس بارے میں دو رائیں ملتی ہیں: ایک یہ کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ گواہ چاہے مسلم ہوں یا غیر مسلم بعد عصر ان سے قسم لی جائے گی۔ (اس لیے کہ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے اور اس میں بڑا مجمع بھی ہوسکتا ہے) علامہ ابن جریر نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ مسلمان سے بعد عصر قسم لی جائے گی اور غیر مسلم سے اس کی نماز (عبادت) کے بعد۔ اسے سمجھایا جائے گا کہ اگر اس نے خیانت کی تو اسے سزا ملے گی اور وہ اپنی قوم میں رسوا ہوگا۔[1]

کیا سورۂ مائدہ کی یہ آیات منسوخ ہیں؟

فقہاء میں ابراہیم نخعی، امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ یہ آیات منسوخ ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید نے سورۂ بقرہ میں شہادت کا اصول قرض کے لین دین کے سلسلہ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ .... مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ (البقرۃ:۲۸۲)

اور مقرر کرو اس پر دو گواہ ..... ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو

اس میں صراحت ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کے گواہ ان میں کے پسندیدہ افراد ہونے چاہئیں۔ کافر کو اس کے کفر کی وجہ سے پسندیدہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لہٰذا اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہوگی۔ قرآن مجید کا ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ اَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق:۲) اور اپنے میں سے دو عادل افراد کو گواہ مقرر کرو۔

اس میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ گواہ مسلمانوں میں سے ہونے چاہئیں

---

[1] ابن جریر، جامع البیان: ۱۱/ ۱۷۵، ۱۷۶۔ نیز ملاحظہ ہو، رازی، التفسیر الکبیر: ۳/ ۷۷۴

اور انھیں عادل ہونا چاہیے۔ امت کا اجماع ہے کہ مسلمانوں میں بھی جو فاسق ہے اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ جب فاسق مسلمان کی گواہی قبول نہیں کی جاتی تو کافر کی بدرجۂ اولیٰ ناقابلِ قبول ہوگی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے نزدیک یہ حکم منسوخ نہیں، بلکہ محکم ہے۔ ان کے نزدیک حالت سفر میں مسلمان موجود نہ ہوں تو غیر مسلموں کو وصیت پر گواہ بنایا جاسکتا ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب، یحییٰ بن یعمر، سعید بن جبیر، ابومجلز، ابراہیم نخعی، قاضی شریح، عبیدہ سلمانی، ابن سیرین وغیرہ اسی کے قائل ہیں[1] فقہاء میں حضرت سفیان ثوری کی یہی رائے ہے۔ ابوعبید قاسم بن سلام کا بھی اسی طرف رجحان ہے۔ امام احمد نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

شهادة اهل الذِّمَّة جائزة على المسلمين فى السَّفر عنْد عدم المسلمين[2]	حالت سفر میں ذمیوں کی شہادت مسلمانوں کے معاملہ میں جائز ہے جب کہ مسلمان موجود نہ ہوں۔

جن اصحاب نے اسے منسوخ مانا ہے ان کے استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ سورۂ مائدہ کا نزول نبوت کے آخری سال میں ہوا، جب کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ طلاق اس سے بہت پہلے نازل ہوچکی تھیں، اس لیے وہ سورۂ مائدہ کے کسی حکم کی ناسخ نہیں ہوسکتیں۔ علامہ ابوبکر جصاص اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے سورۂ مائدہ

---

[1] جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا، ان حضرات کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ اجازت صرف اہلِ کتاب کی حد تک ہے یا عام ہے؟

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/ ۳۴۹، ۳۵۰۔ علاّمہ خرقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حنابلہ غیر مسلموں میں اہلِ کتاب ہی کی شہادت کو معتبر مانتے ہیں (ابن قدامہ: المغنی: ۹/ ۱۸۲) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ و خص جماعة القبول باهل الكتاب و بالوصية و بفقد المسلم حينئذ منهم ابن عباس و ابو موسىٰ الاشعرى و سعيد بن المسيب و شريح و ابن سيرين والاوزاعى والثورى و ابو عبيد و احمد۔ فتح الباری: ۵/ ۴۱۲

کو آخری سورت کہا ہے ان کا منشا یہ ہوسکتا ہے کہ فی الجملہ یہ آخر میں نازل ہوئی۔ اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت دَین، جس میں شہادت کا ذکر ہے، بعد میں نازل ہوئی ہو، لیکن یہ بات کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ خود جصاص نے رسولِ اکرم ﷺ اور بعض صحابہ کرام سے نقل کیا ہے کہ سورۂ مائدہ آخری سورہ ہے اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہے۔ وہ روایات یہ ہیں:

ضمرہ بن جندبؓ اور عطیہ بن قیسؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ مائدہ آخر میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں بیان کردہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھو۔ یہی بات حضرت عائشہؓ اور حضرت حسن بصریؒ نے کہی ہے۔ ابو میسرہ کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں اٹھارہ فرائض (احکام) کا ذکر ہے۔ اس میں کوئی منسوخ نہیں ہے[1]

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ نسخ کے لیے دو باتیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ ناسخ موجود ہو، دوسرے یہ کہ ناسخ و منسوخ میں جمع کرنا ممکن نہ ہو۔ جن آیات کو ناسخ کہا جاتا ہے ان میں شہادت سے متعلق ایک عام حکم ہے اور سورۂ مائدہ ایک خاص صورتِ حال سے بحث کرتی ہے، اس لیے ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ صحابۂ کرام میں سے کسی نے بھی مائدہ کے ان احکام کو منسوخ نہیں کہا ہے، اس کے برخلاف تین صحابہ وہ ہیں جنھوں نے صراحت کی ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہیں۔ ان کی اس صراحت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس معاملہ میں ان کی رائے فیصلہ کن ہوگی۔ یہ آیات سفر میں، جہاں مسلمان نہ ہوں، وصیت پر غیر مسلم کی شہادت کا جواز فراہم کرتی ہیں۔ یہ ایک ضرورت ہے اور ضرورت کے وقت عام احکام بدل جاتے ہیں۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

ربما كان الكافر ثقة عند المسلم و يرتضيه عند الضرورة [2]	بسا اوقات مسلمان کے نزدیک کافر ثقہ اور قابلِ اعتماد ہوسکتا ہے اور اسے وہ ضرورت کے وقت پسند کرسکتا ہے۔

---

[1] جصاص: احکام القرآن: ۲/ ۵۹۸

[2] قرطبی: الجامع لاحکام القرآن: ۶/ ۳۴۹، ۳۵۰

امام رازی بھی اس حکم کو منسوخ نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں کہ یہ حکم ایک ضرورت کے تحت دیا گیا ہے اور شریعت کا اصول ہے: الضرورات قد تبیح المحظورات (ضرورتیں کبھی ممنوع چیزوں کو مباح کردیتی ہیں) احکامِ شریعت میں ضرورت اور مجبوری کی رعایت کی گئی ہے۔ نماز کے لیے وضو کی جگہ تیمّم، سفر میں نماز کے اتمام کی جگہ قصر، بعض حالات میں رمضان کے روزے قضا کرنے اور اضطرار میں مردار کھانے کی اجازت اس کی مثالیں ہیں۔ زیر بحث مسئلہ میں بھی ضرورت موجود ہے۔ ایک مسلمان سفر کی حالت میں ہو اور وہاں کوئی مسلمان موجود نہ ہو جسے وہ اپنی وصیت پر گواہ بنا سکے تو غیر مسلم کو گواہ بنانا ایک ضرورت ہے، ورنہ بعض اہم مقاصد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ جیسے اس پر زکوٰۃ اور کفارے واجب ہوں، یا اس کے پاس امانتیں ہوں یا اس کے ذمہ قرض ہو، اگر غیر مسلم کی شہادت قبول نہ کی جائے تو مسلمان کی عدم موجودگی میں یہ تمام حقوق اور ذمہ داریاں پوری ہونے سے رہ جائیں گی۔ ان کی شہادت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے حیض، حمل، ولادت، بچہ کا مردہ یا زندہ پیدا ہونا جیسے خواتین کے مخصوص معاملات میں ہم عورت کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں، اس لیے کہ مردوں کا ان سے واقف ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس حکم کو منسوخ قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ امت کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ سورۂ مائدہ سب سے آخر میں نازل ہوئی اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہے[1]

فقہاء احناف میں امام طحاوی بھی اس حکم کو منسوخ نہیں مانتے[2]

صحیح بات یہ ہے کہ اسے منسوخ ماننے کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔

غیر مسلم کی شہادت غیر مسلم کے حق میں

اس بحث کا تعلق اس بات سے ہے کہ مسلمانوں کے معاملے میں غیر مسلموں کی شہادت کس معاملہ میں اور کب قبول کی جائے گی؟ اس سے ہٹ کر ایک سوال یہ ہے

---

[1] رازی، التفسیر الکبیر: ۳/۴۷۶

[2] عینی، عمدۃ القاری: ۱۱/۳۱۰

کہ غیر مسلم کی شہادت خود غیر مسلم کے معاملات میں قابل قبول ہوگی یا نہیں؟

امام شافعی کے نزدیک ذمی کی شہادت نہ مسلمان کے بارے میں قبول کی جائے گی اور نہ غیر مسلم کے بارے میں۔ یہی امام مالک کی بھی رائے ہے۔

امام شافعی، ابن ابی لیلیٰ اور اسحٰق بن راہویہ کی رائے یہ ہے کہ غیر مسلموں میں ایک مذہب کے ماننے والے کی شہادت اپنے ہم مذہب کے سلسلے میں تو جائز ہے، لیکن دوسرے مذہب کے ماننے والے کے سلسلے میں قبول نہیں کی جائے گی۔ مثال کے طور پر یہودی کی شہادت یہودی کے معاملے میں تو جائز ہے، لیکن نصرانی یا مجوسی کے معاملے میں ناجائز ہوگی۔ امام زہری کی بھی یہی رائے ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان عداوت اور دشمنی پائی جاتی ہے، اس لیے ان سے عدل و انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

احناف کی رائے یہ ہے کہ کفر اپنے تمام اختلافات کے باوجود ایک ہے، اس لیے ایک مذہب کے ماننے والوں کی شہادت دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے سلسلے میں قبول کی جائے گی۔ ان میں فرق نہیں کیا جائے گا[1]

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک ذمیوں کی شہادت مسلمانوں کے معاملات میں تسلیم نہیں کی جائے گی، البتہ ان کے آپس کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جائے گی، چاہے ان کے درمیان مذاہب کا اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے نصاریٰ کی شہادت یہود کے سلسلے میں یا یہود کی شہادت نصاریٰ کے سلسلے میں[2]

علامہ ابوبکر جصاص نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ سورۂ مائدہ کی زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کی وصیت پر ذمی گواہ ہوسکتے ہیں۔ جب مسلمان کی

---

[1] خطابی، معالم السنن: ۴/ ۱۷۲

[2] ہدایہ، کتاب الشہادات: ۳/ ۱۴۷۔ نیز ملاحظہ ہو: رد المحتار علی الدر المختار: ۴/ ۵۲۲

وصیت پر ان کی گواہی معتبر ہوگی تو غیر مسلم کی وصیت پر بدرجۂ اولیٰ ان کی گواہی کا اعتبار کیا جائے گا۔ لیکن سورۂ بقرہ کی آیت بتاتی ہے کہ مسلمان کے معاملے میں غیر مسلم کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی تو غیر مسلموں کی شہادت غیر مسلموں کے حق میں سورۂ مائدہ کی آیات کی روشنی میں اپنی اصل پر باقی رہے گی۔ یعنی ان کی شہادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ سفر میں وصیت کے سلسلے میں جن فقہاء نے ان کی گواہی تسلیم کی ہے ان کے نزدیک دوسرے تمام حقوق میں بھی ان کی گواہی قبول کی جائے گی۔[۱]

اس کی ایک اور دلیل حضرت جابرؓ کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں:

ان رسولَ اللهﷺ اجاز شهادة اهل الكتاب بعضهم علىٰ بعض[۲]	رسول اللہﷺ نے اہلِ کتاب میں سے بعض کی شہادت بعض کے حق میں جائز قرار دی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہﷺ کی خدمت میں یہود ایک مرد اور عورت کو زنا کے جرم میں پکڑ کر لائے اور فیصلہ کی درخواست کی۔ آپ نے ان سے چار گواہ طلب کیے۔ گواہوں کے بیانات سے مطمئن ہونے کے بعد آپ نے دونوں مجرموں کو رجم کرا دیا۔[۳]

یہی رائے احناف کے علاوہ حضرت سفیان ثوریؒ اور بعض دیگر فقہاء کی ہے۔[۴]

---

۱ جصاص، احکام القرآن: ۲ / ۶۰۰۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیات سے اصلاً جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان کی وصیت پر مجبوری میں ذمیوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔ اس سے ضمناً یہ نتیجہ بھی نکالا گیا ہے کہ ذمیوں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قابل قبول ہے۔ احناف جب اصل ہی کو منسوخ مانتے ہیں تو ایک ضمنی استدلال کو بھی، جو اس کی فرع ہے، منسوخ ہی سمجھا جائے گا۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶ / ۳۵۱

۲ ابن ماجہ، ابواب الاحکام، باب **شهادة اهل الكتاب بعضهم على بعض**۔ اس کے ایک راوی مجالد پر محدثین نے جرح کی ہے۔ نصب الرایۃ: ۴ / ۸۵

۳ جصاص، احکام القرآن: ۲ / ۶۰۱۔ اس کی سند پر بحث کے لیے دیکھی جائے نصب الرایۃ: ۴ / ۸۵

۴ ابن قدامہ، المغنی: ۹ / ۱۸۴

غیر مسلم کی شہادت کے معتبر ہونے کی شرط

اسلام نے شہادت کے قبول کرنے کے لیے عدل کی شرط رکھی ہے۔ گواہ اگر عادل نہ ہوتو اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ غیر مسلم عدل کی شرائط پوری کرتا ہے یا نہیں؟ اسے کسی معاملہ میں عادل مانا جائے گا یا اس کی شہادت کبھی قبول نہیں کی جائے گی؟

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

ان اتصاف الکافر بالعدالة مختلف فیه وھو فرع قبول شھادۃ فمن قبلھا وصفه بھا و من لاَ فلاَ[1]

کافر کو عادل مانا جائے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف فرع ہے اس اصل کی کہ اس کی شہادت قبول کی جائے گی یا نہیں؟ جس نے اسے قبول کیا اس نے اسے عدل سے متصف قرار دیا اور جس نے اسے قبول نہیں کیا اس نے اسے اس وصف سے متصف نہیں کیا۔

سورۂ مائدہ کی زیر مطالعہ آیات کے ذیل میں امام رازی نے اس مسئلہ پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ اسے ہم اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

قرآن مجید کا حکم ہے **وَ اَشۡھِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ** (اپنے میں سے دو عادل افراد کو گواہ بناؤ) اس کا مطلب یہ ہے کہ شہادت عادل مسلمان کی ہونی چاہیے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ کافر عادل نہیں ہوسکتا، اس لیے اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں عدل کا مطلب عقیدہ کی صحت اور فکر کی سلامتی نہیں، بلکہ جھوٹ اور غلط بیانی سے احتراز ہے۔ اسی وجہ سے اہل بدعت اور اہلِ اہواء کو گم راہ سمجھنے کے باوجود ان کی شہادت، اگر وہ جھوٹ سے بچیں تو، قبول کی جاتی ہے۔ اسی طرح جو غیر مسلم راست باز ہو، کذب بیانی اور مکر وفریب سے دامن کش رہتا ہو اس کی شہادت بھی قبول کی جانی چاہیے۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کرلی جائے کہ غیر مسلم

---

[1] فتح الباری: ۵/۴۱۶

عادل نہیں ہوتا تو یہ ایک عمومی بات ہوگی۔ سورۂ مائدہ میں جس مخصوص صورتِ حال کا ذکر ہے وہ اس سے مستثنیٰ سمجھی جائے گی۔[۱]

امام رازی کی یہ رائے اس پہلو سے اہم ہے کہ اس سے ایک وسیع دائرہ میں غیر مسلم کی شہادت کا جواز فراہم ہوتا ہے۔

بعض حالات میں غیر مسلم کی شہادت قبول کی جاتی ہے

قرآن مجید میں زیر بحث آیات کے علاوہ شہادت یا گواہی کا ذکر حسب ذیل مواقع پر آیا ہے۔

۱۔ مسلمانوں کے درمیان قرض کا لین دین ہو تو اس پر گواہ رکھے جائیں۔ (البقرۃ:۲۸۲)

۲۔ یتیم جب سن بلوغ کو پہنچ جائے اور اس میں معاملات کی سوجھ بوجھ پیدا ہوجائے تو سرپرست اس کا مال اس کے حوالے کردے اور اس پر گواہ رکھے۔ (النساء:۶)

۳۔ سورۂ نور میں زنا کے الزام اور بیوی پر زنا کی تہمت کے سلسلے میں شہادت کا ذکر ہے۔ (النور:۶،۹)

۴۔ حکم ہے کہ طلاق کے بعد رجوع یا جدائی کی جو شکل بھی اختیار کی جائے اس پر اپنے میں سے دو عادل گواہ رکھے جائیں۔ (الطلاق:۲)

ان آیات میں مسلمانوں کے لین دین، یتیموں کے حقوق، ان کے سرپرستوں کی ذمہ داریوں، بدکاری، اس کی تہمت اور طلاق کے احکام کا بیان ہے۔ یہ مسائل براہِ راست مسلم سماج سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان میں مسلمانوں کی شہادت کا ذکر ہے۔ جو مسائل خالص تعبدی نوعیت کے ہوں، جیسے عبادات، یا جن کا تعلق نکاح و طلاق اور

---

[۱] رازی، التفسیر الکبیر: ۳/۴۷۶

مسلمانوں کے معاشرتی امور سے ہو ان میں فطری بات یہی ہے کہ جہاں شہادت کی ضرورت پیش آئے مسلمان ہی کو گواہ بنایا جائے، لیکن بعض حالات اور بعض مسائل ایسے ہو سکتے ہیں جن میں غیر مسلم کی شہادت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو۔

ہمارے فقہاء نے شہادت کی بحث اسلامی ریاست کے پس منظر میں کی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اسے ذمی کی شہادت کی حیثیت سے پیش کیا ہے[۱]

اسلامی ریاست، جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں اور جہاں اسلامی قانون نافذ ہو، وہاں ممکن ہے کہ بہت سے معاملات میں غیر مسلموں کی شہادت کی ضرورت نہ پیش آئے، یا شاذ و نادر پیش آئے، لیکن اس کے باوجود فقہاء نے حالات و ضروریات کے تحت بعض معاملات میں غیر مسلم کی شہادت بھی قبول کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

و قد قبلت شهادة الكافر في بعض المواضع كما في الطب[۲]

بعض مواقع پر کافر کی شہادت قبول کی گئی ہے، جیسے کہ طب کا معاملہ ہے۔

شہادت کی مخصوص نوعیت ہے۔ اس سے ہٹ کر فقہاء نے غیر مسلم کی خبر پر اعتماد کا بھی حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے قول میں صادق مانا جاسکتا ہے۔ فقہ حنفی میں ہے کہ کوئی غیر مسلم، چاہے وہ مجوسی ہی کیوں نہ ہو، اگر یہ اطلاع دے کہ اس نے کسی کتابی سے گوشت خریدا ہے تو مسلمان کے لیے اس کا کھانا حلال ہے (اس لیے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے)۔ اسی طرح اگر وہ یہ اطلاع دے کہ اس نے گوشت مجوسی سے خریدا ہے تو مسلمان کے لیے اس کا کھانا حرام ہوگا۔ محض اس وجہ سے کہ ایک شخص نے (وہ بھی غیر مسلم نے) اس کی اطلاع دی ہے، اس کی خبر کو غلط نہیں

۱۔ شہادت کے مسئلہ اور اس کے احکام کے ذیل میں قاضی شوکانی لکھتے ہیں: **هٰذا الحكم (اى حكم الشهادة) يختص بالكافر الذمى و اما الكافر الّذى ليس بذمى فقد حكى فى البحر الاُجماع على عدم قبول شهادته على المسلم مطلقاً**۔ نیل الاوطار: ۹/ ۲۰۸

۲۔ فتح الباری: ۵/ ۴۱۳

قرار دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اصولی بات یہ کہی گئی ہے:

ان خبر الکافر مقبول بالاجماع فی المعاملات لاَ فی الدیانات[1] — اس پر اجماع ہے کہ کافر کی خبر معاملات میں قبول کی جائے گی۔ البتہ دینی امور میں قبول نہیں کی جائے گی۔

موجودہ حالات پر ایک نظر

موجودہ دور میں بیش تر مسلم ریاستوں میں غیر مسلم خاصی تعداد میں آباد ہیں اور ان ملکوں کے سیاسی، معاشی اور سماجی معاملات میں اس طرح ان کا عمل دخل ہے کہ مسلمان ان سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔ ان کی ضروریات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات میں ان کی شہادت معتبر ہوگی یا نہیں؟ ہمارے خیال میں اوپر کے بیانات کی روشنی میں اس کی گنجائش نکلتی ہے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی زیادہ تر آبادی ان ممالک میں بستی ہے جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں اور جہاں معاملات ہر ملک کے اپنے قوانین کے تحت ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں مسلمان بیع و شراء، قرض کے لین دین، زمین اور جائیداد کی خرید و فروخت، باہمی نزاعات اور جرائم وغیرہ کے سلسلے میں غیر مسلموں کی شہادت پر بسا اوقات مجبور ہیں۔ اسی بنیاد پر ان کے حقوق کا تحفظ اور ان کے نقصانات کی تلافی ہوسکتی ہے۔ اس صورتِ حال میں ان کی شہادت کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟ بظاہر ان حالات اور مسلمانوں کی عمومی ضروریات کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے دنیوی معاملات میں قابل اعتبار اور راست باز غیر مسلم کی شہادت بھی مسلمان کی شہادت ہی کی طرح قبول کی جائے۔

---

[1] الدر المختار: ۵/۳۰۱، ۳۰۲

☆☆☆

اسلامی رِیاست

اور اس میں غیر مسلموں کے حقوق

اسلامی ریاست

اسلامی ریاست کا تصور نیا نہیں ہے۔ اس کا خاکہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اسلامی علوم کے ماہرین نے اپنے اپنے دور میں اس کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ اصول و مبادی پر اتفاق کے باوجود بعض نکات پر ان کے درمیان اختلاف بھی رہا ہے اور دلائل کے ساتھ ان پر بحث و مباحثہ بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ اس کا علمی پہلو ہے۔ عملی پہلو سے دنیا اسلامی ریاست کا کامیاب تجربہ کر چکی ہے اور اس کے برکات و ثمرات سے صدیوں فائدہ اٹھاتی رہی ہے، لیکن اس کے باوجود موجودہ دور میں اسلامی ریاست کا نام لیا جاتا ہے تو مخالفین اس طرح چونک پڑتے ہیں جیسے خطرہ کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی زبردست بھونچال آنے والا ہے، جس سے نوعِ انسانی کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔ اس پر اعتراضات اور الزامات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک جابرانہ اور کلیت پسندانہ نظام کا داعی ہے، وہ کسی دوسرے فکر اور طرزِ حیات کو برداشت نہیں کرتا، اس میں رواداری اور وسعتِ نظر نہیں ہے، وہ حریتِ فکر، آزادیِ خیال اور اختلاف رائے کی اجازت نہیں دیتا، وہ جارحیت اور تشدد کا علم بردار ہے اور اپنے خیالات بہ زور پھیلانا چاہتا ہے، وہ عدل و انصاف کے معروف اصولوں کا پابند نہیں ہے، اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں، وہ قدامت پرستی کا علم بردار ہے، اس میں دورِ جدید کے تقاضوں کی رعایت نہیں ہے، وہ تہذیب، آرٹ اور فنونِ لطیفہ کا دشمن ہے اور معاشرہ

کو ماضی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

اسلام کے ان مخالفین کو حکومت و اقتدار اور ذرائع ابلاغ کی جدید ترین سہولتیں حاصل ہیں اور میڈیا کی زبردست قوت ان کے پاس ہے، اس کی مدد سے ایک طرف تو اس نوع کے اعتراضات کے ذریعے مسلسل یہ ثابت کرنے کی کوشش جاری ہے کہ اسلام کا تصورِ ریاست دورِ جدید کے لیے ناقابل قبول ہے اور دوسری طرف اسلامی ملکوں میں جہاں کہیں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد ہو رہی ہے، اسے ناکام بنانے کی بدترین سازشیں کی جاتی ہیں۔ اس کے لیے کسی بھی خفیہ اور علانیہ تدبیر کے اختیار کرنے اور اپنی سیاسی قوت کو استعمال کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اس وقت جمہوریت، حریتِ فکر، رواداری اور عدل و انصاف کے سارے تقاضے اس طرح فراموش کر دیے جاتے ہیں جیسے اسلام کے 'بھیانک نتائج' سے دنیا کو بچانے کے لیے سب کچھ روا ہے۔

یہاں ان اعتراضات کی براہِ راست تردید یا ان کے پیچھے کارفرما محرکات سے بحث کی جگہ اسلام کی بعض بنیادی تعلیمات پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ تعلیمات غیر مسلموں کے سلسلے میں اسلام کا اصولی موقف واضح کرتی ہیں۔ ان میں ان اعتراضات کا جواب بھی ہے جو اس موضوع پر کیے جاتے ہیں۔

☆☆☆

اسلامی ریاست کے بعض رہ نما اصول

اسلامی ریاست جن مقاصد کے لیے وجود میں آتی ہے اور جن اصول وضوابط کی وہ پابند ہوتی ہے، یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اسلامی ریاست، جس کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے، اس کے سمجھنے میں مدد ملے گی اور اس کے نمایاں خد و خال سامنے آ سکیں گے، دوسری طرف غیر مسلموں کے ساتھ اس کے رویہ کو بہتر طریقہ سے سمجھا سکے گا۔

عدل و انصاف کا قیام

ظلم و زیادتی کی کوئی ایک شکل نہیں ہے۔ یہ سماجی، معاشی، معاشرتی، سیاسی ہر طرح کا ہوتا ہے۔ دنیا ان سب کا تجربہ کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ اسلام ہر نوع کے جور و ظلم کے خلاف ہے۔ وہ اس کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں دیتا اور اپنے ماننے والوں کو عدل و انصاف کا پابند بناتا ہے۔ وہ اس کی بنیاد پر پورے معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝ (النحل:۹۰)	بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل و احسان کا اور قرابت داروں کا حق ادا کرنے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے، منکر سے اور ظلم و زیادتی سے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

عدل کے ہم معنی لفظ 'قسط' ہے۔ فرمایا:

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (الاعراف:۲۹) کہہ دو میرے رب نے عدل وقسط کا حکم دیا ہے

ایک اور جگہ فرمایا:

وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ لَانُکَلِّفُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (الانعام:۱۵۲)

ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ۔ ہم کسی شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتے ہیں جتنی اس میں طاقت ہے اور جب کوئی بات کہو تو عدل و انصاف کے ساتھ کہو، چاہے معاملہ قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

اس میں اس بات کی تاکید ہے کہ عدل و انصاف کا دامن ہرگز نہ چھوٹنے پائے، چاہے اس کی زد عزیزوں اور قرابت داروں ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ یہی بات ایک اور جگہ زیادہ وضاحت اور پورے زور اور قوت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ حکم ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیّاً اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ○ (النساء:۱۳۵)

اے ایمان والو! عدل و قسط کو لے کر کھڑے ہو جاؤ، اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، چاہے اس کی زد تمھاری ذات پر پڑے، یا والدین اور رشتہ داروں پر۔ اگر صاحب معاملہ مال دار یا غریب ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ لہٰذا تم خواہش کی اتباع نہ کرو کہ عدل سے پھر جاؤ۔ اگر تم زبان کو موڑ کر بات کرو یا اعراض کرو تو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ ظلم کو ختم کر کے عدل و انصاف قائم کرے۔ اسلام اپنے حدودِ اقتدار میں کسی بھی قسم کی ناانصافی، حق تلفی اور ظلم و جور کا روادار نہیں ہے۔ اس کا صاف حکم ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلَی اَهْلِهَا وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کو پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ

بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعاً ۢ بَصِيْراً ○ (النساء:۵۸)

کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ تمھیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

عدل و انصاف کے معاملے میں اس کے نزدیک دوست اور دشمن کا فرق صحیح نہیں ہے۔ وہ دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ بھی اس کی پابندی کو لازمی قرار دیتا ہے اور کسی حال میں اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا۔ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ ۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (المائدۃ:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن کر رہو۔ کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس قدر مشتعل نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو۔ یہی بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

عدل و قسط کے قیام کے لیے وقت ضرورت طاقت کا استعمال بھی اسلام کی رو سے ضروری ہو جاتا ہے۔ چناں چہ سورۂ حدید میں ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○ (الحدید:۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا نازل کیا، اس میں سخت (سامان) جنگ ہے اور لوگوں کے لیے (دوسرے) منافع بھی ہیں، تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ طاقت والا اور زبردست ہے۔

اس طرح اسلام ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کا حکم دیتا اور فرد اور ریاست دونوں کو اس کا پابند بناتا ہے۔ اس معاملہ میں اس کی ہدایات اتنی واضح ہیں کہ کوئی ہوش مند انسان انکار کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی فرد یا ریاست عدل کی راہ سے

ہٹے تو یہ اسلام کی صریح خلاف ورزی ہوگی، اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا[1]

اسلام کے لیے جبر کی اجازت نہیں

ایک اعتراض یہ ہے کہ اسلام کے مزاج میں جبر و تشدد ہے۔ وہ دوسروں کو زبردستی اپنے عقیدہ اور فکر کا پابند بنانا چاہتا ہے اور طاقت کے ذریعہ مخالف افکار و نظریات پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے اقتدار اور حکومت کو بزور اسلام پھیلانے کے لیے استعمال کیا ہے۔

اس دنیا میں بہت سے مذاہب، مختلف فلسفے اور افکار و نظریات ماضی میں بھی رہے ہیں اور اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ وہی سب سے بہتر اور برتر ہے۔ اسے اس کا حق حاصل ہے۔ اسلام کا بھی دعویٰ ہے کہ وہی واحد دین حق ہے۔ اسے وہ بزور طاقت نہیں، بلکہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے عام کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے دلیل و برہان، وعظ و نصیحت اور بحث و گفتگو کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ○ (النحل:۱۲۵)	دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعے اور مباحثہ کرو ان سے اس طریقہ سے جو بہترین ہے۔ بے شک تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہ ان لوگوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں[2]

جو نظریہ دلیل و برہان سے بات کرنا چاہے اور افہام و تفہیم کی راہ اختیار کرے

---

[1] اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'کم زور اور مظلوم- اسلام کے سایے میں' ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

[2] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون 'حکمتِ دعوت' مطبوعہ ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی۔ اپریل، مئی، جولائی اور اگست ۱۹۸۷ء کے شمارے۔

اس پر جبر و اکراہ کا الزام مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں میں تضاد ہے۔ جب کسی نظریہ میں دوسروں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی تو وہ موقع ملنے پر جبر و تشدد پر اتر آتا ہے، لیکن اسلام اس یقین اور اطمینان کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے کہ دلیل کے میدان میں اسے شکست نہیں دی جاسکتی، اس لیے جبر کو وہ خارج از بحث سمجھتا ہے۔ ارشاد ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِن بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ○ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُم مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرۃ:۲۵۶،۲۵۷)

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ بے شک ہدایت بالکل واضح ہوگئی ہے گم راہی سے۔ پس جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے مضبوط رسی پکڑلی، جو ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی طرف پہنچاتا ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اولیاء طاغوت ہیں۔ وہ انھیں نور سے ظلمتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ جہنم والے ہیں۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا○ (الدھر:۳)

بے شک ہم نے انسان کو راستہ دکھایا ہے۔ اب وہ چاہے شکر گزار بنے یا (ناشکرا اور) کافر۔

سورۂ کہف میں ارشاد ہے:

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف:۲۹)

کہہ دو، حق تمھارے رب کی طرف سے (آچکا ہے) پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے۔

ان آیات میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حق

آیا ہے وہ بالکل واضح ہے، جس کا جی چاہے قبول کرے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔ اس کے بعد اس اقرار و انکار کے انجام سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، تاکہ آدمی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ وہ کس انجام کو پسند کرتا ہے؟

اسلام ایک دعوتی اور تبلیغی دین ہے۔ جبر و اکراہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔وہ اس نقطۂ نظر کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اختیار اور آزادی سے نوازا ہے، حالاں کہ اللہ چاہتا تو ہر فرد بشر کو اپنا تابع فرمان بنائے رکھتا اور کسی میں اس کی نافرمانی کا یارانہ ہوتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے حق و باطل کو واضح کیا اور انسان کو پوری آزادی دی کہ ان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اس آزادی کے صحیح استعمال پر ہی اس کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اس کا غلط استعمال اس کو دنیا اور آخرت کی ناکامی سے دو چار کرے گا۔ یہ وہ زبردست مصلحت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں جبر نہیں رکھا ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کے لیے جبر و تشدد کا طریقہ اپناتا ہے تو اس مصلحتِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس مضمون کی بعض آیات یہاں پیش کی جارہی ہیں:

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ○ (یونس:۹۹)	اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے (جب اس نے یہ نہیں چاہا) تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں۔
وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ○ (یوسف:۱۰۳)	اکثر لوگ، آپ کتنا ہی چاہیں، ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کا قانون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ	اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا)۔ وہ جسے چاہتا

يَّشَآءُ وَ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ (النحل: ۹۳)

ہے گم راہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور تم جو کچھ کر رہے تھے اس کے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔

سورۂ شوریٰ میں یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ○ (الشوریٰ: ۸)

اگر اللہ چاہتا تو انھیں ایک امت بنا دیتا، لیکن وہ تو جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے اس سے محروم کر دیتا ہے) ظالموں کا کوئی سرپرست اور مددگار نہ ہوگا۔

محمد ﷺ اسلام کے داعیِ اعظم تھے۔ آپ کے قلبِ مبارک میں یہ بے پناہ خواہش موج زن تھی کہ اللہ کے سارے بندے اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوجائیں۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ یہاں فکر وعمل کا اختلاف لازماً رہے گا اور لوگوں کے طرزِ فکر اور طریقہ ہائے حیات جدا جدا ہوں گے، اس لیے آپ اپنی مقدس تمنا اور پاکیزہ خواہش کے باوجود، انسانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کوختم کر کے، سب کو اللہ کے دین کا پابند نہیں بنا سکتے۔ آپ کی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ حق واضح کردیں۔ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ضلالت میں بھٹکنے چھوڑ دیتا ہے۔

اسلام کے ماننے یا نہ ماننے کے سلسلے میں یہ اس قدر منطقی اور معقول موقف ہے کہ حریتِ فکر کا کوئی بڑے سے بڑے علم بردار بھی آسانی سے اسے چیلنج نہیں کرسکتا۔ اس کی فقہی اور قانونی حیثیت کو مشہور فقیہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اس طرح واضح کیا ہے:

”(اسلامی ریاست میں) کسی ذمی یا مستامن کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی کو مجبور کیا گیا اور اس نے مجبوری کی حالت میں اسلام کا اظہار کیا تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ ہاں اگر مجبوری کے ختم ہونے کے بعد وہ اسلام پر ثابت قدم رہے تو اس کے اسلام کو معتبر سمجھا جائے گا۔ اگر اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوجائے تو

سمجھا جائے گا کہ اس نے درحقیقت اسلام قبول نہیں کیا اور حالتِ کفر میں اس کی موت واقع ہوئی۔ جبر کے ذریعے اسلام لانے کے بعد اگر کوئی شخص مرتد ہوجائے یا اپنے دین کی طرف لوٹ جائے تو اسے نہ تو ارتداد کی سزا (قتل) دی جائے گی اور نہ اسے اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا۔ یہی امام احمد، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی رائے ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی آیت لاَ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (البقرۃ:۲۵۶) ہے۔‘‘[۱]

اس کے بعد کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اسلام کے لیے جبر و اکراہ کا طریقہ اختیار کیا گیا؟ اسلام کی طویل تاریخ میں اگر یہ ثابت بھی ہوجائے کہ کسی نے یہ حرکت کی ہے، جس کا ثابت کرنا آسان نہیں ہے، یا آئندہ کسی سے یہ حرکت ہو تو کیا اسے قرآن کی سند حاصل ہوگی؟

اسلام اور دیگر مذاہب

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کا رویہ معاندانہ ہے۔ وہ اپنے مخالفین کے مذہبی جذبات کی رعایت نہیں کرتا اور ان کی قابلِ احترام شخصیتوں پر جارحانہ حملے کرتا ہے۔ اس کی تنقیدیں مذہبی دل آزاری کا سبب بنتی ہیں۔

یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ اسلام دینِ توحید ہے، اس نے شرک پر زبردست تنقید کی ہے اور اس کی کم زوریاں واضح کی ہیں۔ اس بنیاد پر مشرکینِ مکہ سے اس کی سخت کشمکش بھی رہی۔ ان حالات میں اس نے دو باتوں کا حکم دیا: ایک یہ کہ مشرکوں کے معبودوں کو، جنھیں وہ معبودانِ باطل سمجھتا ہے، برا بھلا نہ کہا جائے، اس لیے کہ اس کے ردِّعمل میں مشرکین اللہ تعالیٰ کی جناب میں گستاخی اور بے ادبی کا ارتکاب کرنے لگیں گے۔ یہ بات سخت نازیبا ہے کہ ہماری کسی حرکت سے مخالف طیش میں آئے اور اللہ تعالیٰ کی شان میں زبان درازی شروع کردے۔ ارشاد ہے:

---

[۱] ابن قدامہ، المغنی: ۱۲/ ۲۹۱، ۲۹۲

وَ لاَ تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ○ (الانعام:۱۰۸)

یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں تم انھیں برا بھلا نہ کہو کہ وہ حد سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کو اس کا عمل خوش نما بنا دیا ہے۔ پھر انھیں اپنے رب کے پاس لوٹنا ہے، وہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ مخالفین کی طرف سے سب وشتم، لعن طعن اور تضحیک و تمسخر جاری ہے۔ اس کا جواب اسی زبان اور اسی لہجہ میں نہ دیا جائے۔ جواب ہو تو بہ طریقِ احسن ہو، گو تمھارے خلاف گندی زبان استعمال ہو رہی ہے، لیکن تمھاری زبان ہر طرح کی آلائش سے پاک رہے، کسی کے اشتعال دلانے کی وجہ سے تہذیب و شائستگی کا دامن نہ چھوٹنے پائے اور حسنِ خلق سے دل جیتنے کی کوشش کی جائے:

وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ○ وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ مَا یُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ○ (حٰمٓ السجدة:۳۴،۳۵)

یکساں نہیں ہے نیکی اور نہ بدی۔ تم بدی کو دفع کرو اس طریقہ سے جو احسن ہو، پھر تم دیکھو گے کہ تمھارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہے گویا وہ جگری دوست ہے۔ یہ خوبی ان ہی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام اسی کو حاصل ہوتا ہے جو بڑے نصیبے والا ہے۔

وہ دین جو مخالفین کے معبودانِ باطل کو برا بھلا کہنے کی اجازت نہ دے اور جو کارِ دعوت کو اتنی بلند اخلاقی سطح سے انجام دینے کی تعلیم دے، جس سے زیادہ بلندی ممکن نہیں ہے، اس کے بارے میں یہ الزام کتنا عجیب سا ہے کہ وہ دوسروں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرتا ہے؟!

اہلِ کتاب کے ساتھ اسلام کا رویہ

قرآن مجید نے مشرکین کے ساتھ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے بھی براہِ راست خطاب کیا۔ ان سے اسلام کا بنیادی عقائد میں بڑی حد تک اشتراک تھا۔ وہ اللہ کی ذات رسول اور آخرت کو اصولی طور پر مانتے تھے۔ ان کے پاس گو کہ آسمانی کتابیں تھیں، لیکن ان میں بڑے پیمانے پر تحریف ہوچکی تھی۔ ان کے سلسلے میں اسلام نے حسب ذیل رویہ اختیار کیا۔

دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان سب پر ایمان کو لازم قرار دیا اور کہا کہ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی صریح کفر ہے۔اس معاملہ میں اللہ کے رسول ﷺ اور اہل ایمان کا موقف ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِن رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرۃ:۲۸۵)

رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس کے ماننے والے بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر، اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔

ایک جگہ اس کے مخالف رویہ کو کفر کا رویہ قرار دیا گیا اور اس پر عذابِ آخرت کی وعید سنائی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں کی ستائش کی گئی ہے۔ جو اللہ کے رسولوں کے درمیان فرق و امتیاز نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کے اجر وثواب سے نوازے گا۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ

بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے

وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًاo اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَّ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًاo وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاo (النساء:۱۵۰-۱۵۱)

ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور کفر و ایمان کے بیچ میں راستہ نکالنا چاہتے ہیں تو یہی لوگ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے (اس کے برعکس) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئے اور ان کے درمیان تفریق نہیں کی وہ ان کو ان کا اجر ضرور دے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

اسلام نے صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سارے پیغمبروں پر ایمان کو لازمی قرار دیا، بلکہ ان کے پیغام، ان کی دعوت، اس راہ میں ان کی جدوجہد اور قربانی اور انسانوں کے ساتھ ان کی محبت اور ہمدردی کو تفصیل سے پیش کیا۔ ان کی سیرت پر بہت سے داغ دھبے مخالفین نے اور بعض اوقات ان کے ماننے والوں اور ان سے عقیدت کا دم بھرنے والوں نے ڈال رکھے تھے، اس نے ان کا ازالہ کیا اور ان کی پاکیزہ سیرت اور درخشاں کردار کو واضح کیا۔ ان کی نیکی اور تقویٰ کی گواہی دی اور رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے واسطے سے اہل ایمان کو ان کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کا حکم دیا:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام:۹۰)

یہ وہ لوگ ہیں، جن کو اللہ نے راہِ ہدایت دکھائی ہے۔ آپ ان کی راہ کی پیروی کیجیے۔

اسی طرح اسلام نے ان تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کی جو مختلف ادوار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں۔ ان پر ایمان اور یقین کو عقیدہ کا جزو قرار دیا۔ اسلام کے ماننے والے کسی شخص کا عقیدہ اس وقت تک معتبر نہ ہوگا جب تک کہ وہ سلسلۂ وحی و رسالت اور آسمانی کتابوں کی تصدیق نہ کرے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے

رَسُولِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاًۢ بَعِيْدًا○

اپنے رسول پر نازل کی اور ہر اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی، جو شخص انکار کرتا ہے اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا تو وہ گم راہی میں بہت دور نکل گیا۔ (النساء:۱۳۶)

قرآن مجید کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس زمین پر جتنے پیغمبر آئے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں سب نے توحید کی تعلیم دی، شرک کی تردید کی اور غیر اللہ کی عبادت و اطاعت سے منع کیا۔ اس بنیاد پر اس نے اہل کتاب سے کہا کہ توحید تمھارے اور ہمارے درمیان مشترک کلمہ ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اس پر عمل کریں اور اس کے تقاضے پورے کریں:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ○

اے پیغمبر کہو اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں (مشترک) ہے، وہ یہ کہ ہم بندگی نہیں کریں گے مگر صرف اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم (اللہ کی اطاعت کرنے والے) ہیں۔ (آل عمران:۶۴)

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اگر خدا ہے اور اس کی طرف سے وحی و رسالت کا سلسلہ جاری رہا ہے تو اس کے کتاب اللہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ وہ اس سلسلے کی آخری کڑی اور اس ہدایت و رہ نمائی کی تکمیل ہے، جو ہمیشہ سے نوعِ انسانی کو اللہ کے رسولوں کے ذریعے ملتی رہی ہے۔ اس کے ساتھ قرآن نے اہل کتاب کی تحریفات کی نشان دہی کی، حق و باطل کو الگ کرکے دکھایا، توحید، رسالت اور آخرت کا صاف اور بے آمیز تصور پیش کیا، ان کی دنیاداری پر تنقید کی، ان کے نیک اور صالح افراد

کی تعریف کی۔ ان تمام مسائل پر بہ طریق احسن گفتگو کا حکم دیا:

وَلاَ تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلاَّ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلاَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝ (العنکبوت:۴۶)

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں ظالم اور بے انصاف ہیں اور کہو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور اس کتاب پر جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔

مذاہب کے بارے میں کیا اس سے زیادہ سنجیدہ اور معقول رویہ کا تصور کیا جاسکتا ہے؟!

☆☆

جہاد اور اس کے احکام

اسلامی ریاست کا تصور اس کے مخالفین کے نزدیک دورِ قدیم کی ایک جنگ جو ریاست کا تصور ہے، جو بدترین جارحانہ عزائم رکھتی ہے۔ وہ دوسروں کے عقیدہ وعمل پر حملہ آور ہوگی اور اپنے عقیدہ وعمل کو ان پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ ایک جابر قوت بن کر ابھرے گی اور دنیا کے امن و امان کو غارت کر کے رکھ دے گی۔ آج کے مہذب انسان کے لیے وہ کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اسلام ایک سخت گیر نظریاتی ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ طاقت کے استعمال اور جہاد کا حکم دیتا ہے۔ جہاد ان حضرات کے نزدیک بہت ہی خطرناک اصطلاح ہے۔ یہ ہر مخالف کو بزورِ شمشیر اسلام پر مجبور کرنے اور نہ ماننے پر سر قلم کردینے کا نام ہے۔

اسلامی ریاست کا یہ پورا تصور ہی ایک ذہنی اختراع ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کوئی خیالی چیز نہیں ہے۔ اس کی تفصیلات قرآن، حدیث اور سیرت میں موجود ہیں، تاریخ نے عملاً اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ دنیا اس کے احسانات دیکھ چکی ہے، اس کے برکات سے فائدہ اٹھا چکی ہے اور اب بھی فائدہ اٹھا رہی ہے۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ کیا اسلامی ریاست فی الواقع دنیا کے لیے خطرہ ہے؟ کیا وہ ایسی ریاست ہے جو اپنے نظریات کو طاقت کے بل پر منوائے گی؟ کیا جہاد کے

نام پر وہ مستقل حالت جنگ جاری رکھے گی اور امن و امان کے لیے غارت گر ثابت ہوگی؟ اس نے جہاد کا حکم کیوں دیا ہے؟ کن حالات میں دیا ہے؟ کس کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا ہے؟

اسلام فساد اور خوں ریزی کے خلاف ہے

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں تازہ رہنی چاہیے اور ہر دم تازہ رہنی چاہیے کہ اسلام اللہ پر ایمان صادق، اس سے گہری وابستگی اور اس کی عبادت و اطاعت کا نام ہے۔ اس کے ساتھ جور و تعدی، خون خواری اور وحشت و بربریت جیسی صفات کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ یہ متضاد اوصاف ہیں جو جمع نہیں ہوسکتیں۔ اسلام کی بنیادی دعوت ہی یہ ہے:

اَلاَ لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ○ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً اِنَّہٗ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ○ وَلاَ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلاَحِھَا وَ ادْعُوْہُ خَوْفًا وَ طَمَعاً اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ○ (الاعراف:۵۴-۵۶)

سن لو پیدا کرنا اور حکم دینا سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ بے شک وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں اس کی اصلاح کا جب فیصلہ ہو چکا ہے تو فساد نہ مچاؤ اور اللہ کو ڈر کر اور امید سے پکارو، بے شک اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب تر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی زمین میں قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کرنا، فتنہ وفساد پھیلانا، امن و امان کو درہم برہم کرنا، ہرے بھرے کھیتوں اور باغوں کو آگ لگانا اور آبادیوں کو تہس نہس کرنا، خدا کے نافرمانوں اور دنیا پرستوں کا کام ہے۔ اس طرح کے کردار کا ایک جگہ ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ اللہ کے نزدیک یہ ایک ناپسندیدہ کردار ہے۔ اس سے انسان اللہ کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُہٗ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیُشْھِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ

انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمھیں اچھی لگتی ہیں اور وہ

قَلْبِهٖ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ○ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ○ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ○ (البقرۃ:۲۰۴-۲۰۶)	اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے، مگر حقیقت میں وہ سخت جھگڑالو ہے۔ جب وہ (تمھارے پاس سے) لوٹتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے، کھیتی اور نسل انسانی کو تباہ کرنے کے لیے تگ و دو کرنے لگتا ہے۔ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو اس کا غرورِ نفس اسے گناہ پر جما دیتا ہے۔ اس کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

قومیں جب تک صلاح و فلاح کے راستہ پر گام زن رہتی ہیں ان کی مہلتِ حیات دراز ہوتی رہتی ہے اور جب وہ اس سے انحراف کرتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی تباہی کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور وہ مٹا دی جاتی ہیں۔ نوعِ انسانی کی اس تاریخ کو قرآن مجید نے چند مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ○ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ○ (ھود:۱۱۶،۱۱۷)	جو قومیں تم سے پہلے گزریں ان میں ایسے لوگ کیوں نہیں موجود رہے جن کے اندر خیر کے اثرات ہوتے اور جو فساد فی الارض سے منع کرتے۔ ایسے لوگ بہت ہی کم تھے جنھیں ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا تھا، ورنہ جن لوگوں نے ظلم کی راہ اختیار کی وہ اسی عیش کے پیچھے پڑے رہے جو انھیں حاصل تھا اور انھوں نے مجرمانہ زندگی گزاری۔ تمھارا رب ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کردے جب کہ ان کے باشندے نیک رہے ہوں۔

جن قوموں نے سرکشی اور فساد کا راستہ اختیار کیا ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے تازیانے اس طرح برسے کہ وہ صفحۂ زمین سے نیست و نابود ہوگئیں اور دنیا کے لیے عبرت کا سامان بن کر رہ گئیں۔ عاد و ثمود اور فرعون جیسے جبابرہ اور ان کی شان و شوکت کا

ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

الَّذِيْنَ طَغَوْا فِيْ الْبِلَادِ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ۝ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ۝

یہ سب وہ تھے جنھوں نے اپنے ملکوں میں سرکشی کا رویہ اختیار کیا، ان میں بہت زیادہ فساد برپا کیا تو تمھارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ بے شک تمھارا رب گھات میں لگا ہوا ہے۔ (الفجر:۱۱-۱۴)

اسلام کے نزدیک قیادت و سیادت کے اہل وہ ہیں جن کے اندر تقویٰ اور خداترسی ہو، جو اس کے احکام کے پابند ہوں اور جن میں صلاح و فلاح کی طرف راہ نمائی کی صلاحیت ہو۔ اس کے برخلاف جو لوگ ان صفات سے محروم ہیں، اس دنیا میں حدود ناآشنا زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کر رہے ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی اتباع کی جائے اور فساد کو پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ یہی بات حضرت صالح علیہ السلام کی زبانی ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔ وہ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ۝ وَ لَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ۝

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور حد سے بڑھنے والوں کے حکم کے پیچھے نہ چلو، جو کہ زمین میں فساد مچاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ (الشعراء:۱۵۰، ۱۵۱)

اسلام نے نوع انسانی کی صلاح و فلاح کا جس شدت سے حکم دیا اور فساد فی الارض سے جس زور اور قوت سے منع کیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی دستور میں ڈھونڈنے سے بھی شاید نہ ملے۔ وہ فلاح کی کوششوں کو کام یابی اور فساد اور بگاڑ کی مساعی کو ناکامی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس نے انسان کے ذہن و فکر کو صلاح کا رخ دیا اور اس کے سعی و عمل کو خیر کی طرف موڑا ہے۔ اس کا جہاد بھی نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہی کے لیے ہے۔ اس نے اس وقت تلوار اٹھائی جب کہ فساد کے تاریک بادل ہر طرف چھاگئے،

عام انسانوں کو چند افراد اور چند طبقات نے اپنا غلام بنا لیا، ان کا ہر طرح استحصال ہونے لگا، ان کو فکر و نظر کی آزادی سے محروم کر دیا گیا، ان پر حق و صداقت کے دروازے بند کر دیے گئے اور صراطِ مستقیم سے روکنے کے لیے ان پر ہر طرح کا ظلم اور زیادتی ہونے لگی۔ اس جہاد کو دنیا کی دوسری جنگوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام کا تصورِ جنگ

دوسری چیز، جسے سمجھنے کی ضرورت ہے، وہ ہے اسلام کا تصورِ جنگ۔ اگر یہ پیش نظر نہ ہو تو آدمی جہاد کو اسی طرح کی ایک عام جنگ سمجھ سکتا ہے جو بالعموم دنیا میں ہوتی رہتی ہیں اور ہر بڑی جنگ اپنے پیچھے اتنے عظیم نقصانات اور مصائب چھوڑ جاتی ہے کہ عرصہ تک اس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔

جنگ ایک خوف ناک مہم ہے، یہ خطرات سے گھری ہوئی زندگی ہے، اس میں جان و مال کا نقصان ہے، اہل وعیال، خویش و اقارب اور وطن سے دوری ہے، محاذِ جنگ کی ہول ناکی ہے، زخم، چوٹ، اعضاء و جوارح کی قطع و برید اور خون کی ارزانی ہے، اس وجہ سے انسان جنگ کے تصور ہی سے گھبراتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جنگیں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ سوال صرف ان کے مقاصد کا ہے۔ جنگیں ہوسِ اقتدار، ملک گیری اور فرماں روائی کی خواہش اور جذبہ انتقام کے تحت بھی ہوسکتی ہیں اور ہوئی ہیں۔ ان سے فساد فی الارض پھیلتا اور تباہی و بربادی آتی ہے۔ اس طرح کی کسی بھی جنگ میں شرکت یا تعاون اسلام کے نزدیک انسان کی دنیا اور آخرت دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔

اسلام نے جنگ کے سلسلے میں دو اقدامات کیے ہیں: ایک یہ کہ جنگ کو ایک بہت ہی اعلیٰ و ارفع مقصد کے تابع بنایا۔ اسے وہ 'جہاد فی سبیل اللہ' سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ جنگ جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے لڑی جائے۔ اس میں نقصانات برداشت کرنا، زخم اور چوٹ کھانا، جان دینا اور مال لٹانا سب کچھ کارِ ثواب ہے۔ اس میں جنگ کرنے والوں کی عزت و توقیر ہے، یہ ان کے بقا کی ضمانت اور ان

کے لیے باعث سربلندی ہے، خدا کے ہاں اس کا بے پایاں اجر وثواب ہے۔ قرآن مجید نے اسی 'جہاد فی سبیل اللہ' کا حکم دیا ہے۔ جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ یہاں صرف ایک حوالہ دیا جا رہا ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ○ وَ اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ○ (الصّف:۱۰-۱۳)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو کیا میں تمھیں ایسی تجارت کی نشان دہی کروں جو تمھیں درد ناک عذاب سے نجات دے۔ وہ یہ کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جنگ کرو۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ اللہ تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل کردے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور پاکیزہ مکانات عطا کرے گا، جو ہمیشہ رہنے والے باغات میں ہوں گے۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور دوسری وہ چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی دے گا۔ یعنی اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب میں حاصل ہونے والی فتح۔ اہل ایمان کو اس کی بشارت سنا دو۔

یہ ہے 'جہاد فی سبیل اللہ'۔ اس میں جان و مال کی بازی لگا کر آدمی اللہ کی طرف سے مغفرت اور اس کی نعمت بھری ابدی جنتوں کا مستحق ہوتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی مدد نازل ہوتی اور فتح و نصرت عطا ہوتی ہے۔

جنگ کے نقصانات کو بھی اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ 'جہاد فی سبیل اللہ' کے لیے ان نقصانات کو انگیز کرنے اور اس راہ کی دشواریوں کو برداشت کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اس لیے کہ یہ جہاد مقاصدِ خیر کے لیے ہے۔ اس میں نوعِ انسانی کی بھلائی ہے۔ اس کے پیچھے کسی قسم کے محرکاتِ شر اور فاسد جذبات نہیں ہوتے۔ یہی حقیقت ان آیات میں بیان ہوئی ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَ عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ:۲۱۶)

تم پر قتال (جنگ) فرض کیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناپسند ہے۔ شاید تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو اور (اسی طرح) شاید تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے حق میں بری ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ (کیا تمھارے حق میں بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے) اور تم نہیں جانتے۔

اس میں جنگ سے انسان کی طبعی گھبراہٹ اور خوف کا بھی ذکر ہے اور یہ وضاحت بھی کہ جنگ خیر کا باعث بھی ہوسکتی ہے، خیر کے لیے اس کی تلخیوں کو برداشت کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری نفس پر شاق گزرتی ہے، لیکن اسی سے دنیا اور آخرت کی کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں۔ یہی حال جنگ کا ہے۔ اس میں جان و مال کے خطرات اور نقصانات تو ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور نوعِ انسانی کی فلاح کے لیے تلوار اٹھانا اور اس کے لیے جان و مال کے نذرانے پیش کرنا انسان کی سب سے بڑی سعادت اور اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

امن کو ترجیح حاصل ہے

اسلام نے جنگ کو جہاد فی سبیل اللہ بنانے کے ساتھ دوسرا اقدام یہ کیا کہ جنگ پر امن کو ترجیح دی۔ جنگ کی اسی حالت میں اجازت دی ہے کہ امن و امان کے راستے بند ہوجائیں اور سوائے جنگ کے کوئی دوسرا راستہ کھلا نہ ہو۔ اسلام ایک دینِ دعوت ہے۔ وہ اپنے فکر کو عام کرنا چاہتا ہے۔ امن و امان کے ماحول میں اس پر سنجیدہ غور کرنے اور اس کے پھیلنے کے جتنے امکانات ہیں، حالت جنگ میں یہ امکانات کم تر ہوجائیں گے۔ اس لیے اسلام نے امن و امان اور صلح و آشتی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کی ہدایت ہے کہ دشمن مصالحت اور جنگ بندی کے لیے آمادہ ہو تو خدا کے بھروسے پر مصالحت کرلی جائے، تاکہ جنگ کی فضا ختم ہو اور اس کے نقصانات سے بچا جاسکے۔ احکامِ جنگ کے ذیل میں ارشاد ہے:

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ○ (الانفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس ذیل میں یہاں تک فرمایا گیا کہ دشمن اگر صلح کے نام پر فریب دینا بھی چاہے تو گھبرانے اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تمھاری مدد کرے گا۔ بہرحال صلح کی پیش کش ہو تو اس کا خیر مقدم ہونا چاہیے:

وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ○ (الانفال:۶۲)

وہ اگر تمھیں دھوکا دینا چاہیں (تاکہ اس مدت میں مزید جنگ کی تیاری کرسکیں) تو اللہ تمھاری مدد کے لیے کافی ہے۔ اس نے اپنی مدد سے اور مومنین کے ذریعے تمھیں تقوت پہنچائی ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید نے جنگ پر صلح کو ترجیح دی ہے۔ جہاں صلح کا امکان ہو وہاں وہ اسی کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے جنگ و صلح کی نزاکت کو بھی سامنے رکھا ہے اور تاکید کی ہے کہ ریاست اپنی خود داری اور وقار کا سودا نہ کرے۔ کم زوری کا اظہار کرنا اور ڈر کر اور دب کر صلح کی درخواست کرنا اور اس کے لیے ہاتھ پھیلانا ایک خود مختار ریاست کی عزت و آبرو کے منافی ہے۔ اس پس منظر میں کہا گیا ہے:

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ (محمد:۳۵)

پس تم کم زوری نہ دکھاؤ کہ صلح کی درخواست کرنے لگو۔ تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو۔

اسلام خدا پرستی کے لیے آزادی چاہتا ہے

اسلام خدا پرستی کا نام ہے۔ اسے وہ نوعِ انسانی کی فلاح و کام رانی کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی کی وہ دنیا کو دعوت دیتا ہے۔ اس کے لیے وہ دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ زور زبردستی یا جبر کے ذریعے اپنے خیالات کو مسلط نہیں

کرتا، بلکہ اسے وہ ناروا اور غلط قرار دیتا ہے۔ البتہ وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اسے قبول کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے اور عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ اس راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس لیے کہ عقیدہ کی آزادی انسان کا بنیادی اور فطری حق ہے۔ اس کے اس حق سے اسے محروم کرنا بدترین قسم کا ظلم ہے۔ اسلام نے اسی وقت جہاد کیا جب کہ اس کے ماننے والوں کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔

مشرکینِ عرب نے مسلمانوں کو عقیدہ کی آزادی نہیں دی

اسلام کی ابتدائی تاریخ ہی یہ ہے کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا، اہل مکہ ان کے جانی دشمن ہوگئے اور ان پر ناقابل برداشت مظالم توڑے جانے لگے۔ اس سے بچنے کے لیے بہت سے افراد کو اپنا گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑا اور حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ حالات اسی سمت میں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے، یہاں تک کہ نعوذ باللہ رسولِ خدا ﷺ کے قتل کے منصوبے تیار ہونے لگے۔ اسی اثنا میں اہل مدینہ کے نمائندوں نے خاموشی سے اسلام قبول کیا۔ ان کی دعوت پر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ جلد ہی مدینہ کی تقریباً پوری آبادی اسلام کے دائرے میں آ گئی۔ اب آپ کے ساتھیوں نے بھی مدینہ کا رخ کیا اور مہاجرین کا بے سر و سامان قافلہ مدینہ میں جمع ہونے لگا۔ یہ جن حالات سے گزر کر مدینہ پہنچے، تاریخ نے اس کا ریکارڈ محفوظ کر رکھا ہے۔ یہاں اس کا حوالہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ قرآن مجید نے بھی مختلف مواقع پر اس کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ تاریخ سے زیادہ مستند ہے۔ اس سے زیادہ صحیح تصویر کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ یہاں بعض اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے جارحانہ رویہ اور ناپاک عزائم کا بیان ایک جگہ چند لفظوں میں ہوا ہے، لیکن پوری تاریخ ان کے اندر سمٹ کر آ گئی ہے:

وَ اِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّـذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ وَ اللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ○ (الانفال:۳۰)	یاد کرو اس وقت کو جب کہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا تمھارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ تمھیں قید کر دیں یا قتل کر دیں یا تمھیں یہاں سے نکال دیں۔ وہ اپنی چال چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

ایک دوسرا بیان ملاحظہ ہو۔ خطاب منافین سے ہے:

اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی وَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ○ (التوبۃ:۴۰)	اگر تم رسول کی مدد نہ کرو گے (تو کوئی پروا نہیں، اللہ اس کی مدد کرے گا) اللہ نے اس کی اس وقت مدد کی ہے جب کہ کفر کرنے والوں نے اسے وطن سے نکال دیا تھا، جب کہ وہ دو میں سے ایک تھا، جب کہ دونوں غار میں پناہ لیے ہوئے تھے اور وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون نازل فرمایا اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور کفر کرنے والوں کے کلمہ کو پست کر دیا اور اللہ کا کلمہ تو ہمیشہ بلند ہی رہتا ہے۔ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو جن زہرہ گداز حالات سے گزرنا پڑا اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

..... یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِیَّاکُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ رَبِّکُمْ ..... (الممتحنۃ:۱)	وہ اللہ کے رسول کو اور تمھیں (اے مسلمانو!) اپنے گھروں سے نکال رہے ہیں (محض) اس وجہ سے کہ تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو جو تمھارا رب ہے۔
.....فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قَاتَلُوْا	.....پس وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جنھیں میرے راستہ

وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ (آل عمران:۱۹۵)

میں تکلیفیں پہنچائی گئیں، جو لڑے اور مارے گئے میں ضرور ان کی کوتاہیوں کو معاف کروں گا اور انھیں ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ ثواب ہے اللہ کی جانب سے اور اللہ کے پاس بہترین اجر و ثواب ہے۔

اموالِ فے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ يَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا وَّ يَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ۝ (الحشر:۸)

.....ان اموال میں ان محتاج اور نادار مہاجرین کا حصہ ہے جو اپنے گھروں سے اور اموال سے نکال دیے گئے۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کر رہے ہیں۔ یہ ہیں اپنے ایمان میں صادق۔

قرآن مجید کے ان بیانات سے ان حالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جن سے اہل ایمان مکہ میں گزر رہے تھے۔

مدینہ کی اسلامی ریاست پر جارحانہ حملوں کا جواب دیا گیا

ہجرت کے بعد مدینہ کی چھوٹی سی بستی نے ایک ریاست کی شکل اختیار کرلی اور اسلام کی تعلیمات پر عمل ہونے لگا۔ محض اس بنیاد پر کہ یہ چھوٹی سی ریاست اسلام کی بنیادوں پر قائم ہے اور وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اور اس کے احکام پر آزادی سے عمل ہو رہا ہے، مشرکینِ مکہ اس کے بدترین حریف بن گئے اور اسے ختم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں اہل مکہ سے جہاد کی اجازت دی گئی اور کہا گیا کہ مسلمانوں کو اب یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس جورِ مسلسل کا جواب دیں اور اپنا دفاع کریں:

اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيۡرُ ۝ الَّذِيۡنَ

اجازت دے دی گئی (جہاد کی) ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، اس لیے کہ ان

أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ

پر ظلم ہوا ہے اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، محض اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ (الحج:۳۹،۴۰)

اس ظلم کے خلاف اقدامات کے نتیجہ میں جنگِ بدر ہوئی اور جنگِ احد ہوئی۔ جنگ بدر میں مسلمان غالب رہے اور جنگِ احد میں انھیں شکست کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کے دو ہی سال بعد جنگِ احزاب ہوئی، جس میں یہود کے اکسانے پر آس پاس کے عرب قبائل کو ساتھ لے کر مشرکینِ مکہ، مملکتِ مدینہ پر حملہ آور ہو گئے۔ اس ہمہ جہت یورش کا سماں قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا○ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا○ (الاحزاب:۱۰-۱۲)

یاد کرو اس وقت کو جب دشمن تم پر چڑھ آئے تمھارے اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی اور جب نگاہیں پتھرانے لگیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے خیال کرنے لگے۔ اس وقت ایمان والے سخت آزمائش سے گزرے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔ یہی وقت تھا جب کہ منافقوں نے اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں روگ تھا، کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سب محض ایک فریب تھا۔

خانۂ کعبہ پر مشرکین کا ناجائز قبضہ

مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم روا رکھا وہ انسانیت کے چہرہ پر بدنما داغ ہے۔ اسے دنیا کا کوئی قانون جائز نہیں قرار دے سکتا۔ دوسری طرف کعبۃ اللہ پر ان کا قبضہ غاصبانہ تھا۔ قرآن مجید نے تفصیل سے بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، جو کعبہ کے بانی تھے، جن کے ہاتھوں سے اس کی تعمیر ہوئی تھی، وہ اللہِ واحد کے پرستار اور توحید

کے علم بردار تھے، وہ زندگی بھر شرک سے لڑتے رہے، اس کے لیے سخت اذیتیں برداشت کیں اور تکلیفیں اٹھائیں، وطن سے دور اپنی اولاد کو لاکر اس بے آب و گیاہ وادی میں آباد کیا، کعبۃ اللہ کو توحید کا مرکز بنایا۔ لیکن اہل مکہ نے، جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے براہِ راست نسلی تعلق تھا، ان کے درسِ توحید کو بھلا دیا، ان کی تعلیمات فراموش کردیں اور شرک میں مبتلا ہوگئے، کعبۃ اللہ کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا اور اس پر اپنا قبضہ اور تسلط قائم کرلیا۔

سنہ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے خانۂ کعبہ کی زیارت کرنی چاہی تو انھوں نے روک دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے صلح کی اور دس سال کے لیے ان سے ناجنگ معاہدہ کیا، لیکن جلد ہی اسے انھوں نے توڑ دیا۔ ان کے اس پورے رویہ نے اس بات کا جواز فراہم کر دیا کہ کعبۃ اللہ پر سے ان کا ناجائز قبضہ ختم کر دیا جائے۔ فتحِ مکہ نے اس کی راہ ہموار کردی اور وہ ازسرِنو سارے عالم کا مرکزِ توحید بن گیا۔

مشرکینِ عرب کا حکم

قرآن مجید نے مشرکین عرب اور دوسروں کے درمیان فرق کیا ہے۔ مشرکین سے اس نے براہِ راست خطاب کیا، شرک کا بے بنیاد ہونا ان پر ثابت کر دیا، انھیں توحید کی دعوت دی اور اس کے حق میں ناقابلِ تردید دلائل فراہم کیے۔ ان کے درمیان رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ آپؐ نے ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کردی۔ جب اس پر بائیس برس کی طویل مدت گزر گئی تو کہا گیا کہ اب مرکزِ اسلام لازماً شرک سے پاک ہوگا، اس میں کسی کو شرک پر قائم رہنے کی اجازت نہ ہوگی، وہ دعوتِ توحید کو قبول کرے، ورنہ اسلامی ریاست اس سے جہاد کرے گی، اس کے لیے کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

مشرکین عرب سے جنگ سے پہلے ان کے معاہدے منسوخ کیے گئے، باقاعدہ اعلانِ جنگ کیا گیا، انھیں چار ماہ کی مہلت دی گئی، اس کے بعد جنگ ہوئی[1] اس سلسلے کے

---

[1] اس کی تفصیل سورۂ توبہ میں موجود ہے۔

بعض احکام یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ انھیں اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ حکم ہے:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَo وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَ لاَ تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقَاتِلُوْکُمْ فِیْهِ فَاِنْ قَاتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ کَذٰلِکَ جَزَآءَ الْکٰفِرِیْنَo فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌo وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لاَ تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلاَ عُدْوَانَ اِلاَّ عَلَی الظّٰلِمِیْنَo

(البقرۃ:۱۹۰-۱۹۳)

تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑ رہے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ انھیں قتل کرو جہاں بھی پاؤ۔ انھیں وہاں سے (مکہ سے) نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا تھا۔ فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید چیز ہے۔ مسجد حرام کے پاس ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ خودتم سے جنگ نہ کریں۔ اگر وہ تم سے لڑائی چھیڑ دیں تو تم انھیں قتل کرسکتے ہو۔ ایسے کافروں کا یہی بدلہ ہے۔ اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو تم بھی ہاتھ روک لو۔ بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہوجائے۔ اگر وہ باز آجائیں تو یاد رکھو کہ ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی روا نہیں ہے۔

یہ آیات ایک ایسی صورت حال سے بحث کرتی ہیں جب کہ اسلامی ریاست حالتِ جنگ سے دوچار ہے اور میدانِ جنگ میں اسے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ یہاں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ ان سے کی جائے جو عملاً جنگ کر رہے ہیں۔ جب جنگ چھڑی ہوئی ہے تو دشمن پر وار کرنے یں کوئی پس و پیش اور تامل نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں کہیں بھی اس پر قابو حاصل ہو اسے تہہ تیغ کر دیا جائے، اس لیے کہ یہ ایک جنگی ضرورت ہے، اس کے بغیر جنگ جیتی نہیں جاسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی جان بڑی قیمتی ہے۔ کسی کی جان لینا بہت بری چیز ہے، لیکن اس سے بدتر چیز

’فتنہ‘ ہے۔ یہ جنگ اسی فتنہ کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ ’فتنہ‘ یہ ہے کہ آدمی کو اس کے عقیدہ پر قائم رہنے نہ دیا جائے اور محض اس کے عقیدہ کی وجہ سے اسے ظلم وستم کا نشانہ بنایا جائے۔ یہ مشرکین اسی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اب تمھارے لیے روا ہے کہ جس طرح انھوں نے تمہیں مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا اسی طرح تم بھی انھیں وہاں سے نکال دو، تاکہ یہ سرزمین اللہِ واحد کی اطاعت کے لیے خالص ہوجائے اور خانۂ کعبہ کی تعمیر جس پاک مقصد کے لیے ہوئی تھی وہ پورا ہو۔ یہ اللہ کا گھر ہے، اس کا احترام ضروری ہے۔ حالت جنگ میں بھی یہ احترام باقی رہنا چاہیے۔ جب تک دشمن اس کے حدود میں جنگ نہ شروع کرے اس وقت تک تم بھی جنگ سے کنارہ کش رہو۔ تمھاری طرف سے سبقت نہ ہو۔ ہاں اگر وہ حدودِ حرم کا بھی پاس و لحاظ نہ کرے اور اس میں جنگ چھیڑ دے تو تمھیں جواب دینے کا حق حاصل ہے۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ فتنہ کی بیخ کنی نہ ہوجائے اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ ہونے لگے۔

ان احکام کا تعلق خاص مشرکینِ عرب سے ہے۔ اس سلسلے کے اور احکام بھی ہیں۔ اسلام کے قوانین جنگ و صلح پر غور کرتے وقت یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان میں سے کن امور کا تعلق خاص مشرکینِ عرب سے ہے اور وہ کون سے احکام و ہدایات ہیں جو عمومی نوعیت کے حامل ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے عمومی احکام مشرکین عرب سے جنگ کے سلسلے میں بھی موجود ہیں۔ انہیں سیاق و سباق سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جہاد پر گفتگو کرتے ہوئے اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔

اسلامی ریاست کا دفاع اور تحفظ ضروری ہے

دنیا کی ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دفاع اور تحفظ کی طرف توجہ دے اور اس کا اہتمام کرے۔ اسلامی ریاست پر اگر جنگ مسلط کردی جائے اور اسے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے سے

روکنے کی کوشش ہونے لگے تو اسلامی ریاست اس کا مقابلہ کرے گی۔ مخالف قوتیں ایک ہوکر اسے مٹانے پر تل جائیں تو وہ بھی متحد ہوکر اس کا جواب دے گی۔ حکم ہے:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○ (التوبۃ:۳۶)

مشرکین سے تم سب مل کر لڑو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے لڑ رہے ہیں اور جان لو کہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اسلامی ریاست مخالف قوتوں سے بے خبر غفلت کی نیند نہیں سوئے گی، بلکہ اپنی حفاظت کا سامان کرے گی۔ دشمن ساز و سامان سے لیس ہے تو وہ بھی اپنی تیاری جاری رکھے گی۔ وہ جنگی لحاظ سے مضبوط ہوگی تو مخالف قوتیں جو سامنے ہیں ان پر بھی اور جو پس پردہ ہیں ان پر بھی دھاک بیٹھے گی اور وہ اس پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہ کرسکیں گے۔ اس پر جو سرمایہ اور دولت صرف ہوگی اس کا پورا اجر وثواب کل قیامت کے روز خدا کے ہاں ملے گا:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ آخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ○ (الانفال:۶۰)

ان کے مقابلے کے لیے، جہاں تک تم سے ہوسکے (جنگی) قوت (فراہم کرو) اور سدھائے ہوئے گھوڑے تیار کرو، جس کے ذریعے تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو خوف زدہ کرو۔ اس کے علاوہ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے، تمھارا رعب قائم رہے۔ تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کروگے، اللہ تعالیٰ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا اور تم پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

اس مقدس جنگ کے لیے وجہ جواز یہ تھی کہ باطل قوتیں طاغوت کا پرچم اٹھائے پھر رہی ہیں اور حق کو صفحۂ زمین سے مٹا دینا چاہتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کی جنگ حق و صداقت کی راہ میں ہے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس میں اللہ کے بندے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جان دے

رہے ہیں، اس لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے اور باطل کی ساری تدبیریں ناکام ہوں گی:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا۝ (النساء:۷۶)

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑ رہے ہیں اور جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ طاغوت کے راستہ میں لڑ رہے ہیں۔ تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو، بے شک شیطان کی تدبیر کم زور ہے۔

جنگ کے آداب

اسلام نے جنگ کے جو ضابطے بیان کیے ہیں، حالتِ جنگ میں، جب کہ دنیا حق و ناحق کو بھول جاتی ہے، جن اصول و قوانین کا پابند بنایا ہے اور عین محاذِ جنگ پر جن اخلاقی اقدار کی نگہ داشت کی ہدایت کی ہے، وہ دنیا کے قوانین میں ایک بے نظیر اضافہ ہے۔ ذیل میں ان اصول و آداب کی کسی قدر وضاحت کی کوشش ہوگی۔

جنگ ان سے کی جائے جو عملاً جنگ میں حصہ لے رہے ہیں اور ہر طرح کے ظلم و تعدّی سے احتراز کیا جائے۔ جو لوگ جنگ میں ملوث نہیں ہیں ان سے تعرض نہ کیا جائے اور شہری آبادیوں پر حملے نہ ہوں۔ غیر فوجی علاقوں کو نشانہ بنانا، عورتوں بچوں، بوڑھوں اور معذوروں کو ہدف بنانا صحیح نہیں ہے۔ جنگ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے ہو اور اس کے ساتھ کوئی دنیوی غرض وابستہ نہ ہو۔ یہ ساری باتیں ان چند الفاظ میں کہی گئی ہیں:

وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ۝ (البقرۃ:۱۹۰)

اور اللہ کے راستہ میں لڑو ان لوگوں سے جو تم سے لڑ رہے ہیں اور ظلم و زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

علّامہ ابو السعود اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ 'اللہ کے راستے میں جنگ کرو' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کو سربلند کرنے اور اس کے کلمہ کو اونچا کرنے

کے لیے جہاد کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی دوسرا مقصد نہ ہو۔ 'زیادتی نہ کرو' سے مراد یہ ہے کہ جنگ خود سے نہ شروع کرو، جو شخص تمھارے عہد و پیمان میں ہے اس سے جنگ نہ کرو، دین کی دعوت دیے بغیر ہی اچانک حملہ نہ کردو، مقتولین کا مثلہ اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی نہ کرو، عورتیں، بچے اور ان جیسے کم زور انسانوں کے قتل سے تمھیں منع کیا گیا ہے، اس کا ارتکاب نہ کرو[1]

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے:

نھٰی عن قتل النساء و الصبیان[2] آپؐ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا

اس کا پس منظر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ میں دیکھا گیا کہ مخالف کیمپ کی ایک عورت قتل ہوگئی ہے۔ آپ نے اس حرکت کو ناپسند کیا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا[3]

حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کوئی لشکر روانہ فرماتے تو اس کے امیر کو خاص طور پر تقویٰ کی اور ان مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کی نصیحت فرماتے جو جنگ میں شریک اور اس کے ماتحت ہیں۔ اس کے بعد فرماتے:

اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ قاتلوا من کفر باللہ اغزوا ولاَ تغلوا و لاَ اللہ کا نام لے کر اللہ کے راستہ میں جنگ کرو، لڑو ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ کا انکار کیا ہے۔ لڑو، خیانت نہ کرو، دھوکا اور فریب نہ دو،

---

[1] ابو السعود: تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم علی ہامش الرازی: ۲/۸۵

[2] بخاری، کتاب الجہاد، باب قتل النساء فی الحرب۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ عورت باقاعدہ جنگ میں شریک نہ ہو، لیکن اگر وہ قیادت کر رہی ہے یا حملہ آور ہے تو اس کا جواب دیا جائے گا۔ (ہدایہ: ۲/۵۴۲)

[3] مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب تحریم قتل النساء والصبیان۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی قتل النساء۔ ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی النہی عن قتل النساء والصبیان۔

تغدروا ولاَ تمثّلوا ولاَ تقتلوا وليدًا[1] کسی لاش کا مثلہ نہ کرو اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو۔

حضرت انسؓ کی ایک روایت میں آپؐ کی ہدایات ان الفاظ میں نقل ہوئی ہیں:

انطلقوا باسم اللّٰه و باللّٰه و علٰی ملة رسول اللّٰه ولاَ تقتلوا شيخا فانيا ولاَ طفلاً ولاَ صغيرًا ولاَ امرأة ولاَ تغلوا و ضموا غنائمكم و اصلحوا و احسنوا انّ اللّٰه يحب المحسنين[2]

جاؤ اللہ کا نام لے کر، اللہ کی مدد چاہتے ہوئے اور اللہ کے رسولؐ کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے۔ قتل نہ کرو کسی شیخ فانی کو، کسی بچہ کو، کسی کم سن کو اور کسی عورت کو۔ خیانت نہ کرو، اپنی غنیمتیں جمع کرو، اپنے معاملات ٹھیک رکھو اور حسن سلوک کرو، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت یزید بن ابو سفیانؓ کی قیادت میں لشکر روانہ فرمایا تو انھیں ہدایت فرمائی:

انک ستجد قومًا زعموا انهم حبّسُوْا انفسَهم لِلّٰه فذرهم وما زعموا من انهم حبسوا انفسهم له و ستجد قوما فحصوا عن اوساط رؤوسهم من الشعر فاضرب ما فحصوا عنه بالسّيف و انی موصيک بعشر لاَ تقتلن امراة ولاَ صبيا ولاَ كبيرًا هرمًا ولاَ تقطعن شجرًا مثمرًا ولاَ تخربن عامرًا ولاَ تعقرن شاة

تمھیں ایسے لوگ ملیں گے جو کہیں گے کہ انھوں نے خود کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگا رکھا ہے۔ ان (راہبوں) سے تعرض مت کرو۔ ان کے اس دعویٰ کو مان لو کہ وہ اللہ کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں۔ تمھیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جنھوں نے اپنے سر کے درمیانی حصے منڈوا رکھے ہوں گے۔ ان کے سر قلم کردو۔ میں تمھیں دس باتوں کی نصیحت کرتا ہوں: ہرگز کسی عورت کو، کسی بچہ کو اور کسی بوڑھے کھوسٹ کو قتل نہ کرو، کسی پھل والے درخت کو ہرگز مت کاٹو، اور کسی قابل کاشت زمین کو خراب مت کرو، کسی

---

[1] مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث الخ۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین۔ ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی وصية فی القتال

[2] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین

ولاَ بعیرًا اِلّا لمأکلة ولاَ تحرقن نحلاً ولاَ تفرقنه ولاَ تغلل ولاَ تجبن.[۱]

بکری یا اونٹ کو سوائے کسی غذائی ضرورت کے ذبح نہ کرو، ہرگز شہد کی مکھیوں کو جلا مت ڈالو، انھیں منتشر نہ کرو، خیانت نہ کرو اور بزدلی نہ دکھاؤ۔

یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ جنگ کن لوگوں سے کی گئی اور اس کے اسباب کیا تھے۔ صرف دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے حالتِ جنگ میں بھی کس قدر اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی ہے اور محاذِ جنگ پر بھی انسانیت کا کتنا احترام باقی رکھا ہے؟

موجودہ دور میں بم بار طیاروں، راکٹوں اور جدید ترین ہلاکت خیز اسلحہ کی ایجاد نے جنگ کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اب جنگ صرف محاذ جنگ تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ جنگ چھڑتے ہی اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ دشمن کو معاشی لحاظ سے تباہ کر دیا جائے، کارخانے اور فیکٹریاں ختم کردی جائیں، دفاعی صنعتوں کو ہدف بنایا جائے، حمل ونقل اور مواصلات کے ذرائع ناکارہ کردیے جائیں۔ یہ ساری چیزیں بالعموم محاذ جنگ سے دور اور شہری آبادیوں سے قریب ہوتی ہیں۔ ان حملوں کی زد میں جب یہ آبادیاں آتی ہیں تو مرد، عورتیں، جوان، بوڑھے، بچے، سب بغیر کسی امتیاز کے ان

---

[۱] مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، باب النہی عن قتل النساء والولدان فی الغزو۔ نصاریٰ کے جو سردار اس زمانہ میں سر کا درمیانی حصہ صاف رکھتے تھے انھیں شمّاسہ کہا جاتا تھا۔ زرقانی علی الموطا: ۲/۲۹۵ غالبًا یہ وہ دنیا دار سردار تھے جو مذہب کا لبادہ اوڑھے رہتے تھے۔ کہا گیا کہ راہبوں سے تو تعرض مت کرو، البتہ ان دنیا پرستوں کو مت چھوڑو۔

ان تعلیمات کے پیش نظر فقہاء نے کہا ہے کہ عورت، شیخ فانی، اپاہج، اندھے اور راہب پر میدانِ جنگ میں ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ ہاں اگر وہ جنگ میں براہِ راست حصہ لیں یا معاونت کریں تو مارے جاسکتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۱۴۰، ۱۴۱۔ اگر دشمن ان کم زور طبقات کو ڈھال بنا کر، حتی کہ کسی مسلمان کو آگے کر کے کوئی جنگی چال چلنا چاہے تو اس کا جواب ضرور دیا جائے گا۔ اسی طرح عورتیں اور بچے وغیرہ کسی عمومی حملہ کی زد میں آجائیں تو یہ جنگی مجبوری ہوگی۔ (ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۱۷۷-۱۸۰)

کا نشانہ بنتے ہیں اور موت کی نیند سو جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں وہ زہریلے ہتھیاروں کے استعمال کے اثرات سے محفوظ نہیں رہتے۔ جسمانی، دماغی اور نفسیاتی امراض کا بعض اوقات اس طرح شکار ہوجاتے ہیں کہ ان کی زندگی موت سے بدتر ہوجاتی ہے۔

اگر نوعِ انسانی کے ساتھ ہمدردی ہو اور جنگ کا بھی کوئی ضابطہ ہو تو اس سے ممکنہ حد تک بچا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض بین الاقوامی قوانین بھی ہیں، آئندہ اس طرح کے اور قوانین بھی وضع کیے جاسکتے ہیں۔ عام انسانی آبادی کی حفاظت کے لیے جو بھی قوانین وضع کیے جائیں وہ اسلام کے قوانینِ جنگ کے عین مطابق ہوں گے اور انھیں اسلام کی تائید حاصل ہوگی۔

☆☆

ذمیوں کے حقوق

اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو 'ذمی' کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کو اس قدر مسخ کیا گیا اور بھیانک بنا دیا گیا ہے کہ اس کے زبان پر آتے ہی مظلومی اور محکومی، محرومی اور مجبوری اور ذلت و رسوائی کا تصور ابھرنے لگتا ہے۔ یہاں اس کی براہِ راست تردید کی جگہ اسلامی ریاست میں ذمی کی صحیح حیثیت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے خود بخود یہ بات نکھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ ایک مسخ شدہ تصور ہے، جو اسلامی تعلیمات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا دو طرح کی ہوتی ہے: ایک ذمی اور دوسرے معاہد۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ یہاں پہلے اس کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔ جو ممالک جنگ کے بعد فتح ہوئے اسلامی ریاست نے ان کے باشندوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی، انھیں مذہبی آزادی عطا کی، ان کے مفتوح اور مغلوب ہونے کے باوجود ان کے قانونی حقوق متعین کیے اور ان سے لازمی فوجی خدمات نہیں لی گئیں۔ اصطلاح میں انھیں 'ذمی' کہا جاتا ہے۔ ان کو جو حقوق حاصل ہیں ان کے عوض ان سے جزیہ لیا جاتا ہے۔

جزیہ کے سلسلے میں رسولِ اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین کے ارشادات اور تعامل کی روشنی میں حسب ذیل اصول فقہاء نے بیان کیے ہیں:

۱- بیش تر فقہاء کے نزدیک جزیہ آدمی کی مالی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ سماج میں کم آمدنی والے بھی ہوتے ہیں، وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی آمدنی اوسط درجہ کی ہوتی ہے اور خوش حال افراد بھی ہوتے ہیں۔ کم آمدنی والے کا جزیہ اوسط آمدنی والے سے کم ہوگا اور خوش حال آدمی کا جزیہ اس شخص سے زیادہ ہوگا جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہو[1]

۲- جزیہ نقدی کی شکل میں وصول کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس مد میں زرعی پیداوار اور مویشی بھی لیے جاسکتے ہیں۔ موجودہ دور میں صنعتی پیداوار سے بھی جزیہ ادا کیا جاسکتا ہے[2]

۳- نابالغ بچہ، عورت، فاتر العقل (پاگل) فقیر، نادار، شیخ فانی، جسمانی طور پر معذور جیسے نابینا اور اپاہج وغیرہ سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح پادریوں اور راہبوں سے بھی نہیں لیا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ خود ہی دوسروں کی اعانت پر گزر بسر کرتے ہیں اور جزیہ ادا نہیں کرسکتے[3]

---

[1] جزیہ کی مقدار فقہ حنفی میں متعین ہے۔ اس میں حالات کے لحاظ سے تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ وہ یہ کہ جو غریب اور محنت کش ہے اس کے جزیے کی مقدار سالانہ بارہ درہم ہوگی اور متوسط طبقے کے فرد کا جزیہ چوبیس درہم اور خوش حال شخص کا اڑتالیس درہم ہوگا۔ الدر المختار مع رد المحتار۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں جزیہ کی یہی مقدار طے کی تھی، لیکن یہ کوئی مستقل ضابطہ نہ تھا۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں ان فقہاء کی رائے زیادہ قوی ہے جن کے نزدیک ریاست کو اس میں کمی بیشی کا حق حاصل ہے۔ اس کا تعین حالات کے لحاظ سے ہوگا۔ (ابن قیم، احکام اہل الذمّۃ: ج۱، ص۱۲۳-۱۲۸) اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے گا کہ جزیہ کی رقم ذمیوں کے کسی بھی طبقہ کے لیے مالی لحاظ سے بار نہ ہو۔ جزیہ سے بڑی بڑی رقم بالعموم بہ طور ٹیکس خوش دلی کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ صاحب حیثیت مسلمان پر زکوۃ فرض ہے، جو نقدین پر ڈھائی فی صد اور زرعی پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ ہے، یہ جزیہ کی رقم سے بہت زیادہ ہے۔ زکوٰۃ غیر مسلم پر نہیں ہے۔

[2] ابن قیم، احکام اہل الذمّۃ: ۱/ ۱۲۹-۱۳۱

[3] تفصیل کے لیے دیکھئے: ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۱۶-۲۲۱

معاہد وہ غیر مسلم ہیں، جن کے علاقے جنگ کے ذریعے فتح نہیں ہوئے، بلکہ وہ بعض شرائط کے ساتھ اسلامی ریاست میں شامل ہوگئے۔ یہ شرائط چوں کہ ریاست کے بنیادی اصول، مفاد اور اس کی سالمیت کے خلاف نہیں تھے، اس لیے ان کی بنیاد پر ان سے معاہدہ ہوگیا۔ جن شرائط کے تحت معاہدہ ہوا ان کی پابندی کی گئی۔[۱]

ذمی اور معاہد میں اس پہلو سے فرق ہے کہ ذمی کو اسلامی ریاست اپنی طرف سے حقوق دیتی ہے اور معاہد ریاست سے معاہدہ کے تحت اپنے حقوق کا تعین کرتا ہے۔ ہمارے علماء جب ذمی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو یہ دونوں طرح کے لوگ اس میں شامل ہوجاتے ہیں۔ علامہ ابن اثیر معاہد کے متعلق لکھتے ہیں:

المعاهد من كان بينك و بينه عهد و اكثر ما يطلق في الحديث على اهل الذمة و قد يطلق على غيرهم من الكفار اذا صولحوا على ترك الحرب مدة ما

معاہد وہ ہے کہ تمھارے اور اس کے درمیان عہد و پیمان ہو۔ حدیث میں اس کا زیادہ تر اطلاق ذمیوں پر ہوتا ہے۔ کبھی ان کے علاوہ یہ ان غیرمسلموں کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جن سے کسی مدت تک کے لیے جنگ بندی کی صلح ہوجائے۔

ذمی کی طرح معاہد پر کسی بھی نوع کی دست درازی کا کسی کو حق نہ ہوگا۔ علامہ ابن اثیر اس کے مال کی حیثیت بیان کرتے ہیں:

لِانه معصوم المال يجري حكمه مجرى حكم الذمي[۲]

اس لیے کہ اس کے مال کو عصمت اور حفاظت حاصل ہے۔ اس پر وہی حکم نافذ ہوگا جو ذمی پر نافذ ہوتا ہے۔

۱۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جو ممالک جنگ کے ذریعے فتح ہوئے وہاں کی زمین اور اموال مسلمانوں کی ملکیت ہوں گی۔ وہ ان کے لیے مالِ غنیمت ہیں۔ اس کے برخلاف جن قوموں سے صلح ہوئی ان کے ساتھ صلح کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ ان میں سے کوئی شخص مسلمان ہوجائے تو وہ حسبِ سابق اپنی زمین اور جائداد کا مالک ہوگا۔ (موطا، کتاب الجہاد، باب احراز من اسلم من اہل الذمہ)

۲۔ ابن اثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث: ۳/۱۴۱۔ مادّہ عہد

علامہ ابن اثیر نے معاہد کی تعریف اور اس سے جو عہد و پیمان ہوتا ہے اس کے بعض پہلوؤں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ معاہد کی اصطلاح حدیث میں زیادہ تر ذمی کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

ذمی کی تعریف

ذمی کے حقوق بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ متعین ہوجائیں اور اس کی روشنی میں اہل علم نے اس کی جو تعریف کی ہے وہ بھی واضح ہوجائے۔ اس سے خود بخود ثابت ہوجائے گا کہ یہ اصطلاح غیر مسلم رعایا کی تذلیل وتحقیر کے لیے وجود میں نہیں آئی ہے، بلکہ اس سے ان کے سلسلے میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری واضح ہوتی ہے:

ذمہ کے معنی عہد و پیمان، ضمانت، قابل احترام قول وقرار اور حق کے ہیں۔ اسی سے ذمی یا اہل ذمہ ماخوذ ہے۔ لسان العرب میں ہے:

سمّی اهل الذمة ذمة لدخولهم فی عهد المسلمین و أمانهم[1]

اہل ذمہ کو ذمی اس لیے کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد و پیمان اور امان میں وہ داخل ہیں۔

اسی ذیل میں کہا گیا ہے:

الذمة هی الاٗمان، لهٰذا سمّی المعاهد ذمیا لِانّه اعطی الاٗمان علٰی ذمة الجزیة التی توخذ منه[2]

ذمہ کے معنی امان کے ہیں۔ اسی وجہ سے معاہد کو ذمی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جو جزیہ اس سے لیا جاتا ہے اس کی بنیاد پر اسے امان دی گئی ہے۔

اسی کے مادہ سے 'ذمام' کا لفظ آتا ہے۔ اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

الذمام کل حرمة تلزمک اذا ضیّعتها المذمة و من ذٰلک یسمی اهل

'ذمام' ہر محترم چیز کو کہا جاتا ہے کہ اسے تم ضائع کردو تو قابل مذمت قرار پاؤ، اسی وجہ سے اہلِ عہد

---

[1] ابن منظور، لسان العرب مادہ 'ذمم'

[2] حوالہ سابق

العهد اهل الذمة.[۱]

کو اہلِ ذمہ کہا جاتا ہے (کہ ان کے حقوق کی عدم ادائیگی بھی قابل مذمت ہے)

دورِ جدید کے ایک مستند عربی لغت میں ہے:

الـذمی المعاهد الـذی اعطی عهد یأمن به علی ماله و عرضه و دینه[۲]

ذمی وہ شخص ہے جسے عہد و پیمان دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے مال، اپنی عزت و آبرو اور دین کے بارے میں محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ ذمی اسلامی ریاست کا وہ غیر مسلم شہری ہے جس کی جان، مال اورعزت و آبرو کی حفاظت کا وہ اس سے عہد کرتی ہے۔ اسی بنیاد پر اس سے جزیہ یا ایک متعین ٹیکس لیا جاتا ہے۔

اس عہد و پیمان کی اہمیت کا اندازہ حضرت عمرؓ کے ایک بیان سے ہوتا ہے۔ جب آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو آپ نے انتقال سے پہلے اپنے بعد منتخب ہونے والے امیر کو جو نصیحتیں کیں ان میں سے ایک ذمیوں سے متعلق تھی۔ فرمایا:

و اوصیه بذمة الله و ذمة رسولهﷺ ان یوفٰی لهم بعهدهم و ان یقاتل من ورائهم ولاَ یکلّفوا الا طاقتهم[۳]

میں اسے وصیت کرتا ہوں کہ ذمیوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو ذمہ دیا گیا ہے اس کی حفاظت کرے، ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کرے، ان پر حملہ ہو تو ان کے دفاع میں جنگ کرے اور ان پر اتنا ہی (جزیہ کا) بوجھ ڈالے جتنا کہ وہ اٹھا سکیں۔

یہ اس بات کی ہدایت ہے کہ اسلامی ریاست کا ذمیوں سے اللہ اور اس کے رسول کے نام پر ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کا پورا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ وہ ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔ اس ذمہ داری کو اسے ہر قیمت

---

۱ ابن منظور، لسان العرب، مادہ 'ذمم'
۲ المعجم الوسیط مادہ 'ذمم'
۳ بخاری، کتاب المناقب، باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمانؓ الخ مع عینی، عمدة القاری: ۱۲/ ۱۲۰

پر ادا کرنا ہوگا، حتیٰ کہ ان کے تحفظ کے لیے اسے دشمن سے جنگ کرنی پڑے تو اسے اس کے لیے بھی تیار ہونا چاہیے۔

ذمی کے حقوق

اسلامی ریاست میں ذمیوں کو جو حقوق حاصل ہوں گے، ان میں سے بعض بنیادی حقوق کا یہاں ذکر کیا جائے گا اور ان کے سلسلے میں جو فقہی اور قانونی بحثیں ماہرین شریعت کے درمیان رہی ہیں ان کا بھی کسی قدر تفصیل سے جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

ذمی کی جان کی حفاظت

اسلام کے نزدیک ہر انسان کی جان محترم ہے۔ ناحق کسی کی جان لینا اس کے نزدیک سنگین جرم ہے۔ ذمی کی جان کا احترام بھی لازم ہے۔ وہ شخص سخت گناہ گار ہے جس کے ہاتھ کسی ذمی کے خون سے رنگین ہوں۔ اسے جنت سے محرومی کی وعید سنائی گئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من قتل معاهدًا لم يرح رائحة الجنة و ان ريحها ليوجد من مسيرة اربعين عامًا[1]	جو کسی معاہد کو قتل کرے وہ جنت کی خوشبو (بھی) نہیں پائے گا، حالاں کہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک موجود ہوگی۔
من قتل معاهدًا فی غير كنهه حرم الله عليه الجنة[2]	جو شخص کسی معاہد کو بے بنیاد قتل کرے اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔

یہ وعیدیں ذمی پر دست درازی سے باز رکھنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ اس کے ساتھ اسلامی ریاست اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔ کوئی بھی شخص اس پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ البتہ ایک سوال یہ ہے کہ کیا

---

[1] بخاری، کتاب الدیات، باب من قتل ذمیا بغیر جرم

[2] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الوفاء للمعاہد وحرمۃ ذمتہ۔ نسائی، ابواب القسامۃ، باب تعظیم قتل المعاہد

اسلام کے نزدیک مسلمان اور ذمی کا خون از روئے قانون برابر ہے؟ کیا کوئی مسلمان ذمی کو قتل کردے تو وہ بھی اس کا مستحق ہوگا کہ اسے بھی قتل کر دیا جائے، یا اس معاملہ میں دونوں کے درمیان فرق ہے؟ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں صرف اصولی ہدایات دی ہیں، ان ہی سے اس مسئلہ میں راہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس نے قتلِ ناحق کی صریح ممانعت کی ہے اور مظلوم کی داد رَسی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلاَ تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلاَّ بِالحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَاناً فَلاَ يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْراًo

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر یہ کہ حق کا تقاضا ہو، جس شخص کا مظلومانہ قتل ہو ہم نے اس کے ولی کو قصاص کا حق دیا ہے۔ پس وہ قتل میں حد سے آگے نہ بڑھے۔ اس کی مدد ہوگی۔ (بنی اسرائیل:۳۳)

اسلام نے قاتل سے 'قصاص' کا حکم دیا ہے۔ 'قصاص' میں برابری اور مساوات کا تصور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کی جان برابر ہے۔ ان کے درمیان فرق نہیں ہوگا۔ مقتول چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، باحیثیت ہو یا بے حیثیت، اس کے عوض قاتل کی جان لی جائے گی، اس سے قطع نظر کہ وہ سماج کا ایک عام فرد ہے یا اس کی کوئی بااثر اور معزز شخصیت، اس لیے کہ اس نے قتل کے ارتکاب کی وجہ سے اپنی جان کی عصمت کھودی ہے[۱]

قرآن مجید کا حکم ہے:

يٰـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى

اے ایمان والو! مقتولین کے سلسلے میں تم پر 'قصاص' (مساوات) فرض کر دیا گیا ہے۔ (البقرۃ:۱۷۸)

اس حکم کی علت اور حکمت ان الفاظ میں بیان فرمائی:

---

[۱] یہاں قصاص پر گفتگو کو زیر بحث موضوع کی حد تک محدود رکھا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: 'تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث' مضمون: 'اسلام کا قانونِ قصاص'

وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓا اُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ (البقرۃ:۱۷۹) اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں بڑی زندگی ہے، تاکہ تم (اس طرح) قتل سے بچتے رہو۔

مطلب یہ کہ قانونِ قصاص پر عمل ہو تو قتل کا اقدام کرنے سے پہلے آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اس کے بعد اس کی زندگی بھی ختم ہوجائے گی۔ اس سے دونوں کی زندگی بچ سکتی ہے۔ کسی قوم میں قتلِ ناحق کی راہ کا مسدود ہونا اس کی حیات کا ذریعہ ہے۔ اس سے بے شمار انسانوں کی زندگی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اصول یہ بیان ہوا ہے:

اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ... (المائدۃ:۴۵) بے شک جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ.....

ذمی کا قصاص مسلمان سے

اس حکم کے دائرہ میں ذمی بھی آتے ہیں یا نہیں؟ اس کے معلوم کرنے کے لیے احادیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے:

لاَ يُقْتَلُ مُسلم بكافر[۱] مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:

لاَ يقتل مؤمن بكافر ولاَ ذو عهد في عهده[۲] مومن کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے اور نہ کسی معاہد کو جب تک اس سے معاہدہ ہے قتل کیا جائے گا۔

علاّمہ خطابی اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں:

۱۔ بخاری، کتاب الدیات، باب لایقتل مسلم بکافر

۲۔ ابوداؤد، کتاب الدیات، باب ایقاء المسلم بالکافر۔ نسائی، ابواب القسامۃ، باب سقوط القود من المسلم الکافر۔ مسند احمد، ج ۲ حدیث نمبر ۹۵۹، ۹۹۳۔ ابوداؤد میں یہ روایت ایک اور سلسلۂ سند سے بھی مروی ہے۔ دونوں حدیثیں حسن ہیں۔ فتح الباری: ۱۲/ ۲۶۱

فيه البيان الواضح المسلم لاَ يقتل باحد من الكفار كان المقتول منهم ذميا او معاهدا او مستامنًا او ما كان.[۱]

اس میں واضح بیان ہے کہ مسلمان کسی بھی کافر کو قتل کردے تو اس کے بدلے میں اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ چاہے مقتول ذمی ہو یا اس کا تعلق معاہد قوم سے ہو یا وہ دار الحرب سے امان لے کر آیا ہو یا اور کوئی ہو۔

ان احادیث کی بنیاد پر حضرت عمر بن عبد العزیز، امام اوزاعی، ثوری، ابن شبرمہ، امام شافعی، امام احمد، اسحٰق بن راہویہ اور ابوثور وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔[۲]

امام مالک کی رائے اس سے تھوڑی سی مختلف ہے۔ وہ یہ کہ ذمی کو مسلمان قتل کردے تو قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر وہ دھوکہ اور فریب سے اسے قتل کرتا ہے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔[۳]

دھوکہ سے قتل کی صورت یہ ہے کہ کسی بہانہ سے اسے کہیں لے جائے اور خاموشی سے قتل کردے۔ یہ فساد فی الارض (یا نقضِ امن و امان) ہے، اس وجہ سے مقتول کے اولیاء قاتل کو معاف بھی کردیں تو اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔[۴]

ذمی کے مسلمان قاتل سے قصاص نہ لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے کوئی دوسری سزا بھی نہیں دی جائے گی، بلکہ، جیسا کہ علامہ ابن حزم نے کہا ہے، قتل، خاص طور پر قتل عمد ہو تو اس کے خلاف تادیبی کاروائی ہوگی۔ قاتل کو قید و بند کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔[۵]

امام شعبی، ابراہیم نخعی، محمد بن ابی لیلیٰ، عثمان بتی، امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ: امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر کی رائے یہ ہے کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا جائے گا۔ اگر وہ ذمی کو قتل کردے تو اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ صحابہ کرام میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی بھی یہی رائے تھی۔[۶]

---

۱ خطابی، معالم السنن: ۴/۱۷ ۲ عینی، عمدۃ القاری: ۱۹/۳۴۹۔ ابن قدامۃ، المغنی: ۷/۶۵۲
۳ مؤطا، کتاب العقول، باب ماجاء فی دیۃ اہل الذمۃ ۴ شرح زرقانی علی المؤطا: ۴/۴۲
۵ عینی، عمدۃ القاری: ۱۹/۳۴۹ ۶ حوالہ سابق

ان حضرات کی ایک دلیل تو قرآن مجید کے یہ الفاظ ہیں: **النفس بالنفس** (جان کے بدلہ جان) ان میں مسلمان اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہو یا ذمی، دونوں کے لیے قصاص کا ایک ہی حکم ہے۔

جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ کافر کے قصاص میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے تو اس سے ذمی نہیں، بلکہ حربی کافر مراد ہے۔ یہی مطلب دوسری حدیث کا ہے کہ کسی مومن کو اور اسی طرح کسی معاہد کو جب تک اس کا عہد باقی ہے، حربی کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہاں معاہد کے مقابلہ میں کافر کا لفظ حربی کافر کے لیے آیا ہے۔ ظاہر ہے، جس سے جنگ ہے اس کا خون ایک مسلمان یا ذمی یا معاہد کے خون کے برابر نہیں ہوسکتا۔ حربی مباح الدم ہوتا ہے اور ذمی کو ریاست کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس معاملے میں وہ مسلمان کے برابر ہے[1]

دوسری بات یہ کہ ان روایات کے بالمقابل بعض اور روایات بھی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا گیا۔ یہ روایات سند کے اعتبار سے گو مقدم الذکر روایات کے پایہ کی نہیں ہیں، لیکن مجموعی طور پر استدلال کے قابل ہیں۔

دار قطنی وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ذمی کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا اور فرمایا:

انا اکرم من وفی بذمته[2] میں ان لوگوں میں سب سے زیادہ شریف ہوں جنھوں نے اپنا عہد و پیمان پورا کیا۔

حضرت ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے اہل حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو حضرت عمرؓ نے قصاص میں اسے بھی قتل کر دیا[3]

---

[1] فقہ حنفی کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے دیکھی جائے۔ ہدایہ: ۴/۵۵۹۔ فریقین کے دلائل اور ان کے ضعف و قوت کے جاننے کے لیے ملاحظہ ہو۔ خطابی، معالم السنن: ۴/۱۶-۱۹۔ فتح الباری: ۱۲/۲۶۱-۲۶۲۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۷/۱۵۲،۱۵۵

[2] یہ حدیث کم زور ہے۔ ملاحظہ ہو۔ زیلعی، نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ: ۴/۳۳۵،۳۳۶۔ نیز دیکھی جائے ابن حجر، فتح الباری: ۱۲/۲۶۲

[3] عبد الرزاق، المصنف: ۱۰/۱۰۱۔ زیلعی، نصب الرایۃ: ۴/۳۳۷

ایک اور روایت میں یہ تفصیل ہے کہ حضرت عمرؓ نے لکھا کہ قاتل کو مقتول کے اولیاء کے حوالہ کردیا جائے، چاہے وہ اسے قتل کریں یا معاف کردیں۔ چناں چہ اسے مقتول کے ولی کے حوالہ کر دیا گیا، جسے حنین کہا جاتا تھا۔ اس نے قاتل کو قتل کر دیا۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ بھی لکھا کہ اگر وہ قتل نہیں ہوا ہے تو اسے قتل مت کرو۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ مقتول کے اولیاء کو دیت پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ کے سامنے ایک مسلمان کو پیش کیا گیا، جس نے ایک ذمی کو قتل کیا تھا۔ جب قتل ثابت ہوگیا تو آپ نے قاتل سے قصاص کا حکم دیا۔ اتنے میں مقتول کا بھائی حاضر ہوا اس نے عرض کیا کہ میں نے اسے معاف کر دیا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ شاید ان لوگوں نے تمھیں ڈرایا دھمکایا ہے۔ اس نے کہا: نہیں۔ اس کے قتل کرنے سے میرا بھائی تو نہیں مل جائے گا۔ پھر یہ کہ انھوں نے مجھے اس کا معاوضہ بھی پیش کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: تم خود اپنے معاملہ کو سمجھ سکتے ہو۔ اس کے بعد حکمِ شریعت بیان کیا:

من کان لہٗ ذمتنا فدمہ کدمنا و دیتہ کدیتنا[1]	جسے ہمارا ذمہ ہے اس کا خون ہمارے خون کے برابر اور اس کی دیت ہماری دیت کے برابر ہے

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی ایک تحریر دیکھی جو حیرہ کے گورنر کے نام تھی۔ اس کا تعلق اس معاملہ سے تھا کہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنی تحریر میں لکھا کہ قاتل کو تم مقتول کے اولیاء کے حوالہ کردو۔ وہ چاہے اسے قتل کردیں یا معاف کردیں۔[2]

---

[1] اس کی سند میں ضعف ہے۔ امام شافعی نے معنوی لحاظ سے بھی اس پر تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے خود حضرت علیؓ نے اس کے خلاف روایت بیان کی ہے کہ مسلمان سے کافر کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ یہ بالکل صحیح حدیث ہے۔ کیا وہ آپؐ کے ارشاد کے خلاف فیصلہ کرسکتے ہیں؟ نصب الرایۃ: ۴/ ۳۳۷۔ لیکن جیسا کہ احناف نے توجیہ کی ہے، روایت کو حربیوں سے متعلق مان لیا جائے تو روایت اور عمل میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ [2] زیلعی، نصب الرایۃ: ۴/ ۳۳۷

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ اسلامی ریاست اگر یہ موقف اختیار کرتی ہے کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا جائے گا اور ذمی کے بدلہ مسلمان کو قتل کیا جائے گا تو یہ کم زور موقف نہ ہوگا۔ اس کے حق میں بھی اتنے ہی دلائل ہیں جتنے مخالف نقطۂ نظر کے حق میں ہیں۔

ذمی کی دیت

اسی طرح کی بحث ذمی کی دیت کے بارے میں بھی فقہاء کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں تین نقطۂ نظر ملتے ہیں[۱]

امام شافعی کے نزدیک ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کی تہائی ($\frac{1}{3}$) ہے۔ ان کی دلیل حضرت عبادہ بن صامتؓ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہے[۲]

حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں مسلمان کی دیت بارہ ہزار اور یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار مقرر کی تھی، مجوسی کی دیت اس سے بھی کم آٹھ سو درہم رکھی۔[۳]

امام احمد اور بعض دوسرے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کی نصف ($\frac{1}{2}$) ہے۔ اس کی دلیل عمرو بن شعیب کی روایت ہے۔ وہ اپنے باپ سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ ملاحظہ ہو خطابی، معالم السنن: ۴/۷ ۳۰۸،۳۰۔ ابن ہبیرہ، الافصاح: ۲/۲۱۱۔ ابن رشد، بدایۃ المجتہد: ۲/۶۶

۲۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۲/۵۵

۳۔ ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء لا یقتل مسلم بکافر۔ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۱۰/۱۰۰ تفصیل کے لیے دیکھی جائے زیلعی، نصب الرایۃ: ۴/۳۶۵۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۷/۲۲۱، ۲۲۲۔ حضرت عثمانؓ سے بھی یہودی اور نصرانی کی یہی دیت منقول ہے۔

دیة المعاهد نصف دیة الحر[1] معاہد کی دیت آزاد (مسلمان) کی دیت کی نصف ہے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

دیة عقل الکافر نصف دیة عقل المؤمن[2] کافر کی دیت مومن کی دیت کی نصف ہے۔

سنن نسائی کے الفاظ زیادہ واضح ہیں:

عقل الکافر نصف عقل المؤمن[3] کافر کی دیت مومن کی دیت کی نصف ہے۔

امام مالک اور بعض دوسرے اصحاب ان روایات کو ذمی اہل کتاب کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، اس لیے کہ یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

عقل اهل الذمة نصف عقل المسلمین و هم الیهود و النصاریٰ[4] اہل ذمہ کی دیت مسلمان کی دیت کے نصف ہے۔ اہل ذمہ یہود و نصاریٰ ہیں۔

ان حضرات کے نزدیک جن روایات میں کافر کا لفظ آیا ہے، یہ روایات بتاتی ہیں کہ اس سے اہلِ کتاب مراد ہیں۔ غیر اہلِ کتاب اس میں شامل نہیں ہیں۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مجھ تک حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے متعلق یہ روایت پہنچی ہے:

قضٰی ان دیة الیهود او النصرانی اذا قتل احدهما مثل نصف دیة انھوں نے فیصلہ فرمایا کہ یہودی اور نصرانی میں سے کوئی قتل ہوجائے تو اس کی دیت آزاد مسلمان

---

[1] ابو داؤد، کتاب الدیات، باب فی دیۃ الذمی۔ خطابی کہتے ہیں: **لیس فی دیة اهل الکتاب شیء ابین من هذا**۔ معالم السنن: ۴/۳۷۔ یعنی اہل کتاب کی دیت کے سلسلے میں اس سے زیادہ واضح اور کوئی روایت نہیں ہے۔

[2] ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء لا یقتل مسلم بکافر

[3] نسائی، ابواب القسامۃ، باب کم دیۃ الکافر

[4] حوالہ سابق، مصنف عبد الرزاق کی روایت ہے: **ان رسول اللهﷺ جعل عقل اهل الکتاب من الیهود و النّصاریٰ نصف عقل المسلم**، ۱۰۰/۹۲۔ ایک اور روایت میں ہے: **قضٰی ان عقل اهل الکتابین نصف المسلمین و هم الیهود و النصاریٰ**۔ دار قطنی، ص ۳۶۰۔

الحر المسلم[۱] کی دیت کی نصف ہوگی۔

مجوس کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ ان کی دیت آٹھ سو درہم ہوگی[۲] یہ اہل کتاب کی دیت سے بہت کم ہے۔ اسی کو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے اختیار کیا ہے[۳]

مشہور تابعی حضرت سلیمان بن یسار کہا کرتے تھے:

دیة المجوس ثمانمأة درهم مجوس کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔

امام مالک اسے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ہمارے ہاں اس پر عمل ہے[۴]

مجوس ہی کے حکم میں دوسری بت پرست قومیں بھی داخل ہیں[۵]

اس نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے امام شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ خیال کہ عمرو بن شعیب کی سند سے مروی حدیث میں اہل کتاب کا ذکر ہے، اس لیے ان ہی کی دیت نصف ہوگی، صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ کسی گروہ کا خاص طور پر ذکر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے گروہ اس میں شامل نہیں ہیں۔ حدیث کے الفاظ مختلف راویوں نے نقل کیے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے الفاظ عام ہیں۔ اس لیے اس میں اہل کتاب ہو یا مجوسی اسلامی ریاست کا ہر ذمی شامل ہے، سب کی دیت نصف ہوگی[۶]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی اس رائے کا ذکر آ چکا ہے کہ ذمیوں میں جو اہل کتاب ہیں، ان کی دیت مسلمان کی دیت کے نصف ہوگی۔ ایک روایت ان سے مجوس

---

۱ موطا، کتاب العقول، باب ماجاء فی دیۃ اہل الذمۃ، ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء لا یقتل مسلم بکافر ۲ دار قطنی، ص ۳۴۳

۳ احمد الدردیر مالکی فرماتے ہیں کہ کتابی ذمی ہو یا امان یافتہ حربی، دونوں کی دیت مسلمان کی دیت کی نصف ہے، مجوسی اور مرتد کی دیت $\frac{1}{15}$ ہے۔ سونا $\frac{2}{3}$ ۶۲ دینار یا چاندی آٹھ سو درہم یا اونٹ $\frac{2}{3}$ ۶۔ الشرح الصغیر علی اقرب المسالک: ۴/ ۳۷۶

۴ مؤطا، کتاب العقول، باب ماجاء فی دیۃ اہل الذمۃ۔

۵ ابن قدامہ، المغنی: ۱۲/ ۵۵-۵۶ ۶ شوکانی، نیل الاوطار: ۷/ ۲۲۳

کے متعلق بھی مروی ہے:

جعل دیة المجوسی نصف دیة المسلم[۱] انھوں نے مجوس کی دیت مسلمان کی دیت کی نصف رکھی۔

ہشام بن عروہؒ کہتے ہیں:

دیة الذمی خمس مأة دینار[۲] ذمی کی دیت پانچ سو دینار ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ اور امام ثوری کے نزدیک ذمی کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی دیت ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح کی رائے حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بھی ملتی ہے۔[۳]

ہدایہ میں فقہ حنفی کا مسلک ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

دیة المسلم والذّمی سواء[۴] مسلمان اور ذمی کی دیت برابر ہے۔

اس نقطۂ نظر کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَ اِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰی اَھْلِهٖ ...اگر مقتول کسی ایسی قوم کا فرد ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو پوری دیت دینی ہوگی۔ (نساء:۹۲)

اس سے واضح ہے کہ جس قوم سے میثاق اور عہد و پیمان ہے اس کے مقتول کی اسی طرح پوری دیت دی جائے گی، جس طرح ایک مسلمان مقتول کی دی جاتی ہے۔ بعض احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ عمرو بن امیہ ضمریؓ نے دو افراد کو، جن کے نام عامر تھے، قتل کر دیا۔ ان افراد کا رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ تھا۔ چناں چہ

---

۱ عبدالرزاق، المصنّف: ۱۰/ ۹۵

۲ حوالہ سابق

۳ المغنی: ۱۲/ ۵۱

۴ ہدایہ: ۴/ ۵۸۲

آپ نے ان کی وہی دیت ادا کی جو مسلمانوں کی دیت ہے[1]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ادا کی[2]

یعقوب بن عتبہ، اسماعیل بن محمد اور صالح فرماتے ہیں:

عقل کل معاھد من اھل الکفر کعقل المسلمین جرت بذٰلک السنة فی عھد رسول اللہ ﷺ[3]

اہل کفر میں سے ہر معاہد کی دیت مسلمانوں کی دیت جیسی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں یہی سنت رہی ہے۔

امام زہری فرماتے ہیں:

دیة الیھودی والنصرانی والمجوس و کل ذمی مثل دیة المسلم، قال و کذٰلک کانت علی عھد النبی ﷺ و ابی بکر و عمر......

یہودی، نصرانی اور مجوس کی اور ہر ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے مثل ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے عہد میں یہی معمول تھا۔

مزید فرماتے ہیں: اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے ذمی کی دیت نصف کردی[4]

امام زہری کی ایک اور روایت ہے۔

ان ابا بکر و عمر کانا یجعلان دیة الیھودی والنّصرانی اذا کانا معاھدین دیة الحر المسلم[5]

حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ یہودی اور نصرانی کی دیت، اگر وہ معاہد ہیں تو آزاد مسلمان کی دیت کے برابر قرار دیتے تھے۔

مصنف عبد الرزاق میں حضرت علیؓ سے منقول ہے:

دیة الیھودی و النصرانی و کل ذمی مثل دیة المسلم

یہودی اور نصرانی اور ہر ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب الدیات، باب ....، دار قطنی، کتاب الحدود والدیات وغیرہا، ص ۳۶۰

[2] دار قطنی، ص ۳۴۳

[3] عبد الرزاق، المصنّف: ۱۰/ ۹۷، ۹۸، زیلعی، نصب الرایۃ: ۴/ ۳۶۸

[4] عبد الرزاق، المصنّف: ۱۰/ ۹۵، ۹۶ [5] حوالہ سابق

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: 'وھو قولی' (یہی میری رائے ہے)[۱]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے:

دیة المعاھد مثل دیة المسلم[۲] معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے مثل ہے۔

یہ وہی بات ہے جو حضرت علیؓ نے کہی ہے۔[۳]

جن روایات سے مسلمان اور ذمی کی دیت کے یکساں ہونے کا ثبوت ملتا ہے ان میں گو کسی قدر ضعف ہے، لیکن مجموعی طور پر قابلِ استدلال ضرور ہیں۔ آثارِ صحابہ سے جہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض صحابہ نے ذمی کی دیت کو مسلمان کی دیت کا نصف یا اس سے کم کہا ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض دیگر صحابہ کے نزدیک ذمی اور مسلمان کی دیت برابر ہے، بلکہ بعض صحابہ سے دونوں طرح کی روایتیں منقول ہیں۔ اس کا ثبوت اوپر کے نقل کردہ اقوال سے ملتا ہے۔[۴]

ایک رائے یہ بھی ہے کہ گو ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے کم ہے، لیکن بطور تعزیر اس میں اضافہ کر کے مسلمان کی دیت کے برابر کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو عمداً قتل کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اس سے قصاص تو نہیں لیا، البتہ دیت میں اضافہ کر کے مسلمان کی دیت کے برابر اس پر دیت لازم کردی۔[۵]

امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں خالد بن مہاجر نے ایک ذمی کے قتل کا ارتکاب کیا تو انھوں نے بھی اسے قتل نہیں کیا، البتہ دیت میں اضافہ کر کے

---

۱ مصنف عبدالرزاق: ۱۰/ ۹۷

۲ حوالہ سابق۔ اس سلسلے کے مزید اقوال ص ۹۸ پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

۳ اس موضوع پر موافق اور مخالف رایوں کے لیے دیکھی جائے۔ بیہقی، السنن الکبریٰ مع الجواہر النقی: ۱۰/ ۱۰۰-۱۰۳

۴ عبدالرزاق، المصنف: ۱۰/ ۹۶

۵ حوالہ سابق

ایک ہزار دینار دیت مقرر کی۔[1]

ان دلائل کی بنا پر فقہ حنبلی میں گو ذِمی کی دیت کو مسلمان کی دیت کی نصف مانا گیا ہے، لیکن بطور تعزیر اس میں اضافہ کا جواز پایا جاتا ہے۔[2]

ان تفصیلات کے پیش نظر مسلمان اور ذمی کی دیت میں مساوات کی فقہ میں پوری گنجائش ہے، بلکہ اسے اس پہلو سے ترجیح حاصل ہے کہ یہ عدل و انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اسلامی ریاست اسے اختیار کرسکتی ہے۔

ذمی کے مال کی حفاظت

ذمیوں کی جان کی طرح ان کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اسلامی ریاست پر ہے۔ کسی کو ان کے مال پر قبضہ کرنے اور ان کی املاک اور جائداد سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ ہوگی۔ حضرت خالدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں جنگِ خیبر میں رسول اللہ کے ساتھ تھا۔ جنگ کے بعد یہود نے آ کر شکایت کی کہ لوگ ہمارے پھلوں اور غلوں پر ٹوٹ پڑے ہیں، جب کہ یہ چیزیں کھلے میدان میں نہیں، محفوظ جگہوں پر ہیں۔ یہود سے چوں کہ معاہدہ ہوچکا تھا اس لیے آپ نے فوراً ہدایت فرمائی:

الاَ لاَ یحلُّ اموال المعاھدین اِلّا بحقّھا[3] — سن لو، معاہدین کے اموال حلال نہیں ہیں الا یہ کہ ان کے لینے کا (ریاست کی طرف سے) حق ہو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک یہودی نے، جو بڑا شریر تھا، یہ شکایت کی کہ لوگ ہمارے جانوروں کو ذبح کر رہے ہیں، ہمارے پھل کھا رہے ہیں، عورتوں کے ساتھ مار پیٹ ہو رہی ہے۔ آپؐ نے اس کی شکایت پر توجہ فرمائی، لوگوں پر سخت ناراض ہوئے، انھیں جمع کیا، نماز پڑھی اور خطبہ دیا، جس میں فرمایا:

---

[1] عبد الرزاق، المصنّف: ۱۰/۹۶، نیز اس موضوع پر ملاحظہ ہو۔ نصب الرایۃ: ۴/۳۶۸

[2] ابن قدامہ، المغنی: ۱۲/۵۴

[3] ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب النہی عن اکل السباع

ان اللّٰہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الّا باذن ولاَ ضرب نسائھم و لاَ اکل ثمارھم اذا اعطوکم ما علیھم[1]	اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اہل کتاب کے گھروں میں بغیر اجازت داخل ہونے کو حلال نہیں قرار دیا ہے اور نہ ان کی عورتوں کو مارنے اور ان کے پھل کھانے کی اجازت دی ہے۔ جب کہ وہ اپنے اوپر جو واجب (جزیہ) ہے اسے تمھیں ادا کریں۔

حدیث میں یہاں تک آتا ہے کہ اگر کسی ذمی یا معاہد کا مال کہیں پڑا ہوا ملے تو مسلمان کے لیے اس پر قبضہ کرلینا جائز نہیں ہے۔ حضرت مقدام بن معدیکربؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الاَ لاَ یحل ..... اللُّقطة من مال معاھد الاَ ان استغنی عنھا[2]	سن لو، معاہد کے مال کا لُقطہ (جو چیز گر جائے) حلال نہیں ہے۔ ہاں اگر اس کی اسے ضرورت نہیں ہے تو اسے لے سکتے ہو۔

ذمیوں کی وہ چیزیں جنھیں مسلمان ناپاک تصور کرتا اور جن کے استعمال کو حرام سمجھتا ہے انھیں بھی وہ نقصان نہیں پہنچا سکتا، ورنہ فقہ حنفی کی رو سے اسے تاوان دینا ہوگا۔ شراب اور خنزیر اس کی دو مثالیں ہیں۔ فقہ حنفی کی رو سے اگر یہ کسی مسلمان کی ملکیت میں ہوں اور کوئی دوسرا مسلمان انھیں نقصان پہنچا دے یا ختم کردے تو اس کا کوئی تاوان نہیں ہے، اس لیے کہ یہ چیزیں ایک مسلمان کے نزدیک بے قیمت ہیں۔ لیکن اگر یہ کسی ذمی کی ہوں اور مسلمان انھیں نقصان پہنچائے تو اسے تاوان دینا پڑے گا، اس لیے کہ ذمی کے نزدیک ان کی قیمت ہے۔ اس کے نزدیک خنزیر کی حیثیت وہی ہے جو مسلمان کے نزدیک بکری کی ہوسکتی ہے، یا شراب ہے تو اسے وہ سرکہ کی طرح مباح اور قیمت والی چیز سمجھتا ہے۔[3]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الخراج والفی والامارۃ، باب فی تعشیر اہل الذمۃ

[2] ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب النہی عن اکل السّباع

[3] ہدایہ: ۳/۳۶۸

اسلامی ریاست شہریوں کے مالی حقوق کی محافظ اور نگراں ہے۔ ان حقوق پر دست درازی اور انھیں غصب کرنے کی وہ کسی کو اجازت نہ دے گی۔ کاروباری امور، قرض کے لین دین اور اس کے تمام معاملات میں کسی کے جائز حق کو ضائع ہونے نہ دے گی۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔ اس معاملہ میں اصولی ہدایت ہمیں عہد نبوی کے ایک واقعہ سے ملتی ہے۔

مسند احمد کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے رسول اللہ ﷺ سے ابن ابی حدرد نامی صحابی کی شکایت کی کہ انھوں نے اس سے چار دینار قرض لیے تھے، لیکن ادا نہیں کر رہے ہیں۔ آپ نے انھیں اس کا قرض ادا کرنے کے لیے کہا۔ انھوں نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دینِ حق دے کر بھیجا ہے، اس وقت میں قرض ادا کرنے کے موقف میں نہیں ہوں، آپ نے فرمایا تھا کہ ہمیں خیبر کی جنگ میں بھیجیں گے۔ مجھے توقع ہے کہ مالِ غنیمت میرے حصہ میں بھی آئے گا۔ اسی وقت قرض ادا کردوں گا۔ ان کی اس گزارش کو سن کر بھی آپ نے فرمایا: اس کا قرض ادا کردو۔ انھوں نے اپنا پہلا جواب دہرایا: آپ نے سہ بارہ قرض ادا کرنے کا حکم دیا۔ آپ کے تین مرتبہ کہنے کے بعد کسی کو جواب دینے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ چناں چہ ابن ابی حدرد اٹھے، بازار پہنچے ان کے جسم پر چادر اور سر پر عمامہ تھا۔ عمامہ کھول کر انھوں نے اسے تہہ بند بنا لیا اور چار دینار میں چادر فروخت کردی۔ ایک خاتون نے اس حال میں دیکھا تو اپنی طرف سے ایک چادر دی کہ اسے اوڑھ لیں۔

اس روایت کے ذیل میں علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

فیه التشدید علی المدیون بایجاب القضاء و عدم قبول دعواه الاعسار بمجردھا من دون بینة و عدم الاعتداء بیمینه من غیر فرق بین ان	اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ قرض دار پر قرض کی ادائیگی کے لیے سختی کی جائے گی اور بغیر دلیل کے اس کا محض یہ دعویٰ کہ وہ تنگ دست اور مجبور ہے، نہیں سنا جائے گا۔ اس کی قسم کا بھی

یکون صاحب المال مسلمًا او کافرًا ب[۱] کا بھی اس معاملہ میں اعتبار نہ ہوگا۔ قطع نظر اس کے کہ قرض دار مسلمان ہے یا کافر۔

اسلام میں چوری کی سزا "قطع یدٗ ہے (المائدۃ:۳۸)۔ چوری مسلمان کرے یا ذمی، مال چاہے مسلمان کا ہو یا ذمی کا، دونوں کی یہی سزا ہے۔ امام احمد، امام شافعی اور احناف سب کے ہاں مسلمان خواہ مسلمان کا مال چوری کرے یا ذمی کا، اسے قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح ذمی اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ بھی اسی سزا کا مستحق ہوگا۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں: اس معاملہ میں ہمارے علم میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[۲]

اسی طرح اس امر میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان اور ذمی کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو جائے اور وہ عدالت میں آئے تو اس کا تصفیہ عدل و انصاف کے مطابق ہوگا، تاکہ کسی پر بھی ظلم نہ ہو۔[۳]

اسلامی ریاست ذمی کو پورا مالی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ تاکہ وہ ہر خطرہ اور اندیشہ سے آزاد ہوکر پورے اطمینان کے ساتھ مالی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔

ریاستی امور میں ذمیوں کی خدمات

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں ذمیوں یا غیر مسلموں کو کوئی عہدہ و منصب حاصل ہوگا یا وہ اس کی کوئی خدمت کرسکیں گے؟ آج کل کی اصطلاح میں ملازمت کا حق حاصل ہوگا؟

یہ ایک فطری بات ہے کہ جو لوگ اسلام کو خدا کا نازل کردہ دین مانتے ہیں اور جنھیں اس کی صداقت پر ایمان و یقین ہے وہی اس دین کی بنیاد پر قائم ہونے والی

---

۱ شوکانی، نیل الاوطار: ۹ / ۱۸۲۔ قرض دار کو قید بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۲ ابن قدامہ، المغنی: ۱۲ / ۴۵۱

۳ حوالہ سابق: ۱۲ / ۳۸۳

ریاست کا نظم و نسق خلوص کے ساتھ چلا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں کو اسلام کی صداقت ہی میں شبہ ہو اور جو اسے اللہ کا نازل کردہ دین نہ مانتے ہوں، ان پر اسلامی ریاست کے چلانے کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی۔ وہ اس کے کلیدی مناصب کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان سے ہٹ کر دیگر ریاستی امور میں ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ایک رائے یہ ملتی ہے کہ ریاست کو ان سے کسی بھی طرح کا تعاون حاصل کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس پر قرآن مجید کی جن آیات سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لاَ يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالاً وَّدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ○

اے ایمان والو اپنے لوگوں کے سوا دوسروں کو رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہارے بگاڑ میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ وہ اس چیز سے خوش ہوتے ہیں جس سے تمہیں تکلیف پہنچے، ان کے منہ سے بغض و عداوت ظاہر ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے، ہم نے تمہیں اپنی آیات کھول کر بیان کردی ہیں۔ اگر تم عقل سے کام لو۔[1]

(آل عمران:۱۱۸)

اس آیت کے ذیل میں قاضی ابویعلی کہتے ہیں:

و فی هٰذه الاٰية دلاَلة علىٰ انهٗ لاَ يجوز الْاستعانة باهل الذمة فی امور المسلمين من العمَالاَت و الكتبة[2]

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ ذمیوں میں سے جو کاریگر اور محرر (وغیرہ) ہیں ان سے مسلمانوں کے معاملات میں مدد لینا جائز نہیں ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ایک

۱۔ یہ اور اس مفہوم کی دوسری آیات کے سیاق و سباق اور پس منظر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کی بحث 'غیر مسلموں سے عدم تعلق کے قرآنی احکام کا پس منظر'

۲۔ ابن جوزی: زاد المسیر :۱/۷ ۴۴

ذمی کو اپنا کاتب (منشی) مقرر کیا ہے تو انھیں سخت خط لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہمارے ماتحت رکھا ہے، تم انھیں فرماں روائی کا مقام دے رہے ہو۔[1]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ 'عاشر' یعنی وہ شخص جو عشر و خراج اور تجارتی ٹیکس وصول کرے، اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ غیر مسلم کو اس منصب پر (یا اس جیسے دوسرے منصب پر) فائز کرنا حرام ہے۔ اس کی دلیل میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی گئی ہے: وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً (النساء:۱۴۱) ''اور اللہ نے کافروں کے مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔''

اس کی تائید میں حضرت عمرؓ کا اسی طرح کا قول پیش کیا گیا ہے، جو ابھی گزر چکا ہے۔

امام محمدؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا کہ مشرکین میں سے کسی کو کاتب (منشی) نہ مقرر کرو کہ وہ مسلمانوں کے معاملات قلم بند کرے۔ اس لیے کہ وہ اپنے دینی کاموں میں رشوت لیتے ہیں اور ہمارے دین میں رشوت جائز نہیں ہے۔ امام محمد فرماتے ہیں کہ اسی پر ہمارا عمل ہے، سربراہِ مملکت کے لیے غیر مسلم کو کاتب مقرر کرنا ناجائز ہے۔[2]

حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کو کاتب کا عہدہ نہ دینے کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ رشوت خور ہیں۔ مسلمان اس دور میں اس کم زوری سے پاک تھے، اس لیے وہی اس کے مستحق سمجھے گئے۔ ورنہ ظاہر ہے کسی رشوت خور کو سرکاری عہدہ پر مامور نہیں کیا جاسکتا، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ عمومی استدلال شاید صحیح نہ ہو کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم کو کوئی اہم منصب نہیں دیا جاسکتا۔ وہ اگر دیانت و امانت سے متصف اور قابل اعتماد ہے تو اسے ذمے داری سونپی جاسکتی ہے۔

---

1. ابن الجوزی، زاد المسیر: ۱/ ۴۴۷۔ اس تنبیہ کا خاص پس منظر معلوم ہوتا ہے۔ اس کا حوالہ ہم آگے دیں گے۔ اس نقطۂ نظر کی مزید تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۴/ ۱۷۹

2. ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۵۰، ۵۱

جنگ میں غیر مسلموں کی شرکت

فقہاء کے درمیان ایک مسئلہ یہ زیر بحث رہا ہے کہ غیر مسلموں سے جنگی خدمات لی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ مشرکین سے مدد لینا مطلقاً صحیح نہیں ہے۔ ان ہی میں امام احمد بھی ہیں۔ ان کے نزدیک جن احادیث سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے ان کے مقابلہ میں وہ احادیث زیادہ قوی اور مستند ہیں، جن سے عدمِ جواز ثابت ہوتا ہے[1]

صحیح مسلم اور بعض دیگر کتب حدیث کی روایت ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بدر کی طرف روانہ ہوئے اور حرۃ الوبرہ نامی مقام پر پہنچے (جو مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے) تو آپ سے ایک شخص نے ملاقات کی، جس کی جرأت و ہمت اور مضبوطی و توانائی کا شہرہ تھا۔ مسلمان اس کی آمد پر خوش ہوئے۔ اس نے عرض کیا کہ میں اس جنگ میں آپ کے ساتھ شریک ہونا اور جو مال ملے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: انّا لا نستعین بمشرک (ہم کسی مشرک سے مدد حاصل نہیں کرتے) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دوبارہ الشجرہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی درخواست پیش کی۔ آپ نے اس سے وہی سوال کیا جو پہلے کیا تھا کہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے اب کی بار بھی نفی میں جواب دیا۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ ہم کسی مشرک سے مدد نہیں لیتے۔ اس کے بعد وہ مقام بیداء میں آپ کی خدمت میں پہنچا اور اپنی درخواست پیش کی۔ آپ نے اس بار بھی اس سے یہی سوال کیا کہ کیا تم خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہو۔ اس نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا اب تم ہمارے ساتھ چلو[2]

---

۱ زیلعی، نصب الرایۃ: ۳/ ۴۲۴۔ نیز قرطبی: الجامع لاحکام القرآن: ۴/ ۱۷۹

۲ مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب کراہۃ الاستعانۃ فی الغزو بکافر

اسی قسم کا ایک واقعہ مستدرک حاکم، مسند احمد، ابن ابی شیبہ اور اسحٰق بن راہویہ وغیرہ میں موجود ہے کہ حبیب بن اساف اور ان کے ایک ساتھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ ہماری قوم کسی جنگ میں شریک ہو اور ہم شریک نہ ہوں یہ ہمارے لیے باعثِ عار ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی شرکت کی اجازت دیجیے۔ آپ نے ان سے یہی سوال کیا کہ کیا تم اسلام لا چکے ہو؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: ہم مشرکین سے مدد نہیں لیتے۔ فرماتے ہیں: پھر ہم اسلام لے آئے اور جنگ میں شریک ہوئے[۱]

ایک طرف تو یہ روایات ہیں، دوسری طرف بعض اور روایات ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ نازک سے نازک معاملات میں بھی وقتِ ضرورت غیر مسلم کی خدمات اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ہجرت کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے مکہ سے ہجرت کی تو راستہ کی راہ نمائی کے لیے بنو الدیل کے ایک شخص کی خدمات اجرت پر حاصل کیں جو کافر تھا۔[۲] اس نے جاہلیت کے طریقے کے مطابق پختہ قسم کھائی کہ وہ اس سفر کو راز میں رکھے گا اور سفر میں راہ نمائی کرے گا۔[۳]

اس پر رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے اعتماد کیا اور اپنی اونٹنیاں اس کے حوالہ کردیں۔ تین دن کے بعد مکہ میں جب آپ کی تلاش کا ہنگامہ فرو ہوا تو وہ حسب وعدہ اونٹنیاں لے کر غارِ ثور کے پاس پہنچا اور آپ دونوں کو لے کر سمندر کے کنارے کے راستہ سے مدینہ پہنچا۔[۴]

۱۔ زیلعی، نصب الرایۃ: ۳/۴۲۳

۲۔ اس کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ راجح قول یہ ہے کہ اریقط نام تھا۔ فتح الباری: ۷/۲۳۸

۳۔ دورِ جاہلیت میں ہاتھ کو خون یا زعفرانی رنگ یا اسی طرح کی کسی چیز میں ملوث کر کے قسم پکی کی جاتی تھی۔ فتح الباری: ۷/۲۲۷

۴۔ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبیؐ و اصحابہ الی المدینۃ مع فتح الباری: ۷/۲۳۲-۲۳۸

اس حدیث کے ذیل میں علاّمہ بدر الدین عینی کہتے ہیں:

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین سے اگر وفاداری اور اعلیٰ اخلاقی جذبات کا مظاہرہ ہو تو ان پر رازداری کے معاملات اور مال کے سلسلے میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اس مشرک پر رسول اللہ ﷺ نے اعتماد فرمایا تھا۔ اس لیے کہ مشرکین گو کہ آپ کے دشمن تھے، لیکن دین ابراہیمی کی جو صالح روایات ان میں باقی رہ گئی تھیں ان کے وہ پابند تھے۔ (ان ہی میں ایک عہد و پیمان کا احترام بھی تھا)۔ چوں کہ اس شخص میں آپ نے اخلاق و مروت دیکھی تو سفر ہجرت کے خفیہ پروگرام کے سلسلے میں اس پر اعتماد کیا اور اپنی اونٹنیاں اس کے حوالہ کردیں کہ تین دن بعد وہ انھیں لے کر غارِ ثور پر پہنچ جائے۔ یہ مال کے بارے میں اس پر اعتماد تھا[1]

مکہ میں رسول اللہ ﷺ جب سخت ترین حالات میں گھر گئے، مخالفین نے آپ کے قیام کو ناممکن بنا دیا اور آپ کی شہادت کی تدبیریں کی جانے لگیں تو آپ نے ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔ یہ ایک بالکل رازدارانہ فیصلہ تھا۔ اس پر عمل درآمد کی راہ میں آپ نے ایک ایسے فرد کی خدمات حاصل کیں اور اسے اس کا معاوضہ بھی دیا، جو عقیدہ کے لحاظ سے دشمن قوم کا فرد تھا۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ سخت مخالف ماحول میں بھی ضرورت پڑنے پر قابل اعتماد غیر مسلم افراد کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تعاون ممنوع نہ ہوگا۔

اس واقعہ کا تعلق جنگ سے نہیں ہے، لیکن اس سے جنگی تعاون کے سلسلہ میں استدلال کرنا غلط نہ ہوگا۔ دونوں میں رازداری اور اعتماد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد بعض اوقات جنگی مہمات میں غیر مسلموں سے تعاون حاصل کیا ہے۔ اس وجہ سے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور بعض دوسرے ائمہ حالات کے لحاظ سے اسے جائز سمجھتے ہیں۔

جن ائمہ نے اسے جائز قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اسلامی ریاست کا سربراہ یا

---

[1] بدر الدین عینی، عمدۃ القاری: ۱۰ / ۷۳

حاکم دو شرائط کے ساتھ غیر مسلموں کو جنگ میں شرکت کی اجازت دے سکتا ہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہو اور ان سے مدد لینے کی ضرورت ہو۔ دوسرے یہ کہ جن سے مدد لی جائے وہ قابلِ اعتماد ہوں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ امام مالک کی یہ روایت کہ آپ نے ایک یا دو مشرکوں کی اس پیش کش کو رد فرما دیا کہ وہ جنگ میں شریک ہونا چاہتے ہیں، اس کا تعلق جنگِ بدر سے ہے۔ لیکن بدر کے چار سال بعد آپ نے جنگ خیبر کے موقعے پر بنو قینقاع کے یہود سے مدد لی اور جنگ حنین میں صفوان بن امیہ سے مدد حاصل کی، جو اس وقت مشرک تھے۔[1] بدر کے سلسلے میں جو واقعہ پیش آیا اس کے بارے میں دو باتیں کہی جاسکتی ہیں: ایک یہ کہ آپ کو کسی مشرک کو جنگ میں ساتھ لینے اور شریک کرنے یا نہ کرنے کا اختیار تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ساتھ لیا، دوسری مرتبہ نہیں لیا۔ یہ اختیار تو آپ کو مسلمانوں کے سلسلے میں بھی حاصل تھا۔ کسی مسلمان کو جنگ میں ساتھ نہ لے جانا چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ حدیثیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ آپ انھیں مشرک ہونے کی وجہ سے ساتھ نہیں لے گئے۔ اگر یہ ہے تو بعد کے واقعات کو ناسخ سمجھا جائے گا، جن میں آپ نے ان سے مدد لی تھی۔ غزوۂ بدر میں جس مشرک کو آپ نے لوٹایا ہوسکتا ہے آپ کے

---

[1] غزوۂ حنین کا واقعہ ہے کہ قبیلۂ ہوازن کے بارے میں آپ کو اطلاع ملی کہ وہ اور اس کے حلیف آپ کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ آپ نے بھی مقابلہ کی تیاری شروع کردی۔ اسی اثنا میں آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ صفوان بن امیہ، جو اس وقت تک مشرک تھے، کے پاس کافی ہتھیار ہیں۔ آپ نے ان کے پاس اپنا سفیر بھیجا اور فرمایا: اے ابو امیہ! آپ اپنے ہتھیار ہمیں عاریتاً دیں، تاکہ کل دشمن سے ہونے والی جنگ میں ہم فائدہ اٹھا سکیں۔ اس نے کہا کہ یہ ہتھیار غصب تو نہیں کر لیے جائیں گے۔ آپ نے اطمینان دلایا کہ یہ عاریتاً لیے جا رہے ہیں اور اس کی کمی کی تلافی ہوگی، اس نے کہا: تب تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چناں چہ اس نے آپ کو سو (۱۰۰) زرہیں اور اس کے مناسب ہتھیار دیے۔ روایت ہے کہ آپ کی درخواست پر اس نے ان کے پہنچانے کا بھی نظم کیا۔ سیرۃ ابن ہشام: ۴/ ۶۸

اس رویہ سے اس کے اسلام لانے کی توقع رہی ہو۔ بہرحال امام کو یہ حق ہے کہ مصلحت کے پیش نظر وہ کسی کو جنگ میں شرکت سے روک دے[۱]

مسلم کی روایت اِنَّا لاَ نَسْتَعِيْنُ بِمُشْرِکٍ (ہم کسی مشرک سے مدد نہیں لیں گے) کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں کہ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صفوان بن امیہ سے ان کے اسلام لانے سے قبل مدد حاصل کی تھی۔ علماء کے ایک طبقہ نے پہلی حدیث کو اس کے اطلاق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک کسی مشرک سے مدد لینا مطلقاً صحیح نہیں ہے، لیکن امام شافعی اور دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ اگر کافر مسلمانوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو اور ضرورت کا تقاضا ہو کہ اس سے مدد لی جائے تو مدد لی جائے گی۔ بلا ضرورت یہ ناپسندیدہ ہے۔ اس طرح دونوں حدیثیں دو مختلف صورتِ حال پر محمول ہوں گی[۲]

امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

احناف کا مسلک یہ ہے کہ مشرکین سے جنگ میں (ان کے مخالف) مشرکین سے مدد لی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے گی کہ جنگ کے بعد اسلام کے احکام کا غلبہ ہو، لیکن اگر مشرکین کے غلبہ کا اندیشہ ہو تو ان سے مدد نہیں لی جائے گی۔ ایسی صورت میں مسلمان ان کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کریں گے۔ سیرت و مغازی کی مشہور روایات ہیں کہ جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کبھی یہود رہے ہیں اور کبھی مشرکین کا ساتھ رہا ہے۔ باقی رہا اس روایت کا معاملہ جس میں آپ نے فرمایا کہ ہم کسی مشرک سے مدد نہیں لیتے تو ہوسکتا ہے کہ یہ بات خاص اس شخص سے متعلق ہو۔ ممکن ہے آپ نے اسے جاسوس خیال فرمایا ہو۔ آپ کے انکار کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس جیسے آدمی سے مدد نہیں لیتے[۳]

۱۔ زیلعی، نصب الرایۃ لاحادیث الہدایۃ: ۳/ ۴۲۴، نیز ملاحظہ ہو: ابن الہمام، فتح القدیر: ۴/ ۳۲۷

۲۔ نووی، شرح مسلم، ج ۴، جزء ۱۲، ص ۱۹۹ ۳۔ جصاص، احکام القرآن: ۲/ ۵۴۴

مالِ غنیمت میں غیر مسلموں کا حصہ

جن فقہاء کے نزدیک اسلامی ریاست غیر مسلموں سے وقتِ ضرورت فوجی خدمات لے سکتی ہے، ان کے درمیان یہ بحث رہی ہے کہ مال غنیمت میں مسلمانوں کی طرح ان کا بھی کوئی متعین حصہ ہوگا یا نہیں؟ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض اہلِ علم کے نزدیک اگر ذمی مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کرے تو بھی مالِ غنیمت میں اس کا کوئی (متعین) حصہ نہ ہوگا، لیکن بعض دوسرے اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں وہ بھی مالِ غنیمت میں حصہ دار ہوں گے۔ امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جن یہودیوں نے جنگ میں شرکت کی آپ نے انھیں بھی حصہ دیا تھا[1]

امام زہری کا یہ بیان ابوداؤد کی مراسیل میں بھی ہے۔ اس کے ایک راوی نے مثل سھمان المسلمین (مسلمانوں کے حصہ کی طرح) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابن ابی شیبہ کی روایت ہے **فیسھم لھم کسھام المسلمین**۔ یعنی نبی ﷺ جنگ میں شریک ہونے والے یہود کو مسلمانوں کی طرح حصہ دیا کرتے تھے[2]

بیہقی کی روایت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو قینقاع کے یہود سے مدد لی تھی۔ ان کو عطیہ دیا تھا، حصہ نہیں دیا تھا[3]

واقدی کا بیان ہے کہ غزوۂ خیبر میں آپ کے ساتھ مدینہ کے دس یہودی تھے۔ آپ نے مسلمانوں کے حصہ کی طرح ان کو بھی حصہ دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کو کچھ بطور عطیہ دیا تھا، باقاعدہ حصہ نہیں دیا تھا[4]

---

۱ ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی اہل الذمۃ یغزون مع المسلمین ہل یسہم لھم

۲ یہ روایتیں امام زہری سے مرسل ہیں، اہل علم نے امام زہری کے مراسیل کو ضعیف قرار دیا ہے۔ زیلعی، نصب الرایۃ لاحادیث الہدایۃ: ۳/ ۴۲۲، ۴۲۳

۳ اس روایت میں بھی ضعف ہے۔ حوالہ سابق

۴ حوالہ سابق

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"اگر کوئی غیر مسلم امام کی اجازت سے جنگ میں شرکت کرے تو اسے بطور عطیہ کچھ دیا جائے گا، باقاعدہ اس کا حصہ نہ ہوگا۔ یہی امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور جمہور کا مسلک ہے۔ امام زہری اور اوزاعی کہتے ہیں کہ ان کا بھی باقاعدہ حصہ نکالا جائے گا۔"[1]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ اگر ذمی جنگ میں شریک ہو تو اس کا حصہ (مالِ غنیمت میں) مسلمانوں کے حصہ کے برابر نہیں ہوگا۔ اسے بطور عطیہ جو دیا جائے گا وہ بہر حال کسی مسلمان کو ملنے والے حصہ سے کم ہوگا۔ ایک صورت یہ ہے کہ اگر وہ جنگ میں براہِ راست شریک نہیں ہے، لیکن اس نے اس سلسلے کی کوئی اور خدمت انجام دی ہے تو اسے اس کی اجرت دی جائے گی۔ یہ خدمت اگر اس نوعیت کی ہے کہ اس سے مسلمانوں کو زیادہ نفع پہنچ رہا ہے، مثلاً اس نے کسی خاص پہلو سے راہ نمائی کی ہے تو اسے جو اجرت دی جائے گی وہ مالِ غنیمت میں ملنے والے حصے سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔[2]

ان تفصیلات میں سب سے پہلے سفر ہجرت کا واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس سفر میں ایک غیر مسلم سے مدد حاصل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ سخت اسلام دشمنی کے ماحول میں بھی ایسے غیر مسلم افراد ہوسکتے ہیں جن پر پیش نظر اسلامی منصوبوں میں اعتماد کیا جاسکے۔ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ یہ اسلامی حکمت عملی کا ایک ضروری جزء ہے۔ اسی طرح احادیث اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں اور بیش تر مذاہب فقہ کی اسے تائید حاصل ہے کہ اسلامی ریاست غیر مسلموں سے جنگی خدمات حاصل کرسکتی ہے۔ جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ مالِ غنیمت میں جس طرح مسلمان سپاہیوں کا حصہ متعین ہے اس طرح غیر مسلم

---

[1] نووی، شرح مسلم، جلد ۴، جزء ۱۲، ص ۱۹۹

[2] ہدایہ مع فتح القدیر: ۴/۳۲۷۔ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۲۵

فوجیوں کا حصہ متعین نہیں ہے۔ لیکن بعض ائمہ کے نزدیک غیر مسلم فوجی کا بھی وہی حصہ ہوگا، جو ایک مسلم سپاہی کا ہوتا ہے۔ یہ بحث زیادہ اہم اس لیے نہیں ہے کہ موجودہ دور میں جنگی ٹیکنک اتنی پیچیدہ ہوگئی ہے کہ اس میں مالِ غنیمت کا سوال مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی گنجائش بہرحال فقہ میں پائی جاتی ہے کہ غیر مسلموں کی فوجی خدمات بالمعاوضہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔

تحصیلِ زکٰوۃ

ایک اور جزئیہ پر غور کیجیے:

اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اموالِ زکٰوۃ غیر مسلم پر صرف نہیں ہوں گے[1] لیکن زکٰوۃ کے جو مصارف بیان ہوئے ہیں ان میں اس کے عمّال اور کارندے بھی ہیں۔ اسے قرآن مجید نے 'وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا زکٰوۃ کی تحصیل اور تقسیم وغیرہ کے کام پر کسی غیر مسلم کو لگانا اور اسے اس کا محنتانہ دینا صحیح ہے؟ امام احمد بن حنبل سے ایک روایت ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ جس طرح اور کاموں پر اسے اجرت دی جاسکتی ہے اسی طرح اس کام پر بھی اسے اجرت دینا غلط نہیں ہے۔ مشہور حنبلی فقیہ علامہ خرقی کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے[2]

زکٰوۃ کا تعلق خاص مسلمانوں سے ہے۔ اس سے ہٹ کر دوسرے محاصل اور ٹیکس وغیرہ کی وصولی غیر مسلموں کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ خاص طور پر جزیہ یا جو خراج ان سے وصول کیا جاتا ہے اس کی وصولی کے لیے ان کے تعین میں بظاہر کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۴/۱۰۶

[2] حوالہ سابق: ۴/۱۰۷

ان تفصیلات کی روشنی میں موجودہ حالات کے پیش نظر غیر مسلموں کی خدمات اور ان کے حقوقِ ملازمت وغیرہ پر ازسرنو غور ہونا چاہیے۔

ذمیوں کی عبادت گاہیں باقی رہیں گی

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں غیر مسلموں کی بہت سی عبادت گاہوں کو توڑا اور انھیں منہدم کر دیا۔ اس کا تاریخی ثبوت فراہم کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس بحث سے ہٹ کر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر کسی فرد یا گروہ نے یہ حرکت کی ہے تو ایک ناروا فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی تعلیمات اس کے خلاف ہیں۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو جہاد کی پہلی مرتبہ جب اجازت دی گئی تو اس کی ضرورت اور حکمت ان الفاظ میں بیان ہوئی:

وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَ صَلَوَاتٌ وَّ مَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيراً وَّ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۝ (الحج:۴۰)

اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مساجد جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، سب منہدم کردیے جاتے اور اللہ ضرور مدد کردے گا ان لوگوں کی جو اس کی مدد کرتے ہیں۔ بے شک اللہ طاقت ور اور غالب ہے۔

مطلب یہ کہ جہاد کا حکم صرف مسلمانوں ہی کو نہیں دیا گیا، بلکہ ظلم و بربریت کو مٹانے کے لیے دوسرے انبیاء اور ان کی امتوں کو بھی دیا جاتا رہا ہے۔ اس پر اعتراض اللہ کے ان برگزیدہ بندوں اور ان کی تعلیمات پر اعتراض ہے اگر یہ حکم نہ ہوتا تو دنیا ظلم و جور سے بھر جاتی اور عبادت گاہیں تک محفوظ نہ رہتیں۔ اللہ کے دشمن اور اس کے باغی انھیں بھی مسمار کر کے چھوڑتے۔ اس لیے جب بھی ظلم حد سے آگے بڑھا اور ظالموں نے دین اور مذہب کی نشانیوں کو بھی ختم کر دینا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اہل حق کو ان کے خلاف صف آرا ہونے کا حکم دیا اور ان کے ذریعہ ظلم کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے گئے۔[1]

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۲/ ۷۰

اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان ہوا ہے کہ وہ ظلم وستم جو مشرکین کی طرف سے مسلمانوں پر ہو رہا ہے، اگر مسلمانوں کو اس کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی گئی تو زمین پر کوئی عبادت گاہ باقی نہیں رہے گی، یہودیوں کے معبد، نصاریٰ کے گرجا اور خانقاہیں اور مسلمانوں کی مساجد سب مٹا دی جائیں گی[1]

ان میں سے جو بھی مفہوم لیا جائے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عبادت گاہوں کا انہدام اسلام کے نزدیک سراسر ناروا اور ظالمانہ عمل ہے۔ وہ ان کے انہدام کا نہ صرف مخالف ہے، بلکہ وہ دوسری عبادت گاہوں کی بھی اسی طرح حفاظت چاہتا ہے، جس طرح مساجد کی حفاظت چاہتا ہے۔

فقہاء کے درمیان اس امر پر اتفاق ہے کہ کسی غیر مسلم علاقہ پر اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو وہاں غیر مسلموں کی جو عبادت گاہیں پائی جاتی ہیں انھیں منہدم نہیں کیا جائے گا، ان کی مرمت کی انھیں اجازت ہوگی اور ضرورت پڑنے پر وہ ان کی ازسرِنو تعمیر بھی کرسکتے ہیں۔ چناں چہ مسلمانوں نے بہت سے علاقے اور بہت سے شہر فتح کیے، لیکن وہاں کسی کلیسا یا کسی معبد کو مسمار کیا معنی نقصان بھی نہیں پہنچایا گیا۔

اس کے ثبوت میں ان عبادت گاہوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن کی تعمیر اسلامی فتوحات سے پہلے ہوئی تھی، جو ان کے بعد بھی صدیوں تک قائم رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو توڑنے یا انھیں مسمار کرنے کا ازروئے شرع کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ باقی رکھی جائیں اور اسلام کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ وہ باقی رکھی گئیں اور انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔

ایک سوال یہ ہے کہ یہ حکم صرف آسمانی مذاہب کی عبادت گاہوں کا ہے یا اس میں دوسرے مذاہب بھی آتے ہیں؟ سورۂ حج کی جو آیت اس بحث کے شروع میں آئی ہے اس میں 'صوامع'، 'بیع'، 'صلوات' اور مساجد کا ذکر آیا ہے۔ 'صوامع' جمع ہے۔ اس کا

---

[1] ماوردی، النکت والعیون: ۳/ ۸۴

واحد صومعہ ہے۔ اس کے معنی اونچی عمارت کے ہیں۔ یہ لفظ نصاریٰ کے راہبوں اور صابئین کے زاہدوں کی عبادت گاہ کے لیے بولا جاتا تھا۔ 'بیع' کا واحد بیعۃ ہے۔ یہ کلیسا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ 'صلوات' یہودیوں کی عبادت گاہ کو کہا جاتا ہے۔ 'صلوات' کا لفظ اہلِ عرب نے عبرانی کے صلوتا سے بنایا ہے۔ آخر میں مسلمانوں کی مساجد کا ذکر ہے۔

ان عبادت گاہوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل حق کے ذریعے ان کی حفاظت فرماتا ہے اور اب بھی فرمائے گا، ورنہ خدا کے باغی اور اس کے دشمن انھیں تباہ کردیں گے۔ اس سے بہت سے مفسرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آیت میں جن عبادت گاہوں کا ذکر ہے ان ہی کی حفاظت کا اس میں حکم ہے، دوسری عبادت گاہیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ ابن عطیہ کہتے ہیں:

"یہاں ان امتوں کی عبادت گاہوں کا بیان ہے جن کے پاس قدیم زمانہ سے آسمانی کتابیں رہی ہیں۔ مجوس یا مشرکین کا ذکر نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ان قوموں میں نہیں ہیں، جن کی حمایت واجب ہو اور صرف اہلِ شرائع ہی کے ہاں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے۔"[1]

لیکن ابو العالیہ نے 'صلوات' سے صابئین کی مسجد مراد لی ہے۔[2]

صابئہ کے پاس آسمانی کتاب کے ہونے کا قطعی ثبوت نہیں ہے، صرف اس کا امکان ہے۔ اس طرح کا امکان بہت سے قدیم مذاہب کے بارے میں بھی ہے۔ آیت میں مساجد کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسری عبادت گاہوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے۔ اس لیے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ ان سب میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۴/ ۱۷

۲۔ اس سلسلے میں سلف کی آراء کے لیے دیکھی جائے۔ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج۹، جزء ۱۷، ص ۱۲۵، ۱۲۶، طبع قدیم۔

بہر حال حضرت ابو العالیہ کی رائے کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی غیر اہل کتاب کی عبادت گاہ کے انہدام کی بھی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔

ابن خویز منداد کہتے ہیں کہ سورۂ حج کی آیت میں ذمیوں کے کلیسا، ان کی عبادت گاہیں اور ان کے آتش کدے منہدم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔[1]

اس سلسلے میں فقہاء نے بعض تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔

علاّمہ ابن قدامہ حنبلیؒ مسلمانوں کے شہروں کی قسمیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن شہروں پر مسلمانوں کا بزور قبضہ ہو ان میں غیر مسلم نئی عبادت گاہیں تو نہیں بنا سکیں گے، البتہ قدیم عبادت گاہوں کے بارے میں انھوں نے دلائل کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ باقی رہیں گی۔ اس سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے:

ايّما مصر مصّرته العجم ففتحه الله على العرب فنزلوه فان للعجم ما في عهدهم	جس شہر کو عجم نے آباد کیا اور اللہ تعالیٰ نے عربوں کو اس پر فتح نصیب کی اور وہ وہاں پہنچے تو عجم کی وہ چیزیں باقی رہیں گی جو ان کے عہد میں تھیں۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ 'کوئی عبادت گاہ، کوئی کلیسا اور کوئی آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے۔ علاّمہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ امت کا اس مسئلہ پر اجماع ہے، اس لیے کہ یہ عبادت گاہیں مسلمانوں کے شہروں میں رہیں اور کسی نے ان پر نکیر نہیں کی۔[2]

کیا ذمیوں کی نئی عبادت گاہیں تعمیر ہوسکتی ہیں؟

فقہاء کے درمیان یہ بحث ضرور رہی ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو اس کی اجازت ہوگی یا نہیں کہ وہ اپنی نئی عبادت گاہیں تعمیر کریں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شہروں میں انھیں اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت نہ ہوگی، خاص طور پر ان

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۲ / ۷۰

[2] ابن قدامہ، المغنی: ۱۳ / ۲۴۰

شہروں میں جنھیں مسلمان (اپنے مصالح اور ضروریات کے تحت) آباد کریں، جیسے کوفہ اور بصرہ، اس لیے کہ شہروں کی حیثیت اسلام کے تہذیبی مراکز کی ہے۔ البتہ قدیم شہروں میں ان کی جو عبادت گاہیں پہلے سے موجود ہیں وہ باقی رہیں گی، جیسے بغداد میں روم کا کلیسا۔

دیہاتوں میں یا جن علاقوں میں ذمیوں کی آبادیاں ہیں وہاں وہ اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرسکتے ہیں[1]

اگر کسی علاقہ کے لوگوں کی اسلامی ریاست سے اس بات پر صلح ہوجائے کہ پورے علاقے پر یا اس کے کسی ایک حصہ پر قبضہ ان کا رہے گا اور وہ خراج ادا کریں گے تو صلح کے مطابق زمین ان کی ہوگی اور وہ اس میں اپنی عبادت گاہیں اور گرجے تعمیر کرسکتے ہیں[2]

ان راویوں کے پیچھے اپنے دور کے سیاسی مصالح بھی ضرور ہوں گے، لیکن بہرحال یہ رائیں مذہبی آزادی کے تصور سے پوری طرح میل نہیں کھاتیں۔ اگر کسی شہر یا علاقہ کی حیثیت فوجی چھاؤنی کی ہے یا کچھ مخصوص سیاسی ضروریات کے تحت اس کی تعمیر ہوئی ہے تو اس کی نوعیت دوسری ہے، ورنہ آج کے دور میں، جب کہ زیادہ تر آبادیاں مخلوط ہیں اور بڑے شہروں میں متعدد مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ رہتے ہیں، اگر ان کا کوئی بھی گروہ اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنا چاہے تو اسے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ قرآن مجید یا کسی صحیح حدیث سے اس کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔[3]

☆☆☆

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ ہدایہ مع فتح القدیر: ۲/ ۵۷۷، ۴/ ۳۷۷، ۳۷۹۔
ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۳۹، ۲۴۰

[2] المغنی: ۱۳/ ۲۴۰

[3] اس سلسلے میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں ان کے ضعف کے لیے ملاحظہ ہو نصب الرایۃ ۳/ ۴۵۳، ۴۵۴

اسلامی ریاست اور بین الاقوامی تعلقات

بعض اوقات اسلامی ریاست کے بارے میں اس طرح کا تصور دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کا نفسِ وجود ہی غیر اسلامی ریاستوں کے لیے خطرہ کا باعث ہوگا۔ وہ کسی دوسری سیاسی طاقت یا ریاست کو برداشت نہیں کرے گی، بلکہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گی، جب تک کہ دوسری ریاستیں اقتدار سے محروم اور اس کے سامنے سرنگوں نہ ہوجائیں۔ وہ پوری دنیا پر حالتِ جنگ طاری کردے گی۔

یہ ایک بالکل غلط اور بے بنیاد خیال ہے۔ اس طرح کی صورتِ حال نہ تو ممکن ہے اور نہ یہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ سے ہم آہنگ ہے۔

جنگ ایک عارضی کیفیت

اسلام نے بین الاقوامی سطح پر جنگ کو نہیں، بلکہ امن کو تعلقات کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کوئی بھی ریاست جنگی حالات سے گزر سکتی ہے، لیکن جنگ کوئی مستقل حالت نہیں ہے۔ اس کا مستقل ہونا انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ یہ ایک عارضی کیفیت ہے، جو کبھی طاری ہو جاتی ہے۔ اسلامی ریاست اس کو دوام عطا کرنے کے لیے وجود میں نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان سے وعدہ ہے کہ وہ انھیں استخلاف فی الارض اور اقتدار عطا کرے گا۔ اس وعدہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ ۢبَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○ (النور:۵۵)

وعدہ کیا ہے اللہ نے تم میں کے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے کہ وہ ضرور انھیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے اس دین کو ان کے لیے اچھی طرح جمادے گا جسے اس نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ضرور ان کے خوف کو امن و امان سے بدلے گا، وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ اس کے بعد جو کوئی ناشکری کرے گا تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

اقتدار اور تمکین فی الارض کی غرض و غایت یہ بتائی گئی ہے کہ اہلِ ایمان کو امن کی حالت نصیب ہوگی اور وہ سکون کے ساتھ اللہِ واحد کی عبادت کرسکیں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی ریاست اپنے حدود کے اندر اور حدود سے باہر جنگ کے حالات پیدا کرنے کی جگہ امن کی فضا برپا کرنے اور اسے قائم رکھنے کی کوشش کرے گی۔ وہ امن کی طالب ہوگی نہ کہ جنگ کی خواہاں۔ وہ اضطراب اور بے چینی کے اسباب رفع کرے گی اور سکون کا ماحول فراہم کرے گی، تاکہ انسان ہر خوف سے آزاد ہوکر اللہ تعالیٰ کی بندگی کرسکے۔

عداوت ختم ہوسکتی ہے

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی کہ حالت جنگ میں بھی اس حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے کہ جو قوم یا مملکت آج اسلامی ریاست کی دشمن اور برسر پیکار ہے، ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس کی عداوت اور دشمنی برقرار رہے۔ حالات میں تبدیلی آسکتی ہے۔ آج کے دشمن کل دوست ہوسکتے ہیں، اس لیے ایسا رویہ نہ اختیار کیا جائے کہ پھر تعلقات کی بحالی ہی ناممکن ہوجائے اور دوستی کے تمام دروازے بند ہوجائیں۔ اس لیے فرمایا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَّاللّٰهُ قَدِيْرٌ وَّاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ (الممتحنۃ:۷)

قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت پیدا کردے، جن سے تم نے اب تک دشمنی کی ہے۔ اللہ (ہر چیز پر) قدرت رکھتا ہے اور غفور و رحیم ہے۔

یہ بات اس پس منظر میں کہی گئی ہے کہ مسلمان اہل مکہ کے ہاتھوں بے پناہ اذیتیں اور تکلیفیں مسلسل برداشت کرتے رہے تھے۔ اس لیے ان کے خلاف مسلمانوں کے اندر شدید جذبات کا پایا جانا غیر فطری یا ناممکن نہیں تھا۔ ان پر قابو پانا اور وہ بھی حالت جنگ میں، زیادہ دشوار تھا۔ ان حالات میں یہ خوش خبری سنائی گئی کہ اللہ نے چاہا تو بہت جلد یہ تاریک بادل چھٹیں گے اور حالات نیا رخ اختیار کریں گے۔ چناں چہ حالات نے کروٹ لی، دشمنیاں ختم ہوئیں اور محبت و الفت کے چراغ روشن ہوگئے۔ اس سے بین الاقوامی تعلقات میں اس کے رجحان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مستامن کے احکام

اسلامی ریاست حالت جنگ میں بھی، دشمن کے لیے آمد و رفت، تعلیم، تجارت اور سفارت جیسی سرگرمیوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھنا چاہتی ہے، تا کہ حریف ریاست کے افراد بھی اسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے عام رویہ کا مطالعہ کرسکیں۔ اس پر وہ اسی وقت قدغن لگاتی ہے جب کہ اس کے ملّی اور سیاسی مفادات خطرے میں ہوں۔ یہاں اس سلسلے کی بعض تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

محارب قوم، جس سے حالت جنگ قائم ہے، اس کا کوئی فرد اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے احکام کو سمجھنا چاہے تو حکم ہے کہ اس حالت میں بھی اسے اس کا موقع دیا جائے۔ وہ اسلامی ریاست میں آئے، اسلام کا، اس کی تعلیمات کا، اس کے اخلاق و قانون اور اس کی تہذیب و معاشرت کا اطمینان سے مطالعہ کرے اور اخلاص کے ساتھ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے اسے سہولتیں تو فراہم کی جائیں، لیکن اسلام

قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ اسلام کے اصولِ آزادی کے خلاف ہے۔ جو وقت اسے دیا گیا ہے اس کے ختم ہونے پر حفاظت کے ساتھ اسے اس کے وطن پہنچانے کا نظم کیا جائے:

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝ (التوبۃ:٦)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو، یہ اس لیے ہے کہ یہ علم نہیں رکھتے۔

علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ جن مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے ان ہی کے بارے میں یہ حکم بھی ہے کہ ان میں سے کوئی اسلام کو سمجھنے کے لیے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دی جائے۔ اگر وہ اسلام کو قبول نہ کرے تو بہ حفاظت اسے اس کے علاقہ میں پہنچا دیا جائے۔ اسلامی ریاست کا کوئی فرد اس سے (اس مدت میں) تعرض نہ کرے[۱]

علامہ ابوبکر جصاص نے اس آیت کے ذیل میں فقہ حنفی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی بحث سے حسب ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱- کوئی حربی ہم سے اس مقصد سے امان کا طالب ہو کہ قرآن مجید سنے، اس میں توحید و رسالت کے جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان سے واقف ہو اور اسلام کے دینِ حق ہونے کا علم حاصل کرے تو اسے امان دینا جائز ہے۔

۲- کوئی غیر مسلم ہم سے اگر یہ مطالبہ کرے کہ دلیل کے ذریعے اس پر حجت قائم کی جائے اور توحید و رسالت کے دلائل واضح کیے جائیں، تاکہ اس بنیاد پر اس کا اعتقاد ہو تو ان دلائل کا فراہم کرنا ہم پر واجب ہے، اس کے بغیر کسی کافر کو (جو کہ حربی ہے) قتل نہیں کیا جاسکتا۔

۳- جو حربی ہماری پناہ میں ہے، امام کی ذمہ داری ہے کہ اس کی حفاظت

---

[۱] طبری، جامع البیان: ۱۴/ ۱۳۸

کرے اور اس کے ساتھ کوئی غلط رویہ اختیار کرنے کی کسی کو اجازت نہ دے۔

۴- امام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ذمیوں کی حفاظت کرے اور اس کا اہتمام کرے کہ ان کو تکلیف نہ پہنچے اور ان پر ظلم نہ ہو۔

۵- کسی حربی کا دار الاسلام میں طویل مدت تک ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ اسے اتنی ہی مدت قیام کی اجازت ہونی چاہیے، جس میں اس کی ضرورت پوری ہوجائے 'حَتّٰی یَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ' کے الفاظ کا یہی تقاضا ہے۔ اس میں کلام اللہ کے سننے کے بعد اسے لوٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی بات ہمارے اصحاب (فقہاء احناف) نے کہی ہے کہ حربی کو دار الاسلام میں بغیر کسی عذر کے اور بغیر کسی ایسے سبب کے، جس کی بنا پر اس کا قیام ضروری ہو، قیام کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اسے واپس جانے کے لیے کہا جائے گا۔ اس کے بعد بھی وہ ایک سال قیام کرے تو وہ ذمی سمجھا جائے گا اور اس پر خراج لازم آئے گا۔[1]

علامہ قرطبی کہتے ہیں:

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ محارب قوم کا کوئی فرد قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے احکام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اسلامی ریاست سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دی جائے گی۔ سب کچھ سننے اور سمجھنے کے بعد وہ اسلام قبول کرلے تو یہ بڑی اچھی بات ہوگی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

ظاهر الاٰية انما هی من يريد سماع القراٰن والنظر فی الاِسلام فاما الاُجازة لغير ذٰلک فانما هی لمصلحة المسلمين والنظر فی ما تعود عليهم به منفعة[2]

آیت کا تعلق بظاہر اس شخص سے ہے جو قرآن مجید کو سننا اور اسلام پر غور وفکر کرنا چاہے۔ اس کے علاوہ جہاں تک کسی اور مقصد سے امان فراہم کرنے کا تعلق ہے تو اس میں مسلمانوں کی مصلحت کو سامنے رکھا اور ان کی منفعت کو دیکھا جائے گا۔

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۳/ ۱۰۳، ۱۰۴

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۸/ ۷۶

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے علاوہ کسی اور مقصد سے بھی محارب قوم کا کوئی فرد اسلامی ریاست میں آنا چاہے تو مسلمانوں کے مفاد کو دیکھا جائے گا، اس کا تقاضا ہو تو اسے اجازت دی جائے گی۔ جب تک وہ اسلامی ریاست میں ہے اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوگا اور ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے اور ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد اسے اس کی مملکت بعافیت پہنچنے کا نظم کرے۔

علاّمہ ابن قدامہ حنبلی نے اس موضوع پر مزید کچھ فقہی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ اس آیت کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص کلام اللہ کو سننے اور اسلامی شریعت کو جاننے کے لیے امان کا طالب ہو تو اسے امان دینا واجب ہے۔ پھر اسے اس کی منزل (ریاست) تک پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارے علم کی حد تک اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہی بات قتادہ، مکحول، امام اوزاعی اور امام شافعی نے کہی ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے یہی بات لکھ کر (اپنی مملکت میں) بھجوائی تھی۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے۔ سفیر، قاصد اور مستامن کے لیے عقدِ امان (عہد پناہ) جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ، مشرکین کے سفراء کو امان دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مسیلمہ کذاب کے سفیر آپ کی خدمت میں آئے تو آپؐ نے فرمایا: ''سفیروں اور قاصدوں کے قتل کا دستور نہیں ہے، ورنہ میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔'' یہ ایک ضرورت بھی ہے۔ اگر ہم ان کے قاصدوں کو قتل کریں گے تو وہ بھی ہمارے قاصدوں کے ساتھ یہی معاملہ کریں گے۔ پھر سفارت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔''[۱]

سفیر یا مستامن کے لیے عقدِ امان مطلق اور مقید دونوں طرح سے دیا جا سکتا

---

۱ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۷۹

ہے۔ یعنی مدت کی تعیین کے بغیر اور مدت کی تعیین کے ساتھ۔ مدت کی تعیین کم یا زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

اس طرح کے مستامن کے حقوق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام اوزاعی کے نزدیک صلح کی مدت کے دوران وہ بغیر جزیہ کے قیام کرسکتے ہیں۔''

مزید فرماتے ہیں: ''کوئی حربی دار الاسلام میں امان لے کر آجائے اور یہاں اپنا مال کسی مسلمان یا ذمی کے پاس رکھے یا انھیں قرض دے اور پھر تجارت، سفارت، سیر وتفریح یا کسی بھی غرض سے دار الحرب جائے اور وہاں سے واپس دار الاسلام آئے تو اسے جو سابق امان حاصل ہے وہ جاری رہے گی اور اس کے مال پر اس کا حق باقی رہے گا۔ یہ ایک لحاظ سے ذمی ہے۔ لیکن اگر وہ دوبارہ دار الحرب ہی کو وطن بنا لے تو جو امان دی گئی ہے وہ ختم ہوجائے گی، البتہ اس کا مال جو دار الاسلام میں ہے، محفوظ رہے گا۔ اگر وہ دارالحرب میں طلب کرے تو اسے بھیج دیا جائے گا۔ اس میں بیع، ہبہ یا اور کوئی تصرف کرنا چاہے تو کرسکے گا۔ دار الحرب میں اس کا انتقال ہوجائے تو وہ اس کے وارث کی طرف منتقل ہوجائے گا۔ لیکن امام ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں اس کا جو وارث ہے اسے اسلامی ریاست کی پناہ حاصل نہیں ہے، اس لیے وہ مال اس کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا۔''[1]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ مستامن کو دار الاسلام میں کاروبار کی اور اپنے پیسہ کو کارِ خیر میں خرچ کرنے کی اجازت ہوگی۔ جب تک وہ دار الاسلام میں ہے اس کی حیثیت ذمی کی ہے۔ دار الاسلام میں اس کا کوئی وارث نہیں ہے اور وہ اپنا پورا مال کسی مسلمان یا ذمی کے نام وصیت کردے تو وہ نافذ ہوجائے گی۔ وارث ہو تو ایک تہائی کی وصیت کرسکتا ہے۔ اگر وہ اپنے مال کے ایک حصہ کی وصیت کرے تو یہ بھی نافذ ہوجائے

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۸/ ۷۶

گی۔ باقی مال اس کے ان وارثوں کو، جو دار الحرب میں ہوں، لوٹا دیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک گو وہ ازروئے قانون وارث نہیں ہیں، لیکن یہ مستامن کا حق ہے کہ اس کا مال واپس کر دیا جائے۔ کوئی مسلمان یا ذمی اس کے نام وصیت کرے تو یہ بھی نافذ ہوگی[1]

معاہدات کا احترام

اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کے درمیان امن وَ امان اور صلح کے معاہدے ہو سکتے ہیں۔ یہ معاہدے جن شرائط کے ساتھ ہوں ان کی پابندی ضروری ہے۔

اسلام نے معاہدہ کی پابندی اور اس کے احترام کی سخت تاکید کی ہے۔ اس کے نزدیک معاہدے اس لیے نہیں ہوتے کہ موقع ملتے ہی ان کی خلاف ورزی ہونے لگے اور ادنیٰ مفادات پر انھیں قربان کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس کی ہدایات بہت واضح ہیں۔ ارشاد ہے:

.... وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۝ (بنی اسرائیل: ۳۴)

... اور عہد کو پورا کرو۔ بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

ایک اصولی ہدایت یہ دی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدۃ: ۱)

اے ایمان والو! عہدوں (پابندیوں) کو پورا کرو۔

وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ۝ (النحل: ۹۱)

..... اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد نہ توڑو جب کہ تم نے اپنے اوپر اللہ کو نگراں بنایا ہے بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

اہلِ ایمان کی تعریف کی گئی ہے کہ:

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ

وہ اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی نگہ داشت

---

[1] ہدایہ: ۴/۶۸۶۔ الدر المختار مع رد المحتار: ۵/ ۶۱۰، ۶۱۱

رَاعُوْنَ○ (المومنون:۸) کرتے ہیں۔

عہد و پیمان افراد کے درمیان بھی ہوتا ہے اور جماعتوں کے درمیان بھی۔ فرد اور ریاست کے مابین بھی ہوتا ہے اور بین الاقوامی سطح پر بھی۔ یہ ایک دوسرے پر اعتماد کا اظہار بھی ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ ہر عہد پورا کیا جائے اور ایک فریق نے دوسرے پر جو اعتماد کیا ہے اسے مجروح نہ ہونے دیا جائے۔

عہد شکنی پر وعید

دنیا میں افراد اور جماعتوں کے درمیان عہد و پیمان ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن جب کوئی فرد یا جماعت فریق ثانی کو کم زور دیکھتی ہے یا کوئی مادّی منفعت اس کے پیش نظر ہوتی ہے تو جھوٹے الزامات لگا کر یا مکر و فریب کے ذریعے بڑے سے بڑے عہد کو توڑ دیتی ہے۔ لیکن عہد شکنی اسلام کے نزدیک نفاق کی علامت ہے۔ مومن کا دامن اس سے پاک ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ نے منافق کی پہچان یہ بیان فرمائی ہے:

اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ[1] جب عہد و پیمان کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔

اسلام نے عہد شکنی کو جرمِ عظیم اور آخرت میں سخت رسوائی کا باعث قرار دیا ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لکل غادر لواء یوم القیامة یُریٰ یوم القیامة یُعرَفُ به[2] ہر دھوکا باز کے لیے قیامت کے روز ایک جھنڈا لگا دیا جائے گا جو نمایاں ہوگا اور جس سے وہ پہچانا جائے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی اسی مفہوم کی روایت آتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ، باب اثم من عاہد ثم غدر۔ مسلم، کتاب الایمان

[2] بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ، باب اثم الغادر للبر والفاجر۔ مسلم کتاب الجہاد، باب تحریم الغدر

لِکُلِّ غادر لواء ینصب لغدرته[1] — ہر دھوکا باز کے لیے ایک جھنڈا ہوگا جو اس کی دھوکا بازی کی وجہ سے نصب کیا جائے گا۔

یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

اِذَا جمع اللّٰہ الاوّلین و الاٰخرین یوم القیامۃ یرفع لکل غادر لواء فقیل ھٰذہ غدرۃ فلان بن فلان[2] — جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اگلے اور پچھلے لوگوں کو جمع کرے گا، ہر دھوکا باز کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں کا دھوکہ ہے۔

فوج میں عام طور پر سپہ سالار کے ہاتھ میں جھنڈا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے وہ سب میں نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔ عرب میں رواج تھا کہ اگر کوئی شخص عہد شکنی اور بے وفائی کرتا تو اس کے اعلانِ عام کے لیے کھلے بازار میں یا جہاں مجمع ہوتا اس کے نام کا جھنڈا نصب کر دیا جاتا، تاکہ لوگوں کو اس کے فریب اور عہد شکنی کا پتہ چل جائے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز، جب کہ ساری دنیا کے انسان جمع ہوں گے، دھوکہ باز اور عہد شکن کے نام کا جھنڈا لگا دیا جائے گا اور اعلان ہوگا کہ یہ فلاں بن فلاں غدّار اور بدعہد کا جھنڈا ہے۔ ان احادیث میں عہد شکنی سے متعلق جو وعیدیں آئی ہیں ان کا تعلق عام عہد و پیمان سے زیادہ سیاسی سطح پر کیے جانے والے عہد و پیمان سے ہے، اس لیے کہ حاکم وقت یا ریاست کی جانب سے جو عہد شکنی ہوتی ہے وہ زیادہ ضرر رساں ہوتی ہے۔ ان میں اس بات کی تاکید ہے کہ اسلامی ریاست کا حاکم اپنی رعیت سے، خواہ وہ غیر مسلم اور ذمی ہی کیوں نہ ہو، جو عہد و پیمان کرے اسے پورا کرے اور ان کے حقوق کی نگہ داشت میں کوئی کوتاہی نہ برتے۔[3]

اسلام نے جس طرح افراد کے درمیان یا ریاست اور شہریوں کے مابین ہونے والے معاہدوں کو اہمیت دی ہے، اسی طرح بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی اور احترام کی

---

[1] بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ، باب اثم الغادر للبر والفاجر۔ مسلم کتاب الجہاد، باب تحریم الغدر

[2] مسلم، حوالہ سابق

[3] نووی، شرح مسلم، ج ۴، جزء ۱۲، ص ۴۳، ۴۴

تاکید کی ہے، اس لیے کہ اس کے اثرات بہت دور رَس ہوتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی قوم بین الاقوامی معاہدات کو پامال کرتی ہے تو اپنی تباہی کو دعوت دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت دشمن کے غلبہ کی راہ ہموار کرتی ہے:

مَا ختر قوم بالعهد الاّ سلّط الله عليهم العدو[1] جب کوئی قوم عہد شکنی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ لازماً دشمن کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔

ریاستی عہد و پیمان یا نا جنگ معاہدے کو اسلام نے جو اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ہاتھوں غلطی سے قتل ہوجائے تو حکم ہے کہ قاتل ایک غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کرے، لیکن اگر مقتول کا تعلق محارب قوم سے ہو تو قاتل صرف غلام آزاد کرے گا، دیت نہیں دے گا۔ اس کے برخلاف مقتول معاہد قوم کا فرد ہو تو اس کے ورثاء کو دیت بھی دی جائے گی اور غلام بھی آزاد کیا جائے گا۔ (النساء:۹۱،۹۲)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، امام شعبیؒ اور امام نخعیؒ فرماتے ہیں کہ مقتول چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، دونوں کی دیت ایک ہوگی۔ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کا یہی مسلک ہے۔[2]

مشہور واقعہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں رسولِ اکرم ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان جو معاہدہ طے ہوا تھا، اس کی ایک شق یہ تھی کہ کوئی مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو اسے دوبارہ مکہ لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی مدینہ سے مکہ واپس چلا جائے تو اسے لوٹایا نہیں جائے گا۔ یہ دفعہ بہت سے صحابہ پر گوشاق گزر رہی تھی، لیکن اس کے باوجود معاہدہ پر دستخط ہوگئے۔ اس کے فوراً ہی بعد حضرت ابو جندلؓ بیڑیوں میں گھسٹتے ہوئے

---

[1] مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، باب ماجاء فی الوفاء بالایمان

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵/ ۲۱۰

حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ میرا حال دیکھ رہے ہیں، مجھے ان ظالموں کے درمیان واپس نہ بھیجئے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

انّا قد اعطینا هٰؤلاءِ القوم ما قد علمت ولاَ یصلح لنا فی دیننا الغدر و انّ اللّٰه جاعل لک و لمن معک من المستضعفین فرجًا و مخرجًا فانطلَق الیٰ قومِک[۱]

ہم نے ان لوگوں کے ساتھ جو عہد کیا ہے اسے تم جانتے ہو۔ ہمارے دین میں عہد شکنی اور بے وفائی درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اور تمھارے ساتھ مکہ میں جو کم زور رہ گئے ہیں، ان کے لیے کوئی صورت نکالے گا، لہٰذا تم اپنی قوم کے پاس واپس جاؤ۔

یہ اسلامی تاریخ کے روشن اوراق ہیں۔ بین الاقوامی معاہدہ کے احترام کی ایسی مثال کسی اور جگہ شاید ہی مل سکے۔

بین الاقوامی معاہدات کے سلسلے کی بعض اور ہدایات یہ ہیں:

۱- ممکن ہے کہ ایک قوم سے ریاست کا معاہدۂ امن ہو اور دوسری قوم کے ساتھ وہ حالتِ جنگ سے گزر رہی ہو۔ اس صورت میں محارب قوم کے افراد یا ان کا کوئی گروہ کسی ایسی ریاست میں پہنچ جائے، جس سے اسلامی ریاست کا معاہدہ ہے تو وہ محفوظ و مامون ہوں گے۔ وہ عملاً اس معاہدہ میں شریک سمجھے جائیں گے جو اسلامی ریاست کے ساتھ ہوا ہے۔ اس لیے ان کے خلاف بھی کوئی جنگی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔ احکامِ جہاد کے ذیل میں فرمایا کہ جب جہاد جاری ہے تو دشمن کا ہر جگہ مقابلہ کرو اور جہاں بھی پاؤ اسے قتل کردو۔ اس کے بعد ارشاد ہوا:

اِلَّا الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَهُمۡ مِّیۡثَاقٌ . . .

البتہ وہ لوگ جو کسی ایسی قوم کے پاس پہنچ جائیں، جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے (تو ان سے بھی جنگ نہ ہوگی)۔ (النساء:۹۰)

۲- اسلامی ریاست کا کسی ریاست سے معاہدہ ہو اور اس معاہدے میں تیسری

---

۱ ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۳/ ۳۷۴

ریاست شریک ہونا چاہے تو شریک ہوسکتی ہے۔ اسے اس کا اختیار ہوگا کہ وہ جس فریق کے ساتھ وابستہ ہونا چاہے، وابستہ ہوجائے۔ دونوں ان شرائط کے پابند ہوں گے، جن کا پابند ان کا حلیف ہے۔ حدیبیہ میں جو معاہدۂ صلح طے ہوا تھا، اس میں یہ دفعہ بھی شامل تھی کہ جو قبیلہ محمد ﷺ کا ساتھ دینا چاہے وہ آپ کا ساتھ دے گا اور جو قریش کی رفاقت پسند کرے، اسے اس کا حق حاصل ہوگا۔ چناں چہ اس پر قبیلۂ خزاعہ نے آگے بڑھ کر کہا کہ ہم محمد (رسول اللہ ﷺ) کے حلیف ہیں اور بنو بکر نے قریش کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔[1]

۳- کوئی ریاست غیر جانب دار رہنا چاہتی ہے، وہ جنگ میں اسلامی ریاست کا ساتھ دے رہی ہے اور نہ محارب قوم کا، تو اسلامی ریاست اس سے تعرض نہیں کرے گی۔ اسی بنیاد پر اس سے معاہدہ ہوسکتا ہے، ارشاد ہے:

.....اَوْ جَآؤُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوْكُمْ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا۝ (النساء:۹۰)

....یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل اس سے تکلیف محسوس کر رہے ہیں کہ تم سے جنگ کریں یا اپنی قوم سے لڑیں، اگر اللہ چاہتا تو انھیں تم پر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے ضرور لڑتے، اس لیے اگر وہ تم سے الگ رہ رہے ہیں اور لڑ نہیں رہے ہیں اور تم سے صلح کی پیش کش کر رہے ہیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر حملہ کی کوئی صورت نہیں رکھی ہے۔

مطلب یہ کہ جو لوگ یہ معاہدہ کرنا چاہیں کہ جنگ میں نہ تو وہ تمہارا ساتھ دیں گے اور نہ دشمن کا اس شرط پر ان سے معاہدہ کرلو۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ بھی تمہارے مقابلہ میں آجاتے، لیکن جب وہ اس سے کنارہ کش رہنا اور صلح کرنا چاہ رہے ہیں تو اس کا خیر مقدم ہونا چاہیے، اسے رد کرنا صحیح نہ ہوگا۔

---

[1] ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۳/ ۳۷۴۔ اس معاہدہ کا حوالہ آگے بھی آرہا ہے۔

معاہدہ کب ختم کیا جائے گا؟

معاہدہ کا دوسرا فریق اخلاص کا ثبوت نہ دے، اس کی طرف سے خلاف ورزی کے آثار ظاہر ہونے لگیں اور وہ سازش اور خفیہ تدبیریں کرتا ہوا محسوس ہو تو ریاست کو حق ہوگا کہ وہ معاہدہ کو ختم کردے، لیکن اس کا صاف صاف اعلان کرنا ہوگا۔ بغیر اعلان کیے اس کے خلاف کسی جنگی کارروائی کی اجازت نہ ہوگی:

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۝ (الانفال:۵۸)

اگر تمھیں کسی قوم سے خیانت کا خطرہ ہو تو تم (ان سے کیے گئے عہد و پیمان کو) ان کی طرف پھینک دو کہ معاہدے کے ختم ہونے کا تمھیں اور انھیں برابر علم ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

آیت میں 'فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ مشہور ماہر لغت ازہری کہتے ہیں:

المعنٰی اذا عاھدت قوما فخشیت منھم النقض فلا توقع بھم بمجرد ذٰلک حتّٰی تعلمھم.[۱]

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کرنے کے بعد تمھیں اس کے نقضِ عہد کا خدشہ لاحق ہوجائے تو محض اس خدشہ کی بنا پر اس پر حملہ نہ کردو جب تک تم اسے باخبر نہ کردو کہ معاہدہ ختم ہوگیا ہے۔

مطلب یہ کہ معاہدہ ختم ہو تو فریق ثانی اس سے بخوبی واقف ہوجائے، اس میں اسے کوئی شبہ نہ رہے۔ جس طرح تم پر یہ بات واضح ہے کہ اب معاہدہ نہیں رہا، اسی طرح اس پر بھی واضح ہوجائے۔

حضرت معاویہؓ اور رومیوں کے درمیان ایک مدت کے لیے معاہدۂ امن تھا۔ حضرت معاویہؓ ان کی سرکوبی کے لیے فوج لے کر روانہ ہوگئے اور یہ چاہا کہ جیسے ہی معاہدہ

---

[۱] ابن حجر، فتح الباری: ۶/ ۲۰۰

کی مدت پوری ہو، حملہ کر دیا جائے۔ اس اثناء میں ایک شخص اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا پہنچا اور کہا: اللہ اکبر! معاہدہ پورا کرنا ہوگا، دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ یہ حضرت عمرو بن عبسہؓ تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے: ''کسی قوم سے عہد و پیمان باندھا جائے تو جب تک مدت پوری نہ ہو، ہرگز اسے کھولا نہ جائے اور اس پر حملہ نہ کیا جائے، یا یہ کہ معاہدہ کو اس طرح ختم کر دیا جائے کہ فریقِ ثانی کو شک و شبہ نہ رہے اور ہماری طرح وہ بھی جان لے کہ معاہدہ ختم ہوگیا ہے۔'' اس حدیث کے سننے کے بعد حضرت معاویہؓ اس مہم سے لوٹ آئے[1] مدتِ صلح میں جنگ کے ارادہ سے حضرت معاویہؓ کے سفر کو حضرت عمر بن عبسہؓ نے معاہدہ کی خلاف ورزی قرار دیا۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ فریق ثانی کی طرف سے عہد شکنی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہوں، لیکن کھلم کھلا اس کا ارتکاب ہونے لگے اور مفادِ ریاست کے خلاف اقدامات شروع ہوجائیں تو سمجھا جائے گا کہ معاہدہ از خود ختم ہوگیا ہے۔ اب اسلامی ریاست اپنے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کی مجاز ہوگی۔ وہ اس کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کرسکتی ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد یہود سے معاہدہ کیا۔ اس معاہدے میں یہ بات شامل تھی کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان نصح و خیر خواہی کا تعلق ہوگا، ان میں سے کوئی بھی اپنے حلیف کو نقصان نہیں پہنچائے گا اور وہ دشمن کا مل جل کر مقابلہ کریں گے۔[3] لیکن یہود نے اس معاہدے کی صریح خلاف ورزی کی۔ جنگ بدر میں مشرکینِ مکہ کو ہتھیار فراہم کیے۔ جب معاہدہ یاد دلایا گیا تو معذرت کرنے لگے کہ اس معاملہ میں ہم

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الامام بینہ وبین العدو عہد الخ۔ ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی الغدر۔ مسند احمد: ۴/ ۱۱۲، ۳۸۱

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۸/ ۲۲

[3] اس معاہدے کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

سے چوک ہوگئی۔ دوبارہ معاہدہ ہوا، لیکن جنگ خندق میں دشمنوں کو جنگ پر آمادہ کیا اور حملہ آوروں کا ساتھ دیا[1]

جب اس طرح ایک سے دو مرتبہ ان کی طرف سے عہد شکنی کا مظاہرہ ہوا تو ان سے جنگ کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ○ اَلَّذِيْنَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ○ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ○ (الانفال:۵۵-۵۷)

بے شک اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ ہیں جو حق کا انکار کرتے ہیں اور اس پر ایمان نہیں لاتے، جن سے تم نے معاہدہ کیا اور وہ اپنا معاہدہ ہر بار توڑتے ہیں اور (اس کے نتائج سے) ڈرتے نہیں ہیں، پس اگر تم ان کو میدانِ جنگ میں پالو تو ان کو ایسی سزا دو کہ ان کے علاوہ جو اس ذہنیت کے لوگ ہیں وہ بھی محتاط ہوجائیں۔ شاید یہ نصیحت حاصل کریں۔

یہود کی ان سازشوں کے بعد معاہدے کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ انھوں نے اپنے رویہ سے ثابت کر دیا کہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے میں اسلامی ریاست حق بجانب ہے۔

بعض بین الاقوامی معاہدے

رسول اللہ ﷺ نے جو معاہدے کیے وہ کئی طرح کے ہیں۔ ان کی شرائط میں بھی حسبِ حال فرق رہا ہے۔ بعض میں صرف امن و صلح کی بات طے ہوئی ہے، بعض میں خراج اور جزیہ جیسے مالی معاملات شامل ہیں، بعض میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا فیصلہ ہوا ہے۔ یہاں ان میں سے چند ایک معاہدے پیش کیے جا رہے ہیں:

ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے پر رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مختلف قبائل کو ایک معاہدے کا پابند بنایا۔ اسی کے ساتھ آپ نے یہود سے بھی معاہدہ فرمایا۔

---

[1] رازی، التفسیر الکبیر: ۴/۳۹۰

دونوں معاہدے ایک ہی تفصیلی معاہدے کا حصہ تھے۔ یہود سے متعلق جو باتیں طے ہوئیں، اس کے بعض اجزاء یہ ہیں:

ان یهود بنی عوف امة مع المؤمنين	بنوعوف کے یہود (اسی میں دوسرے قبائل بھی شامل تھے) مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک قوم ہیں۔[1]
لليهود دينهم وللمسلمين دينهم	یہود کے لیے ان کا اپنا دین اور مسلمانوں کے لیے ان کا اپنا دین ہوگا۔
ان بطانة اليهود كانفسهم	یہود کے جن سے گہرے تعلقات ہیں وہ بھی ان ہی میں شمار ہوں گے۔
و ان على اليهود نفقتهم و على المسلمين نفقتهم و ان بينهم النصر على من حارب علٰى هٰذه الصحيفة و ان بينهم النصح و النصيحة والبردون الاُثم و انه لم يأثم امرء بحليفه و ان النصر للمظلوم.	یہود اپنا خرچ اور مسلمان اپنا خرچ برداشت کریں گے۔ جو شخص اس صحیفے میں شامل طبقات کے خلاف جنگ کرے گا اس کے مقابلے میں ان کے درمیان تعاون ہوگا۔ ان کے درمیان نصح و خیر خواہی کا تعلق ہوگا۔ نیکی اور حسن سلوک بدی کی راہ میں رکاوٹ ہوں گے۔ کوئی بھی شخص اپنے حلیف کے ساتھ غلط رویہ اختیار نہیں کرے گا۔ جو مظلوم ہوگا اس کی حمایت کی جائے گی۔
ان اليهود ينفقون مع المؤمنين مادامو محاربين.	جنگ کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی خرچ کریں گے۔
و ان يثرب حرام جوفها لِاَهل هٰذه الصحيفة	اس صحیفے میں شامل سبھی جماعتوں کے لیے مدینہ حرم ہوگا۔
و انهٗ مــا كان بين اهـل هٰـذه	اس صحیفے کے فریقوں کے درمیان کوئی بات

---

[1] اس کا مطلب، جیسا کہ علامہ ابو عبید قاسم بن سلام نے کہا ہے، یہ ہے کہ یہود کو جنگ کی حالت سے سابقہ پیش آئے تو مسلمان معاہدے میں مذکور شرائط کے تحت ان کا مالی تعاون کریں گے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے تو دونوں کے دین الگ ہیں، جیسا کہ بعد کے جملے سے واضح ہے۔ کتاب الاموال: ص۱۹۷۔

الصحيفة من حدث او اشتجار يخاف فساده و ان مردّه الى الله عزوجل و الٰی محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم.[1]	ہو یا اختلاف پیدا ہوجائے، جس سے بگاڑ اور فساد کا اندیشہ ہوتو معاملے کو اللہ عزوجل اور محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

یہودی آبادی انصار کی آبادی سے الگ تھی۔ یہود اہل کتاب تھے، اس لیے ان کے قوانین ملکی بھی بظاہر انصار کے قوانین سے الگ رہے ہوں گے۔ اس لحاظ سے اس معاہدہ کو بین الاقوامی معاہدہ کہا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف اس معاہدہ میں پورے مدینہ کو سب کے لیے حرم قرار دیا گیا ہے اور فریقوں کے درمیان اختلافات میں فیصلہ کا حق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو دیا گیا ہے۔ آپؐ نے اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے یہود کو مذہبی آزادی اور حقوق کی ضمانت دی ہے اور ریاست کے تحفظ کی ذمہ داری میں بھی انھیں شریک کیا ہے۔ اس پہلو سے اسے مختلف قبائل اور مذہبی گروہوں کے درمیان تعاون کا معاہدہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہود نے اس معاہدے کی پابندی نہیں کی، سازشوں میں لگے رہے اور ایک سے دو بار دشمن کا ساتھ دیا تو معاہدہ ختم کر دیا گیا اور ان سے جنگ ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں مدینہ کے حدود سے باہر نکال دینا چاہا تو انھوں نے درخواست کی کہ انھیں مدینہ ہی میں رہنے دیا جائے۔ وہ آپ کو اپنے کھیتوں اور باغوں کی پیداوار کا نصف ادا کرتے رہیں گے۔ آپ نے ان کی یہ درخواست منظور کرلی اور فرمایا: جب تک ہم چاہیں گے، یہاں تمھیں رہنے دیں گے۔ اس شرط کے ساتھ وہ مدینہ میں رہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں انھیں شام منتقل کر دیا۔[2]

اس معاہدہ کی نوعیت پہلے سے مختلف تھی۔

---

[1] ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۲/ ۱۱۹–۱۲۳۔ کتاب الاموال، ص ۱۹۵–۱۹۷

[2] بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب اذا قال رب الارض اقرک اقرک اللہ الخ۔ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ۔

ذی قعدہ سنہ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عمرہ کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے، لیکن حدیبیہ کے مقام پر مشرکین نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس پر آپ کے اور ان کے درمیان صلح ہوئی۔ اسے صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدۂ صلح کی بعض دفعات کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ بعض اور دفعات یہ تھیں:

فریقین کے درمیان دس سال کے لیے جنگ بندی رہے گی، تاکہ دونوں طرف کے لوگ امن کے ساتھ رہ سکیں۔ اس مدت میں ایک دوسرے کے خلاف کسی بھی جنگی اقدام سے احتراز کیا جائے گا اور کسی قسم کی خفیہ حرکت یا سازش نہیں ہوگی۔

محمد ﷺ اس سال حدیبیہ سے مدینہ لوٹ جائیں گے اور عمرہ نہیں کریں گے اور آیندہ آپ اور آپ کے ساتھی عمرہ کے لیے آئیں گے، صرف تین دن مکے میں قیام کرسکیں گے، وہ غیر مسلح ہوں گے، تلواریں نیام میں ہوں گی، کسی سوار کا جو ضروری سامان ہوتا ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز اس کے ساتھ نہ ہوگی۔

مکہ کے کسی فرد کو آپ اپنے ساتھ نہیں لے جاسکیں گے، البتہ آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو آپ اسے نہیں روکیں گے۔[1]

اس معاہدے میں بہ ظاہر فریقین کے درمیان مساوات نہیں ہے۔ قریش کے ناروا مطالبات بھی مان لیے گئے ہیں۔ اس وجہ سے بعض صحابہ اس سے ناخوش اور کبیدہ خاطر تھے۔ لیکن اس وقت مصالح کا یہی تقاضا تھا۔ ریاست کو بہرحال یہ حق حاصل ہے کہ وہ وقتِ ضرورت اس طرح کا معاہدہ بھی کرسکتی ہے۔ اس نے بعد میں فتح و کامرانی کے دروازے کھول دے۔

امام ابو یوسف نے یہ معاہدہ بہت تفصیل سے نقل کیا ہے۔اس کے شروع میں فرماتے ہیں:

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب صلح الحدیبیۃ۔ ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ

قد وادع رسول اللہ ﷺ قریشا عام الحدیبیۃ و امسک عن محاربتھم فللاِمام ان یوادع اھل الشّرک اذا کان فی ذٰلک صلاح الدّین و الاسلام و کان یرجو ان یتالّفھم بذٰلک علی الاسلام.[1]	رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے سال قریش سے صلح کی اور ان سے جنگ سے دست کش ہوگئے۔ لہٰذا امام کو یہ حق ہے کہ وہ اہل شرک سے مصالحت کرے، اگر اس میں دین اور اسلام کی بہتری ہو اور یہ توقع ہو کہ وہ اس کے ذریعے انھیں اسلام سے مانوس اور قریب کرسکے گا۔

اس معاہدہ سے کوئی مالی پہلو متعلق نہیں ہے۔ قیامِ امن کے لیے نہ تو رسول اللہ ﷺ نے مال کی پیش کش کی ہے اور نہ قریش ہی کی طرف سے اس طرح کی کوئی شرط رکھی گئی ہے۔ بغیر مال کے اس نوعیت کا معاہدہ وقت ضرورت ہر زمانہ میں ہوسکتا ہے۔ اس معاملہ میں شافعی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے علاّمہ سیوطی کہتے ہیں:

ان الھدنۃ تعقد بغیر مال[2]	صلح مال کے بغیر منعقد ہو جاتی ہے۔

فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ وقتِ ضرورت مال دے کر بھی دشمن سے صلح ہوسکتی ہے یا نہیں؟ بعض ائمہ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے ریاست کی کم زوری ظاہر ہوتی ہے اور یہ اس کے وقار کے منافی ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں: ''مال دیے بغیر دشمن سے صلح جائز ہے، جیسا کہ حدیبیہ میں صلح ہوئی تھی۔ اگر کوئی مجبوری ہو تو مال دے کر بھی صلح کی جاسکتی ہے، ورنہ یہ صحیح نہیں ہے۔'' امام شافعی فرماتے ہیں: ''مسلمان کم زور ہوں اور وہ دشمن کا مقابلہ نہ کرسکتے ہوں تو اس سے صلح ہوسکتی ہے، لیکن یہ صلح بغیر کسی مال کے ہوگی۔ کسی مسلمان کا اللہ کی راہ میں جان دینا شہادت ہے۔ اس لیے اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام اس سے بلند و برتر ہے کہ مسلمان مال دے کر دشمن سے جنگ سے باز آنے کی درخواست کرے۔ ہاں اگر دشمن کی اس قدر کثرت ہو کہ مسلمانوں کو یہ خدشہ لاحق ہوجائے کہ وہ انھیں جڑ پیڑ

---

[1] کتاب الخراج، ص ۲۰۷

[2] جلال الدین سیوطی، الاشباہ والنظائر، ص ۵۲۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت

سے اکھاڑ پھینکیں گے اور انھیں بالکل ختم کر کے رکھ دیں گے، تو یہ ایک طرح کی ضرورت اور مجبوری ہے، اس میں جواز کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی طرح کوئی مسلمان اگر گرفتار ہوجائے اور فدیہ دے کر ہی رہائی حاصل کرسکتا ہوتو یہ اس کے لیے جائز ہے۔"[1]

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ شدید ضرورت کے تحت فدیہ دے کر بھی دشمن سے صلح ہوسکتی ہے۔ اسلامی ریاست کے لیے اپنے حالات وظروف اور امت کے مفاد کے پیش نظر اس نوعیت کا اقدام از روئے شرع ناجائز نہ ہوگا۔ علامہ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ شریعت کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی بڑے ضرر کو دفع کرنے کے لیے چھوٹے ضرر کو برداشت کرلیا جائے۔ اس کی ایک مثال یہ دی ہے:

و لو احاط الكفار بالمسلمين و لاَ مقاومة بهم جاز دفع المال اليهم و كذا استنقاذ الُاسرى منهم بالمال اذا لم يمكن بغيرهٖ لِان مفسدة بقائهم في ايديهم و اصطلامهم للمسلمين اعظم من بذل المال[2]	اگر کفار مسلمانوں کو گھیر لیں اور ان کا مقابلہ نہ ہوسکتا ہوتو ان کے لیے مال دے کر اس (صورتِ حال) سے بچنا جائز ہے۔ اسی طرح مال کے بغیر ان سے قیدیوں کا چھڑانا ممکن نہ ہوتو (اس صورت میں بھی مال دے کر انھیں چھڑانا جائز ہوگا) کیوں کہ قیدیوں کا ان کے ہاتھوں میں ہونا اور ان کا مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا مال خرچ کرنے کے مقابلے میں بہت بڑی چیز ہے۔

علاّمہ ابوعبید کہتے ہیں کہ امام یا سربراہ مملکت اگر یہ دیکھے کہ مسلمانوں پر دشمن کے غلبے کا اندیشہ ہے اور فدیہ دے کر ہی اس سے بچا جاسکتا ہے تو اسے اس کا حق ہے۔ امام مسلمانوں کے مصالح کا نگراں ہے۔ وہ اس کے پیش نظر اس طرح کا اقدام کرسکتا ہے[3]

علاّمہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ جب ضرورت تقاضا کر رہی ہو اور مسلمانوں کی ہلاکت یا قید و بند کا اندیشہ ہوتو مال کے ذریعے صلح جائز ہے، جس طرح ایک فرد فدیہ

---

[1] فتح الباری: ۶ / ۱۹۸

[2] سیوطی، الاشباہ والنظائر: ص ۸۷

[3] کتاب الاموال، ص ۱۵۸

(مال) دے کر امان حاصل کرسکتا ہے، اسی طرح ریاست کے لیے بھی اس کے جواز سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں ریاست کی ذلت اور توہین کا پہلو نکل رہا ہو تو بھی قتل، گرفتاری اور غلامی سے بچنا ایک بڑا مقصد ہے، اس کی خاطر اسے برداشت کیا جانا چاہیے۔

علامہ ابو عبید اور علامہ ابن قدامہ نے اپنی تائید میں حسب ذیل واقعہ پیش کیا ہے:

جنگ خندق میں مختلف قبائل نے چاروں طرف سے ایک ساتھ مدینہ پر حملہ کر دیا تھا۔ ایک مہینے کے قریب انھوں نے مدینہ کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ حالات نے زیادہ شدت اختیار کر لی تو آپ نے عیینہ بن حصن اور حارث بن مرّی کو، جو قبیلۂ غطفان کے سردار تھے، پیش کش کی کہ اگر وہ ان قبائل کا ساتھ چھوڑ دیں اور اپنے لوگوں کو لے کر واپس چلے جائیں، تو انھیں مدینہ کی کھجور کی پیداوار کا ایک تہائی دیا جائے گا۔ یہ چیز تحریر میں بھی آ گئی تھی، لیکن اس پر فریقین کے اور گواہوں کے دستخط نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے انھیں صرف اس کے لیے آمادہ کیا تھا، اسے قطعی شکل دینے سے پہلے انصار کے سردار سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کو طلب فرمایا اور ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ کیا آپ کی یہ خواہش ہے کہ ہم اس پر عمل کریں، یا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس پر عمل کرنا ہمارے لیے ضروری ہے، یا آپ ہمارے مفاد میں یہ چاہتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: قسم خدا کی، میں نے تو یہ تمہارے فائدے کے لیے سوچا ہے، سارا عرب ایک تیر سے تمھیں ہدف بنائے ہوئے ہے، ہر طرف سے قبائل تم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی قوت کسی حد تک کم زور ہو۔ ان دونوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم بھی اور یہ بھی شرک میں مبتلا تھے، بت پرستی میں پڑے ہوئے تھے، اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے، بلکہ اس سے بے خبر تھے۔ اس حال میں بھی کبھی انھوں نے اس کی ہمت نہیں کی کہ ہماری پیداوار میں سے کوئی کھجور کھا سکیں۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمارے مہمان ہوں، یا ہم سے خرید کر کھائیں۔ اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے ذریعہ قوت بخشی ہے، ہمیں ہدایت سے نوازا ہے، دین اسلام کے ذریعے اور آپ

کے ذریعے سربلندی عطا کی ہے تو کیا ہم اپنا مال انھیں پیش کردیں؟ ہم تو ان کے مقابلے میں تلوار اٹھائیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دے۔ آپ نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور کہا کہ تم بہتر سمجھ سکتے ہو۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے تحریر لی اور مسودہ کو مٹا دیا اور کہا کہ وہ ہمارے خلاف جو چاہیں کریں[1]

علامہ ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں: اگر بذریعۂ مال صلح کرنا فی نفسہٖ جائز نہ ہوتا تو اسے آپ حضرت سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کے سامنے مشورہ کے لیے پیش ہی نہ فرماتے[2]

جنگی قیدیوں کا تبادلہ

بین الاقوامی سطح پر جنگی قیدیوں کے تبادلے اور ان کی رہائی کے لیے معاہدے ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست بھی اس طرح کے معاہدے کرسکتی ہے۔ وہ اپنے جنگی قیدیوں کو چھڑانے کی ممکنہ حد تک کوشش کرے گی۔ علاّمہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

یجب فداء اسریٰ المسلمین اذا امکن.	مسلمان قیدیوں کا چھڑانا واجب ہے، اگر اس کا امکان ہو۔

مزید فرماتے ہیں کہ یہی رائے حضرت عمر بن عبد العزیز، امام مالک، اسحٰق بن راہویہ کی ہے[3]

اس سلسلہ کے بعض واقعات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

حضرت سلمہ بن اکوعؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک غزوہ میں، جو حضرت ابوبکرؓ کی سربراہی میں بھیجا گیا تھا، ہم نے دشمن پر حملہ کیا۔ جنگ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے غنیمت میں مجھے بنوفزارہ کی ایک لونڈی دی، جو بہت خوبصورت تھی۔ میں اسے لے کر مدینہ

۱۔ ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۳/۲۳۹، ۲۴۰۔ کتاب الاموال، ص ۱۵۸، ۱۵۹

۲۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/۱۵۶

۳۔ حوالہ سابق: ۱۳/۱۳۵

پہنچا۔ بازار میں رسول اللہ ﷺ سے میری ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا سلمہ! یہ عورت مجھے دے دو، دوسرے روز بھی آپ نے یہی بات فرمائی۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، یہ آپ کی ہے، میں نے اس سے کوئی جنسی تعلق نہیں قائم کیا ہے۔ یہ لڑکی آپ نے مجھ سے لی اور اس کے عوض مسلمان قیدیوں کو، جو مکہ میں گرفتار تھے، رہا کرایا[1]

حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار کا ایک آدمی فدیہ میں دے کر دو مسلمان قیدیوں کو چھڑایا[2]

اسلامی ریاست مال کے عوض دشمن کے قیدیوں کو رہا کرسکتی ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک، امامؒ اوزاعی اور سفیان ثوری نے اسے ناپسند کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس سے دشمن کی قوت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن حضرت حسن بصری اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ ان کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے چالیس قیدیوں کو، جو اچھے شہ سوار اور تیر انداز تھے، فدیہ لے کر رہا کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق ان سے دریافت کیا تو کہا کہ وہ ہماری فوج کو بھی کوئی دھوکا دے سکتے تھے، اس لیے میں نے فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیا اور مسلمانوں کے درمیان شریعت کے مطابق مال تقسیم کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے اتفاق کیا۔[3]

جو قوم جنگ نہ کرے اس سے جنگ نہ کی جائے

کسی ملک سے اسلامی ریاست کو خطرہ نہ ہو، یا اس کے مصالح کا تقاضا ہو کہ اس کے ساتھ امن کا معاملہ رہے تو اسلامی ریاست اس سے خواہ مخواہ کش مکش مول نہ لے گی، جیسا کہ حبشہ اور ترک کے معاملہ میں کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی:

---

[1] مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب التنفیل وفداء المسلمین بالاساریٰ۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب الرخصۃ فی المدرکین یفرق بینھم

[2] ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی قتل الاساریٰ

[3] ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۱۲۲

اتر کوا الحبشۃ ما ودعوکم | حبشہ کو چھوڑ دو جب تک کہ وہ تم سے تعرض نہ
واترکوا الترک ما ترکوکم[۱] | کریں (اسی طرح) ترک کو چھوڑ دو جب تک کہ انھوں نے تمھیں چھوڑ رکھا ہے۔"

اس حدیث میں صاف کہا گیا ہے کہ جب تک یہ ریاستیں اسلامی ریاست کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہو رہی ہیں اور اس سے الگ تھلگ اور کنارہ کش ہیں، ان سے محاذ آرائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کی ریاستوں سے صلح کے معاہدے بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن کسی مرحلے میں وہ اسلامی ریاست کے خلاف مہم جوئی شروع کردیں اور اس پر یلغار کردیں تو ریاست کا دفاع ازروئے شرع ضروری ہے۔ حملہ آور کا جواب پوری قوت سے دیا جائے گا۔

اسلامی ریاست بے شک ایک نظریاتی ریاست ہے، لیکن اسے ایک جنگ جو ریاست کی شکل میں پیش کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اس نے ہرحال میں نہ تو جنگ کو لازم قرار دیا ہے اور نہ ہر ایک سے اعلانِ جنگ کیا ہے۔ وہ آزادیِ فکر و عمل کو انسان کا بنیادی حق مانتی ہے۔ اس کے لیے اس نے دعوت وتبلیغ کا راستہ اختیار کیا ہے اور اسی کے ذریعہ وہ اپنے حق میں فضا ہموار کرنا چاہتی ہے۔ حالات کے تحت اس نے جنگ وصلح کے اقدامات بھی کیے ہیں، امن و امان کے معاہدے بھی کیے ہیں اور غیر جانب دار بھی رہی ہے۔ وہ وسیع آفاقی تصور کے تحت سیاسی اقدامات کرتی ہے، البتہ اس میں اپنے مفادات کو نظر انداز نہیں کرتی اور نہ اس کی اس سے توقع کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی ہر ریاست اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر ہی بین الاقوامی معاہدے کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں اپنے مفادات کی نگرانی کرے اور اس کے تحت فیصلے کرے۔ اسے اپنے مفادات کو نظر انداز کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

۱؎ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب فی النّھی عن تھییج الترک والحبشۃ

غیر مسلموں سے عدمِ تعلق کے احکام کا پس منظر

(بعض آیات کی تشریح و توضیح)

اسلام نے غیر مسلموں سے ایمان اور عقیدہ کے سارے اختلاف کے باوجود ان سے تعلقات رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی جو بے نظیر تعلیم دی ہے اس سے واقفیت کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے، یا پیدا کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید نے غیر مسلموں سے عدم موالات اور ان سے بے تعلقی کی بھی تو ہدایت کی ہے، اسے کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ اس امر کی سنگینی اس وقت بڑھ جاتی ہے جب کہ وہ مخالفین سے جنگ اور جہاد کا حکم دیتا ہے۔ یہ سوال بار بار اور مختلف انداز میں اس طرح اٹھایا جاتا ہے، گویا قرآن مجید کی اصل تعلیم ہی یہ ہے کہ غیر مسلمین سے مبارزت اور کشت وخون کا بازار گرم رکھا جائے اور قرآن اسی لیے نازل ہوا ہے کہ جو اسے نہ مانے اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔

کن حالات میں یہ احکام دیے گئے؟

قرآن مجید کی جن آیات میں غیر مسلمین سے تعلقات نہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا موقع ومحل اور سیاق وسباق بالکل الگ ہے۔ یہ اگر پیش نظر نہ ہو تو غلط فہمی کا امکان رہتا ہے اور دیدہ و دانستہ اسے نظر انداز کرنے سے بے جا اعتراضات کا ایک طویل سلسلہ چل پڑتا ہے، بلکہ اسے اسلام کی صاف و شفاف تعلیمات پر گرد و غبار اڑانے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ ان آیات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ان حالات کو سامنے رکھنا ہوگا، جن میں وہ نازل ہوئیں۔

مخالفین کا رویہ اور ان کے عزائم

اسلامی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور کی یاد ذہن میں ذرا تازہ کیجیے، جب کہ اس کی دعوت آہستہ آہستہ عام ہوتی گئی اور مدینہ میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست وجود میں آگئی۔ اس واقعہ نے مخالفین کی صفوں میں اضطراب اور ہلچل پیدا کردی اور مخالفت کی آندھی زیادہ شدت سے ہر طرف چلنے لگی۔ مشرکین اور یہود و نصاریٰ اپنے اختلافات کو بھول کر اسلام کے خلاف متحد ہوگئے۔ ہر طرح کی سازشوں کا ایک جال بچھا دیا گیا اور مسلسل حالتِ جنگ قائم کردی گئی، اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی جو بھی تدبیر کی جاسکتی تھی وہ بے دریغ اختیار کی جانے لگی۔

یہ کھلے دشمنوں کا حال تھا۔ دوسری طرف منافقین، جو مفادات کے غلام تھے، بظاہر اسلام کا دم بھرتے اور مسلمانوں سے اپنی خیر خواہی اور اخلاص و محبت کا اظہار کرتے تھے، لیکن دل سے مخالفین کے ساتھ ملے ہوئے تھے، انھیں ان کا پورا تعاون حاصل تھا اور وہ ان کے دم ساز اور غم خوار بنے ہوئے تھے۔

اعداءِ دین سے عدمِ تعلق کی ہدایت

ان حالات میں مسلمانوں کو اسلام پر ثابت قدمی کی ہدایت کی گئی، دین و ایمان کے تقاضے واضح کیے گئے اور بتایا گیا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن ہیں اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں ان سے انھیں دور رہنا چاہیے۔ ان سے رازدارانہ تعلقات اور ذہنی قربت و یگانگت ایمان کے منافی ہے۔

منافقوں کے کردار سے بھی پردہ ہٹایا گیا اور مخلص مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ ان کی پس پردہ سازشوں سے ہوشیار رہیں۔ یہ مارِ آستین کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔

اسلام کے ان کھلے اور چھپے دشمنوں سے تعلقات ایمان کے منافی بھی تھے اور خالص سیاسی نقطۂ نظر سے بھی بے حد مہلک اور تباہ کن تھے۔ اس سے اسلامی ریاست

سنگین خطرات سے دوچار ہوسکتی تھی۔ اس کا تحفظ ضروری تھا۔ دنیا کی کوئی بھی حکومت دشمن سے تعلقات قائم کرنے، اس سے رازدارانہ معاملات کرنے، اسے خفیہ معلومات فراہم کرنے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کی سازشوں میں شریک ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی۔ مسلمانوں کو اپنے ان مخالفین سے تعلق نہ رکھنے کا قرآنِ مجید کی جن آیات میں حکم دیا گیا ہے ان کے آگے پیچھے اور بعض اوقات ان ہی آیات میں اس کا پس منظر صاف موجود ہے۔ اس طرح کی چند آیات ضروری تشریح کے ساتھ یہاں پیش کی جا رہی ہیں:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ لاَ یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالاً وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ وَ مَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ○ ھٰاَنْتُمْ اُوْلَآءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلاَ یُحِبُّوْنَکُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتٰبِ کُلِّهٖ وَ اِذَا لَقُوْکُمْ قَالُوْا آمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ○ اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ وَ اِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِھَا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لاَ یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئاً اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ○

(آل عمران:۱۱۸-۱۲۰)

اے ایمان والو! اپنے لوگوں کے سوا دوسروں کو رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمھارے بگاڑ میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ وہ اس چیز سے خوش ہوتے ہیں جس سے تمھیں تکلیف پہنچے۔ ان کے منہ سے بغض و عداوت ظاہر ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ ہم نے تمھیں اپنی آیات کھول کر بیان کردی ہیں، اگر تم عقل سے کام لو۔ دیکھو تم تو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور تم تمام آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے اور جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصہ سے انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ ان سے کہو کہ مرو اپنے غصہ سے۔ بے شک اللہ سینے کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ اگر تمھیں کچھ بھلائی پہنچے تو انھیں تکلیف ہوتی ہے اور اگر تم کسی مصیبت سے دوچار ہوتو وہ خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی کوئی چال تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔ بے شک اللہ، جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اسے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔

یہود، نصاریٰ اور منافقین کا کردار

ان آیات میں یہود کا ذکر ہے۔ منافقین پوری طرح ان کے ساتھ تھے۔ یہود کی آبادی مدینہ سے ملی ہوئی تھی، ان کے قبائل اس کے اطراف موجود تھے۔ مسلمانوں کے ان سے قدیم تعلقات چلے آرہے تھے، دوستی اور ہمسایگی تھی، کاروبار اور لین دین تھا، معاہدے تھے، اس وجہ سے بہت سے سچے اور سادہ دل مسلمان ان کی سازشوں کو محسوس نہیں کرپا رہے تھے، انھیں بدخواہ اور دشمن سمجھنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ منافقین خود مسلمانوں میں گھلے ملے تھے، ان سے ان کے خونی رشتے اور مختلف قسم کے سماجی اور معاشرتی تعلقات تھے۔ یہ منافقین مسلمانوں کے اندر بیٹھ کر یہود کا کردار ادا کر رہے تھے۔ قرآن نے ان دونوں کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کی عداوت اور مخالفت ڈھکی چھپی نہیں ہے، ان کے قول و فعل سے نمایاں ہے۔ تمھاری کامیابی سے ان کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں اور صدمات کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تم کسی ناکامی سے دوچار ہوتے ہو تو ان کے گھروں میں مسرت کے شادیانے بجنے لگتے ہیں۔ ان اعداءِ دین سے ذہنی و قلبی وابستگی، انھیں خیر خواہ سمجھنا اور انھیں اپنا رازدار بنانا تمھارے لیے صحیح نہیں ہے۔ ان آیات میں پہلی آیت کا پس منظر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور ان کے شاگرد مجاہد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

نزلت فی قوم من المؤمنین کانوا یصافون المنٰفقین و یواصلون رجالاً من الیهود لما کان بینهم من القرابة و الصداقة والجوار و الرضاع والحلف فنهوا عن مباطنتهم[1]	یہ آیت اہل ایمان میں سے بعض ان لوگوں کے سلسلہ میں نازل ہوئی جو منافقین سے خلوص اور محبت اور یہود کے بعض افراد سے قریبی تعلقات اس وجہ سے رکھتے تھے کہ ان کے درمیان قرابت اور دوستی تھی، ہم سائیگی تھی، رضاعت اور حلیف ہونے کے روابط تھے۔ ان سے باطنی روابط سے (یہاں) منع کیا گیا ہے۔

[1] ابن جوزی، زاد المسیر: ۱/۴۴۶۔ ابن جریر میں یہ روایت کسی قدر مختصر ہے۔ جامع البیان: ۷/۱۴۰

ان آیات میں یہود کی عداوت اور مخاصمت کا ذکر ہے۔ نصاریٰ کا رویہ بھی فی الجملہ اس سے مختلف نہ تھا۔ مشرکین تو ان سب سے آگے تھے۔ ان سب نے مل کر حالات ہی ایسے پیدا کردیے تھے کہ مسلمانوں کو ان سے قریبی تعلقات قائم کرنے سے منع کرنا پڑا۔ چناں چہ ایک جگہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰىٓ اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَّ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝ (المائدۃ:۵۱)

اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو ولی نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ تم میں سے جو کوئی ان کو ولی بنائے تو وہ ان ہی میں سے ہے۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہِ ہدایت نہیں دکھاتا۔

اسی سلسلۂ بیان میں آگے ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ۝ (المائدۃ:۵۷،۵۸)

اے ایمان والو! تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی تھی، ان میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے، ان کو اور کافروں کو اپنا ولی اور دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم صاحب ایمان ہو۔ جب تم نماز کے لیے بلاتے ہو (اذان دیتے ہو) تو وہ اس کا مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔

اس نازک ملّی اور دینی صورت حال میں ایک کردار وہ تھا جو منافقین پیش کر رہے تھے اور دوسرا کردار مخلص اہل ایمان کا تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ منافقین کے بارے میں بتایا کہ ان کے دل نور ایمان سے خالی ہیں، دین کا مذاق اڑانے میں انھیں کوئی تامل نہیں ہوتا، وہ تذبذب کا شکار اور یکسوئی سے محروم

ہیں، کسی مقصد کے لیے ایثار و قربانی کا تصور ان کے لیے گراں ہے، وہ چھوٹی سی چھوٹی آزمائش کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں، تمہارے دشمنوں کے ساتھ ہیں لیکن کوئی نازک موقع آئے گا تو وہ اِن کا بھی ساتھ چھوڑ دیں گے۔ منافقین کی یہ تصویر قرآن کے مختلف مقامات میں موجود ہے۔ یہاں سورۂ نساء کی بعض آیات پیش کی جارہی ہیں:

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَاباً اَلِيْماًo اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعاًo وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ آيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلاَ تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذاً مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعاًo اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاًo اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ

منافقوں کو خوش خبری سنا دو کہ ان کے لیے درد ناک عذاب ہے، جو اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں، عزت تو ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب میں پہلے ہی تمہیں یہ ہدایت دے چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار ہو رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ وہ دوسری بات میں نہ لگ جائیں ورنہ تمہارا شمار بھی ان ہی میں ہوگا۔ بے شک اللہ منافقین اور کفار کو جہنم میں ایک ساتھ جمع کرے گا۔ ان منافقین کا حال یہ ہے کہ وہ تمہارے بارے میں انتظار میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح و کام رانی حاصل ہو تو وہ کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو اس کا کچھ حصہ ملے تو کہیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں گھیر نہیں لیا تھا اور اہل ایمان سے بچایا نہیں تھا؟ اللہ قیامت کے روز ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو اہل ایمان پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا۔ منافقین اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں اور (حقیقت

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ وَ اِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلاَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلاَّ قَلِيْلاً○ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لاَ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلاَ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلاً○
(النساء:۴:۱۴۲-۱۴۳)

یہ ہے کہ) اللہ انھیں دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے۔ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور بے ادبی کے ساتھ لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔ یہ (حق و باطل) کے درمیان تذبذب میں ہیں، نہ اس طرف ہیں اور نہ اس طرف، جسے اللہ تعالیٰ گم راہ کردے اس کے لیے تم ہرگز کوئی راستہ نہیں پاسکتے۔

منافقین میں سے بعض وہ بھی تھے جو اپنے مفادات کی خاطر دار الحرب میں رکے ہوئے تھے، دشمنوں سے ان کی ساز باز تھی، ان کا تعاون انھیں حاصل تھا، وہ ہجرت کے لیے جو اس وقت فرض ہوچکی تھی، آمادہ نہ تھے، اسلام سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اسلامی ریاست پر کوئی خطرہ کی گھڑی آجائے تو وہ دشمنوں کی صف میں نظر آتے۔ قرآن نے ان سے بھی قطعِ تعلق کا اور ان کے خلاف وقتِ ضرورت تلوار اٹھانے کا حکم دیا۔ ارشاد ہے:

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلاً○ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلاَ تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلاَ تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لاَ نَصِيْرًا○
(النساء:۸۸،۸۹)

تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمھارے دو گروہ بن گئے ہیں، حالاں کہ ان کے ان اعمال کی وجہ سے، جو انھوں نے کیے ہیں، اللہ نے انھیں الٹا پھیر دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گم راہ کر دیا اسے راہ دکھاؤ۔ جسے اللہ راہ سے بھٹکا دے اس کے لیے تم ہرگز کوئی راہ نہ پاؤ گے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہوجاؤ، جیسے وہ خود کافر ہیں اور پھر تم سب برابر ہوجاؤ۔ ان کو اپنا دوست اور ولی نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے (مدینہ) نہ آجائیں۔ اگر وہ روگردانی کریں تو انھیں پکڑو اور جہاں انھیں پاؤ مار ڈالو۔ انھیں اپنا ولی اور مددگار نہ بناؤ۔

سورۂ مجادلہ میں منافقین کا رویہ زیر بحث ہے کہ وہ اللہ کے دشمنوں سے تعلقات استوار کر رہے ہیں اور قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا ثبوت فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کسی کے بھی مخلص نہیں ہیں۔ جس مال و دولت کے لیے آج وہ اپنا دین و ایمان بیچ رہے ہیں، کل وہ ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔ شیطان ان کے سروں پر مسلط ہے اور یہ اسی کے گروہ کے افراد ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا کردار بیان ہوا ہے جو ایمان و اخلاص کی دولت سے مالا مال ہیں اور جن کے دلوں میں اللہ کی ذات پر یقین اور آخرت کا خوف جاگزیں ہے، ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں سے خفیہ یا علانیہ تعلقات رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ پیکار ہیں، چاہے وہ ان کے قریب ترین اعزہ اور خونی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کا کردار وہی ہوگا اور وہی ہونا چاہیے جو کسی غیرت مند ملت اور اعلیٰ نصب العین کے حامل گروہ کا ہوتا ہے۔ اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

لَا تَجِدُ قَوْماً يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْا آبَآءَ هُمْ اَوْ اَبْنَاءَ هُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُوْلٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُم بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ (المجادلۃ:۲۲)

تم یہ نہ دیکھو گے کہ جن لوگوں کا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہے وہ ان لوگوں سے مودت کے تعلقات رکھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی یا ان کے خاندان والے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعہ ان کی مدد کی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ ان سے راضی ہوئے۔ یہ اللہ کے گروہ کے لوگ ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے گروہ والے ہی کامیاب ہوں گے۔

صلح حدیبیہ

ایمان اور اخلاص کے باوجود اس بات کا امکان بہرحال ہے کہ دین کی محبت پر رشتوں ناطوں اور سماجی تعلقات کی محبت غالب آجائے اور آدمی کوئی ایسا قدم اٹھا دے جس کے نتائج امت کے عمومی مفاد اور اسلامی ریاست کے لیے خطرناک ہوں۔ اسی طرح کی ایک فروگزاشت پر قرآن مجید نے تنبیہ کی اور دین و ایمان کے تقاضے واضح کیے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے:

قریش مکہ نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں کیں، ہجرتِ مدینہ کے بعد بار بار جنگ مسلط کی، مسلمانوں نے عمرہ کا ارادہ کیا تو خدا کے گھر کعبۃ اللہ کی زیارت سے روکا۔ بالآخر صلح حدیبیہ ہوئی[۱] اس میں دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ اسی معاہدہ کی ایک شق یہ تھی کہ جو قبیلہ جس فریق کا چاہے حلیف بن سکتا ہے۔ چناں چہ اس شق کے تحت بنوخزاعہ مسلمانوں کے اور بنوبکر قریش کے حلیف بنے[۲] لیکن جلد ہی بنوبکر نے بنوخزاعہ پر یورش کردی۔ قریش نے ان کی، اسلحہ اور افراد کے ذریعہ، پشت پناہی کی اور معاہدہ کو توڑ کر بنوخزاعہ کے ساتھ ظلم و زیادتی میں شریک ہوگئے۔ یہ بین الاقوامی ضابطہ کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خاموشی سے جنگ کی تیاری شروع کردی۔[۳]

حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا واقعہ

تیاری کے اس مرحلہ میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے، جن کے اخلاص

۱۔ پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۳/ ۳۵۵ اور آگے کے صفحات اور دیگر کتب سیرت۔

۲۔ معاہدۂ صلح کے متن کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن ہشام: ۳/ ۳۶۶

۳۔ بنوخزاعہ پر حملہ اور اس کے اسباب اور بعد کے واقعات کے لیے دیکھی جائے۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۴/ ۳-۱۵

میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور جو بدری صحابی تھے، خط کے ذریعے مشرکین کو رسول اللہ ﷺ کی اس تیاری کی اطلاع دے دی۔ یہ خط ایک عورت لے جارہی تھی۔ اس نے مدینہ سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ وحی کے ذریعے آپ کو اس کی خبر ہوگئی۔ آپ نے حضرت علیؓ اور تین دیگر صحابہ کو بھیج کر اس عورت سے یہ خط برآمد کرالیا۔ جب حاطب بن ابی بلتعہؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے خط کا اعتراف کیا اور عرض کیا کہ قریش سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ میری حیثیت ان کے حلیف کی ہے۔ جنگ کی صورت میں مہاجرین کے تو رشتہ دار ہیں، ان کی وجہ سے ان کے اہل وعیال اور مال و اسباب کی حفاظت ہوجائے گی، لیکن میرے بچوں اور عزیزوں کی کوئی حفاظت نہ ہوسکے گی، اس لیے میں نے سوچا کہ قریش کو اگر میں اس کی پہلے سے اطلاع دے دوں تو وہ میرے شکر گزار ہوں گے اور میرے متعلقین کا خیال رکھیں گے، ویسے مجھے یقین ہے کہ میری اس اطلاع سے کوئی فرق واقع ہونے والا نہیں ہے، قریش کی قوت بہرحال اب کی بار ختم ہوکر رہے گی۔ بہرحال یہ تھا میرا مقصد۔ میرے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، میں نے نہ تو کفر کا راستہ اختیار کیا ہے اور نہ مرتد ہوا ہوں۔ حضرت حاطبؓ نے جو بات تھی، ٹھیک ٹھیک بیان کردی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا عذر قبول فرمایا۔ اس موقع پر حسب ذیل آیات نازل ہوئیں[1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اولیا اور دوست نہ بناؤ۔ تم ان سے دوستی کا تعلق قائم کرتے ہو، جب کہ وہ اس حق کا

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب الجاسوس۔ نیز، کتاب المغازی، باب غزوۃ الفتح الخ۔ مسلم کتاب الفضائل، باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعہؓ و اہل بدر۔ اس سلسلہ کی مزید روایات کے لیے دیکھی جائے۔ ابن کثیر، تفسیر: ۴/۳۴۶۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۸/۵۰-۵۲۔ قرطبی وغیرہ میں بعض کم زور روایات کے حوالہ سے اس خط کا مضمون بھی نقل ہوا ہے جو حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے مشرکین مکہ کو لکھا تھا۔

الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُولَ وَ اِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَاداً فِىْ سَبِيْلِىْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِىْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَا اَخْفَيْتُمْ وَ مَا اَعْلَنْتُمْ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ○ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْءِ وَ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُوْنَ○ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْر○ (الممتحنہ:۱-۳)

انکار کر چکے ہیں جو تمھارے پاس آیا ہے۔ وہ اللہ کے رسول کو اور تمھیں اس وجہ سے نکالتے ہیں کہ تم اللہ پر، جو تمہارا رب ہے، ایمان رکھتے ہو ۔ (اس طرح تعلق قائم کرنا صحیح نہیں ہے) اگر تم میرے راستہ میں جہاد اور میری رضا کی طلب میں نکلے ہو۔تم ان کے پاس دوستی کا خفیہ پیغام بھیجتے ہو اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔تم میں سے جو یہ کرے وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ تمھیں پالیں تو تمھارے دشمن بن جائیں اور تمہارے خلاف اپنے ہاتھ اور زبان چلانے لگیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کی راہ اختیار کرو۔ قیامت کے دن تمھاری رشتہ داریاں اور تمھاری اولاد تمھارے کچھ کام نہ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ تمھارے درمیان جدائی ڈال دے گا۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

ان آیات میں اہلِ ایمان سے خطاب ہے کہ تم نے اللہ کی رضا جوئی میں اور اس کی راہ میں جان و مال لٹانے کے جذبہ سے اپنا گھر بار چھوڑا اور ہجرت کی، پھر تم ان لوگوں کو کیسے اپنا ولی اور دوست بنا سکتے ہو جنھوں نے اللہ کے رسول کو اور خود تمھیں محض اس وجہ سے مکہ کی سرزمین پر رہنے نہیں دیا کہ تم اللہ واحد کا نام لیتے ہو اور اس کے دین کی دعوت دے رہے ہو۔ آج بھی ان کی تلواریں نیام سے باہر اور تمہارے خون کی پیاسی ہیں۔ وہ صرف موقع کی تاک میں ہیں۔ ان کی زبانیں آگ اگل رہی ہیں۔ جب اور جتنی اذیت تمھیں پہنچا سکتے ہیں پہنچا رہے ہیں۔ ان کی خواہش اور کوشش ہے کہ تمھیں عبادت و اطاعت کی راہ سے پھیر کر معصیت کی راہ پر ڈال دیں۔ اس طرح کے دشمنوں سے تم خفیہ تعلقات قائم کر رہے ہو اور حکومت کے راز ان پر کھول رہے ہو۔ تمھیں یہ

حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ ظاہر و باطن سب کچھ اس پر عیاں ہے۔ تم نے یہ اقدام مال و اسباب اور خویش و اقارب کی محبت میں کیا ہے، حالاں کہ قیامت میں یہ رشتے ناطے بکھر جائیں گے اور یہ وابستگیاں ختم ہوجائیں گی۔ وہاں تو صرف اللہ سے تعلق اور محبت ہی کام آئے گی۔

مشرکین کی عہد شکنی اور جہاد کا حکم

سورۂ توبہ جہاد کی سورہ ہے۔ اس میں مشرکین کی عہد شکنی اور ان حالات کا، جن میں جہاد کا حکم دیا گیا، تفصیل سے ذکر ہے۔ جہاد کے جواز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''ان لوگوں کے ساتھ عہد و پیمان کیسے باقی رہ سکتا ہے جو اگر تم پر غلبہ پا جائیں تو تمہارے سلسلے میں نہ کسی رشتہ اور قرابت کا خیال کریں اور نہ عہد و پیمان کا۔ وہ تو اپنی زبان سے تمھیں خوش کر رہے ہیں، جب کہ ان کے دل اس کے خلاف ہیں۔ ان میں سے بیش تر بدکردار ہیں۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے عوض دنیا کی تھوڑی سی پونجی خریدی ہے۔ اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں۔ حالاں کہ بہت برا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ وہ کسی مومن کے سلسلے میں نہ رشتہ کا خیال کرتے ہیں اور نہ عہد و پیمان کا۔ وہی (ہر معاملہ میں) زیادتی کرنے والے ہیں اگر وہ (اپنی حرکتوں کو چھوڑ کر) ایمان لے آئیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہوں گے (ان سے جنگ ختم ہوجائے گی) ہم جاننے والوں کے لیے آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد و پیمان کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو ان ائمہ کفر سے جنگ کرو۔ ان کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ

وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں۔ کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں
کرو گے جنھوں نے عہد توڑے اور رسول کے اخراج کا فیصلہ کیا۔
انھوں نے ہی (عہد شکنی کر کے) پہلے جنگ چھیڑی ہے۔ کیا تم
ان سے ڈرتے ہو، حالاں کہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ
اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔" (آیت:۸-۱۳)

اللہ اور رسول کی محبت ہر محبت پر غالب آجائے

ان حالات میں دشمن کی سرکوبی کی ضرورت تھی۔ اس راہ میں رشتوں، ناطوں، مادّی علائق اور دنیوی مفادات کا رکاوٹ بننا ملی اور سیاسی موت کے ہم معنی تھا، اس لیے ارشاد ہوا:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَتَّخِذُوٓا آبَآءَ كُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الإِيْمَانِ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُم مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ○ (التوبۃ:۲۳،۲۴)

اے ایمان والو! اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو بھی اولیاء اور دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کرتے ہوں۔ تم میں سے جو ان کو ولی بنائیں گے وہی ظالم ہیں۔ اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور تمھارے مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑجانے سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو، اگر یہ سب تمھیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ نافذ کردے اور اللہ فاسقوں کو راہِ ہدایت نہیں دکھاتا۔

قرآن مجید کے ان بیانات سے ان سنگین حالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو

مشرکین، یہود و نصاریٰ اور منافقین نے مل کر پیدا کر دیے تھے۔ مسلمان پوری طرح حالتِ جنگ سے گزر رہے تھے، عہد و پیمان توڑے جا رہے تھے۔ سازشیں جاری تھیں، خطرات کے بادل ریاست پر منڈلا رہے تھے، بلکہ ہر طرف سے دشمن کی یلغار تھی اور امن کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس صورتِ حال میں کسی فرد کا ملت اور ریاست کی حریف طاقتوں سے محبت کا رشتہ استوار کرنا اور خفیہ تعلقات رکھنا غداری اور بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم اس کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر اسلام سے اس کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ ملیّ اور ملکی حالات سے آنکھیں بند کر کے اپنے ماننے والوں کو دشمن کی سازشوں کا شکار اور اس کی تقویت کا باعث بننے کی اجازت دے گا اور ریاست کو خطرہ میں ڈالے گا۔ اسے بیک وقت بیرونی دشمنوں کا بھی اور اندرونی دشمنوں کا بھی سامنا تھا۔ اس نے ان دونوں ہی سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ حکم تھا اور صحیح اور بروقت حکم تھا کہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ منافقوں سے بھی تعلقات نہ رکھے جائیں۔ اس پر اعتراض وہی شخص کرسکتا ہے جو سیاسی پیچیدگیوں سے ناواقف ہے۔ یہ تعلقات ملکی یا سیاسی نقطۂ نظر ہی سے نہیں، دین و ایمان کے پہلو سے بھی تباہ کن ہیں۔ آدمی اگر ان لوگوں سے قریبی تعلقات رکھے جن کی دین سے عداوت ونفرت بالکل کھلی ہوئی ہے، جو اس کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اور جو اس کی بیخ کنی چاہتے ہیں تو خود اس کا ایمان سلامت نہیں رہ سکتا، کسی نہ کسی مرحلہ میں اس کے قدم ضرور ڈگمگا جائیں گے۔ منافقین سے دوری اور علیحدگی اس لیے ضروری تھی کہ جب بھی کوئی نازک گھڑی آتی، اللہ اور اس کے رسول پر عدمِ اعتماد کا اظہار ان کا وتیرہ بن چکا تھا۔ اُن کی پوری کوشش ہوتی کہ معاشرہ میں ریب و تذبذب کی فضا پیدا کردیں اور مسلمان ایمان و یقین کی دولت سے محروم ہوجائیں۔ ان کی بے یقینی چھوت کی بیماری کی طرح پھیل سکتی تھی۔ قرآنی تنبیہات نے اس سے محفوظ رکھا۔

غیر جانب داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

یہ ایک مخصوص صورتِ حال ہے۔ جہاں یہ صورتِ حال نہ ہو، قرآن مجید نے مشرکین اور غیر مسلمین سے بہتر روابط رکھنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کیا ہے۔ چناں چہ سورۂ ممتحنہ کے شروع میں اہل ایمان سے یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اور خود تمہارے دشمن ہیں، جنھوں نے تمھارے ساتھ ہر طرح کی زیادتی کی انھیں اپنا ولی نہ بناؤ۔[1]

اس کے فوراً بعد ارشاد ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ○ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ اَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَ ظَاھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ (الممتحنۃ: ۸، ۹)

اللہ تعالیٰ تمھیں منع نہیں کرتا ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف اور احسان کا رویہ اختیار کرنے سے، جنھوں نے تم سے دین کی وجہ سے جنگ نہیں کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے بے دخل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ تو منع کرتا ہے ان لوگوں کے ساتھ مودّت کے تعلقات سے، جنھوں نے تم سے دین کی وجہ سے جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھیں گھروں سے نکالنے میں مدد کی کہ تم ان کو اپنا ولی اور دوست بناؤ۔ جو انھیں اپنا دوست بنائیں گے وہی ظالم ہیں۔[2]

یہ صاف اور واضح ہدایت ہے اس بات کی کہ ان ہی لوگوں سے عدمِ تعلق سے منع کیا گیا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی، انھیں ختم کرنے اور مٹانے کی کوشش میں لگے رہے اور اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

---

[1] آیات کا حوالہ اس سے پہلے اسی بحث میں گزر چکا ہے۔

[2] ان آیات پر بحث 'عام انسانی تعلقات' کے تحت گزر چکی ہے۔

جن غیر مسلموں کا رویہ اس کے خلاف ہو اور جن سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہو، ان کے ساتھ حسن سلوک، عدل و انصاف، مصالحت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ قرآن مجید نے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ جس رویہ کی ہدایت کی ہے اسے غیر مسلموں کے بارے میں ایک عام رویہ قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی کج فہمی ہے، جو صحیح نتیجہ تک پہنچنے نہیں دے گی۔

عدمِ تعلق کے ذیل کی بعض اصطلاحات

اب آیئے یہ دیکھیں کہ جنگ کے سے نازک حالات میں بھی مخالفین سے کیا ہر قسم کے تعلقات سے منع کیا گیا ہے، یا ممانعت خاص قسم کے تعلقات کی ہے؟ اس کے لیے زیر بحث آیتوں کے ان مخصوص الفاظ پر غور کرنا ہوگا جن سے اس ممانعت کی نوعیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں ایک لفظ 'بطانۃ' ہے (آل عمران:۱۱۸)

بطانة کا مفہوم

'بطانۃ' کا مادہ بطن ہے۔ جوہری کی صحاح میں ہے کہ **'بطانة الثوب'** کپڑے کے اندرونی حصہ کو کہا جاتا ہے۔ اس کی ضد ہے **'ظهارة الثوب'**۔ اس کے معنی ہیں کپڑے کا بیرونی حصہ۔ آدمی کے خاص لوگوں کو، جن پر وہ اعتماد کرتا ہے، **'بطانة الرجل'** کہا جاتا ہے[1]

امام راغب فرماتے ہیں:

البطانة خلاف الظهارة ... و تستعار البطانة لمن تختصّه بالاطلاع على باطن امرک[2]	'بطانة' کا لفظ 'ظهارة' کا ضد ہے۔ یہ مستعار لیا جاتا ہے اس شخص کے لیے جسے تم اپنے پوشیدہ امور کے اظہار کے لیے خاص کر لیتے ہو۔

۱؎ ابونصر اسماعیل بن حماد الجوہری، تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ: ۲/ ۳۵۷

۲؎ راغب، مفردات القرآن۔ مادہ بطن

ہمارے ایک قدیم ترین مفسر علامہ ابن جریر طبری نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

انما جعل البطانة مثلاً لخليل الرجل فشبّهه بما و لی بطنه من ثيابه لحلوله منه فی اطلاعه علی اسراره و ما يطويه عن اباعده و كثير من اقاربه محل ما ولی جسده من ثيابه[1]

آدمی کے خاص دوست کو بطور مثال بطانہ قرار دیا گیا ہے، اس میں اسے ان کپڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو آدمی کے جسم سے لگے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس طرح کا دوست آدمی کے اسرار و رموز سے اور ان چیزوں سے، جنھیں وہ غیروں سے اور بہت سے اپنے عزیزوں سے بھی پوشیدہ رکھتا ہے، واقف ہوتا ہے۔ اسے وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو مقام آدمی کے ان کپڑوں کا ہوتا ہے جو اس کے جسم سے لگے ہوئے ہیں۔

مولیٰ کے معنی

ان میں سے بعض آیتوں میں دشمنوں کو اولیاء بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ (مائدۃ: ۵۱، ۵۷۔ نساء: ۸۸، ۸۹، ۱۳۸ وغیرہ) 'اولیاءٴ' ولی کی جمع ہے۔ اس میں انتہائی قربت، نصرت وحمایت اور حکم رانی وسرپرستی کا تصور پایا جاتا ہے[2]

اسی مادہ سے 'مولیٰ' کا لفظ نکلا ہے۔ اس کے متعدد استعمالات ہیں: رب، مالک، سردار، منعم ومحسن، غلام آزاد کرنے والا، مدد کرنے والا، محبت کرنے والا، تابع داری کرنے والا، پڑوسی، چچا زاد بھائی، حلیف، جس سے عہد و پیمان ہو، قرابت دار (داماد) غلام، آزاد کردہ غلام، جس پر احسان کیا جائے۔ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ حدیث میں ان میں سے بیش تر استعمالات موجود ہیں۔ سیاق وسباق سے ان کا مفہوم متعین ہوتا ہے[3]

---

1. ابن جریر، جامع البیان عن تفسیر آی القرآن: ۷/ ۱۳۸
2. راغب، مفردات القرآن۔ مادہ 'ولی'
3. ابن اثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث: ۴/ ۲۳۱

ان الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اعداءِ دین سے قلبی تعلق رکھنے اور انھیں اپنا ہمدرد، سرپرست اور مددگار بنانے سے منع کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ماننے والے مخالفین سے جڑے رہیں۔ جو لوگ ان کی جڑ کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں ان سے وہ قریب ہوتے چلے جائیں، انھیں اپنا مخلص اور خیر خواہ تصور کریں، ان سے عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرح ان کے تعلقات ہوں، ان کو ہمدرد اور بہی خواہ سمجھ کر خفیہ امورِ مملکت بھی ان پر کھول دیں۔ اسلام کی اس ہدایت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ اس طرح کے تعلقات کا کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں ہے۔ اس سے ہٹ کر جہاں تک عام انسانی ہمدردی، حسن سلوک اور ان کے دکھ درد میں کام آنے کا تعلق ہے، اس سے ان آیات میں منع نہیں کیا گیا ہے۔

مودّت کی تشریح

اسی ذیل میں 'مودت' سے بھی منع کیا گیا ہے۔ (الممتحنۃ:۱) علامہ خازن کہتے ہیں:

فان قلت قد اجمعت الامة علی انه تجوز مخالطتهم و معاملتهم و معاشرتهم فما هٰذه المودة المحظورة قلت المودة المحظورة هی مناصحتهم و ارادة الخیر لهم دینا و دنیا مع کفرهم فاما ما سوی ذٰلک فلا حظر فیه[1]	اگر تم یہ سوال کرو کہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ کفار کے ساتھ میل جول رکھنا، معاملات کرنا اور معاشرتی تعلقات رکھنا جائز ہے تو یہ وہ کون سی مودت ہے جس سے منع کیا گیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ ان کے کفر کے باوجود ان کے ساتھ دین و دنیا کے پہلو سے اخلاص اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرے تمام معاملات میں ان سے موالات ممنوع نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے کہ کفار سے تعلقات

---

[1] خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل: ۱/۴۶

رکھے جائیں، یا نہ رکھے جائیں۔ ان سے ہر طرح کے تعلقات رکھے جاسکتے ہیں، البتہ ایک مسلمان دل سے یہ نہیں چاہ سکتا اور ایسا رویہ نہیں اختیار کرسکتا جس سے ان کے کفر و شرک کی تائید ہو، اس لیے کہ ان کے ساتھ اخلاص و خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں راہِ حق دکھائی جائے اور اسلام کی صداقت ان پر واضح کی جاتی رہے۔

☆☆

کتابیات

کتاب میں قرآن مجید کی آیات کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ دوسرے ماخذ کے حوالے حواشی میں ہیں۔ وہاں ان کے مصنّفین، مطابع اور سنینِ طباعت کی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے اس کی تفصیل دی جا رہی ہے، تاکہ مراجعت میں آسانی ہو۔ البتہ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے مطابع کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

تفسیر

۱- آلوسی، شہاب الدین السید محمود البغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر۔

۲- ابن جوزی، ابو الفرج جمال الدین عبد الرحمٰن بن علی بن محمد، القرشی البغدادی، زاد المسیر فی علم التفسیر، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء

۳- ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم، مطبع مصطفیٰ محمد مصر، ۱۳۵۶ھ

۴- ابو السعود، محمد بن محمد بن مصطفیٰ العمادی، ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم، برحاشیہ التفسیر الکبیر للرازی۔ (دیکھئے:۸)

۵- بغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء۔ معالم التنزیل، برحاشیہ خازن (دیکھئے ٦)

٦- خازن، علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی، لباب التاویل فی معانی التنزیل، مطبعۃ التقدم العلمیۃ، مصر، ۱۳۴۹ھ

۷- رشید رضا، تفسیر القرآن الکریم (تفسیر المنار) دار المنار، مصر، ۱۳۶۵ھ

۸- رازی، فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المطبعۃ العامرۃ الشرفیۃ مصر، ۱۳۰۸ھ

۹- زمخشری، ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۹۷۳ء
۱۰- شوکانی، محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر، تحقیق احمد عبد السلام، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴
۱۱- طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، المطبعۃ الکبریٰ مصر کے قدیم نسخہ ۱۳۲۹ھ کی نئی طباعت دار المعرفۃ بیروت، لبنان ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء، طبع جدید: تحقیق محمود محمد شاکر، احمد محمد شاکر، دار المعارف مصر، ۱۹۶۹ء۔ نامکمل۔ ابتدائی سولہ جلدیں پیش نظر ہیں۔
۱۲- قرطبی، ابوعبد اللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، الہیۃ المصریۃ العلمۃ، ۱۹۸۷ء
۱۳- ماوردی، ابو الحسن علی بن حبیب البصری، النکت والعیون (تفسیر الماوردی)، تحقیق خضر محمد خضر، مطابق المقہوی الکویت، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء

احکام القرآن

۱۴- ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبد اللہ الاشبیلی المالکی، احکام القرآن، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۳۱ھ
۱۵- جصاص، ابوبکر احمد بن علی الرازی الحنفی، احکام القرآن، المطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۴۷ھ

حدیث

۱۶- ابن ماجہ، ابوعبد اللہ محمد بن یزید بن عبد اللہ القزوینی، سنن ابن ماجہ
۱۷- ابوداؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داؤد
۱۸- احمد بن حنبل الشیبانی، المسند، طبع قدیم: المطبعۃ المیمنیۃ مصر، ۱۳۱۳ھ۔ طبع جدید: شرح و تحقیق: احمد محمد شاکر، دار المعارف مصر، ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء۔ نامکمل۔ ابتدائی بیس جلدیں پیش نظر ہیں۔
۱۹- بخاری، ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ ﷺ و ایامہ۔
۲۰- بخاری، ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل، الادب المفرد مع الشرح (فضل اللہ الصمد) المطبعۃ السلفیۃ و مکتبتہا القاہرۃ، ۱۳۷۸ھ
۲۱- بغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء، شرح السنۃ، تحقیق زہیر الشاویش وشعیب الارناؤط، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء
۲۲- بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین بن علی، السنن الکبریٰ، (ابن الترکمانی کی تلخیص کے ساتھ شائع ہوئی ہے)، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد دکن، ۱۳۵۵ھ

۲۳- ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع الترمذی۔
۲۴- حاکم، ابوعبد اللہ محمد بن عبد اللہ النیسابوری، المستدرک علی الصحیحین، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد، دکن، ۱۳۳۴ھ
۲۵- دارقطنی، ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی الشافعی، السنن، المطبع الانصاری، دہلی، ۱۳۱۰ھ
۲۶- دارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمٰن السمرقندی، سنن الدارمی، تحقیق: فواد احمد الزمرلی، خالد السبع العلمی، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء
۲۷- زیلعی، جمال الدین ابومحمد عبد اللہ الحنفی، نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ، دار الحدیث القاہرۃ۔
۲۸- عبد الرزاق، ابوبکر عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی، المصنف، تحقیق: حبیب الرحمٰن الاعظمی، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء
۲۹- مالک بن انس الاصبحی۔ المؤطا
۳۰- محمد بن حسن الشیبانی، کتاب الآثار، مطبع اسلامی لاہور، ۱۹۱۱ء
۳۱- مسلم بن حجاج القشیری النیسا بوری، صحیح مسلم
۳۲- نسائی، ابوعبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی، سنن النسائی

شروح حدیث

۳۳- ابن الترکمانی، علاء الدین، الجوہر النقی علی السنن الکبریٰ للبیہقی (تلخیص) برحاشیہ بیہقی (دیکھئے، نمبر ۲۲)
۳۴- ابن حجر، الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء
۳۵- ابن دقیق العید، ابوالفتح تقی الدین محمد بن علی القشیری، احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر، ۱۳۴۶ھ
۳۶- خطابی، ابوسلیمان احمد بن محمد، معالم السنن، المطبعۃ العلمیۃ حلب، ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء
۳۷- زرقانی، محمد بن عبد الباقی بن یوسف بن احمد شہاب الدین، شرح الزرقانی علی الموطا، المطبعۃ الخیریۃ مصر، ۱۳۱۰ھ
۳۸- شوکانی، محمد بن علی بن محمد، نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر، ۱۳۴۴ھ
۳۹- عظیم آبادی، شمس الحق، عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، مطبع انصاری دہلی، ۱۳۲۳ھ

۴۰- عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء
۴۱- فضل اللہ الجیلانی، فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد، المطبعۃ السلفیۃ القاہرۃ، ۱۳۷۸ھ
۴۲- مناوی، محمد المدعو بعبد الرؤف، فیض القدیر بشرح الجامع الصغیر، دار احیاء السنۃ النبویۃ، ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۸ء۔
۴۳- نووی، محی الدین ابوزکریا یحییٰ، شرح مسلم، دار الریان للتراث قاہرہ، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء

فقہ

۴۴- ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد القرطبی، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، تحقیق وتعلیق: شیخ علی محمد معوض، شیخ عادل احمد عبد الودود، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۷ء
۴۵- ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، رد المحتار علی الدر المختار، المطبعۃ العثمانیۃ مصر، ۱۳۲۷ھ
۴۶- ابن قدامہ، ابو محمد عبد اللہ احمد بن محمد المقدسی، المغنی علی مختصر الخرقی، تحقیق: الدکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، الدکتور عبد الفتاح محمد الحلو القاہرۃ، مصر، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۲ء
۴۷- ابن قیم، شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر الحنبلی الدمشقی، احکام اہل الذمۃ، تحقیق: ابو براء یوسف بن احمد البکر ی و ابو احمد شاکر بن توفیق العاروری، رمادی للنشر، الدمام، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، ۱۹۹۷ء۔
۴۸- ابن ہبیرہ، عون الدین ابو المظفر یحییٰ بن محمد الحنبلی، الافصاح عن معانی الصحاح، المؤسسۃ السعیدیۃ الریاض، ۱۳۹۸ھ
۴۹- ابن الہمام، محمد بن عبد الواحد السیواسی الحنفی، فتح القدیر، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ مصر، ۱۳۱۵ھ
۵۰- ابو عبید، القاسم بن سلام الہروی، کتاب الاموال، دار الفکر القاہرۃ، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء
۵۱- ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم بن حبیب الکوفی البغدادی، کتاب الخراج، دار المعرفۃ بیروت، لبنان
۵۲- الحصکفی، محمد علاء الدین، الدر المختار فی شرح تنویر الابصار بر حاشیہ رد المحتار (دیکھئے نمبر ۴۵)
۵۳- الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد بن احمد، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذہب الامام مالک، دار المعارف، مصر، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۴ء
۵۴- السیوطی، جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر الخضیری، الاشباہ والنظائر، دار الکتب العلمیۃ بیروت۔
۵۵- مرغینانی، برہان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر، الہدایۃ شرح البدایۃ (مختصر القدوری)، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ۱۳۵۸ھ

سیرت و تاریخ و تذکرہ

۵۶- ابن الاثیر، عزالدین ابوالحسن علی بن محمد الجزری، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، دار الشعب القاہرۃ، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء
۵۷- ابن حجر، الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، القاہرۃ، مصر۔
۵۸- ابن سعد، ابوعبداللہ محمد بن سعد بن منیع الزہری، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت۔
۵۹- ابن عبد البر، ابوعمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد القرطبی المالکی۔الاستیعاب فی اسماء الاصحاب بر حاشیہ الاصابۃ (دیکھئے نمبر ۵۶)۔
۶۰- ابن قیم، شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر الحنبلی الدمشقی، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، تحقیق: شعیب الارناؤط، عبد القادر الارناوؤط۔ طبع بیروت، ۱۹۸۷ء
۶۱- ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین اسماعیل، السیرۃ النبویۃ، تحقیق: مصطفیٰ عبد الواحد، دار المعرفۃ بیروت، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء
۶۲- ابن ہشام، ابومحمد عبد الملک، سیرۃ النبی، تحقیق: محمد محی الدین عبد الحمید، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء
۶۳- طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، تاریخ الرسل والملوک، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم، دار المعارف القاہرۃ، طبع چہارم۔

لغت

۶۴- ابن الاثیر، مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد الجزری۔ النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر۔ المطبعۃ العثمانیہ مصر، ۱۳۱۱ھ
۶۵- ابن منظور، ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری، لسان العرب، دار بیروت للطباعۃ والنشر، ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء
۶۶- الاصفہانی، ابو القاسم الحسین بن محمد بن الفضل الراغب، المفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ المیمنۃ مصر، ۱۳۲۴ھ
۶۷- الجوہری، ابونصر اسماعیل حماد، تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ، طبع مصر، ۱۲۸۲ھ
۶۸- الفیروز آبادی، مجد الدین محمد، القاموس المحیط، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء

۶۹- نووی، ابوزکریا محی الدین یحییٰ بن شرف، تہذیب الاسماء واللغات، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر۔
۷۰- المعجم الوسیط۔ دار الفکر مصر۔

ادب

۷۱- ابن عبد ربہ، ابوعمر احمد بن محمد بن عبد ربہ الاندلسی، العقد الفرید، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء

اِشاریۂ شخصیات

یہ اشاریہ کتاب میں مذکور صرف مسلم شخصیات کا ہے، اس میں غیر مسلم شخصیات کا ذکر نہیں ہے۔ بعض ہم نام شخصیات کی تعیین میں دشواری پیش آئی، لیکن مضمون کے سیاق وسباق سے ان کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔

(الف)

۱- آلوسی: (۱۲۱۷-۱۲۷۰ھ) شہاب الدین محمود بن عبد اللہ الحسینی البغدادی۔ مفسر، محدث، ادیب۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت تفسیر 'روح المعانی' کو حاصل ہوئی۔

۲- ابراہیم بن محمد ﷺ: ماریہ قبطیہ سے آں حضرت ﷺ کے صاحب زادے۔ سنہ ۸ھ میں ولادت ہوئی اور اٹھارہ ماہ بعد وفات ہوگئی۔

۳- ابن ابی حدردؓ: (م ۷۱ھ) صحابیِ رسول۔ نام عبد اللہ۔

۴- ابن ابی شیبہ: (۱۵۹-۲۳۵ھ) ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ العبسی الکوفی۔ حافظِ حدیث۔ آپ کی متعدد تالیفات ہیں، جن میں المصنف فی الاحادیث والآثار بہت مشہور ہوئی۔

۵- ابن ابی لیلیٰ: (۷۴-۱۴۸ھ) محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ یسار بن بلال الانصاری الکوفی۔ قاضی اور فقیہ۔ بنوامیہ اور بنوعباس کے دور میں ۳۳ سال تک کوفہ کے قاضی رہے۔

۶- ابن الاثیر: (۵۴۴-۶۰۶ھ) ابو السعادات مجد الدین المبارک بن محمد الجزری۔ موصل کے باشندہ۔ قرآن، حدیث، فقہ اور نحو کے زبردست عالم۔ حدیث میں جامع الاصول فی احادیث الرسول اور لغاتِ حدیث میں 'النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر' آپ کی مشہور تصانیف ہے۔

۷- ابن الاثیر: (۵۵۵-۶۳۱ھ) عز الدین ابو الحسن علی۔ مشہور مورخ۔ 'الکامل فی التاریخ' اور اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، آپ کی اہم تصانیف ہیں۔

۸- ابن بطال: (م ۴۴۹ھ) ابو الحسن علی بن خلف بن عبد الملک القرطبی۔ مشہور محدث۔ آپ نے صحیح بخاری کی شرح تصنیف کی ہے۔

۹- ابن جریج: (م ۱۵۰ھ) عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج المکی۔ مشہور فقیہ تابعی۔

۱۰- ابن الجوزی: (۵۰۸-۵۹۷ھ) ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد القرشی البغدادی۔ اپنے عہد میں تاریخ اور حدیث کے امام۔ مختلف علوم میں آپ کی تقریباً تین سو کتابیں ہیں، جن میں زاد المسیر فی علم التفسیر، تلبیس ابلیس، کتاب الضعفاء والمتروکین، نزہۃ الاعین النواظر فی علم الوجوہ والنظائر اور الموضوعات فی الاحادیث المرفوعات کو شہرت حاصل ہوئی۔

۱۱- ابن حبان: (م ۳۵۴ھ) ابو حاتم محمد بن حبان البستی۔ سجستان کے باشندہ۔ فقہ، حدیث، طب اور نجوم کے عالم۔ المسند الصحیح، التاریخ، روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

۱۲- ابن حجر: (۷۷۳-۸۵۲ھ) الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی۔ مصر کے باشندہ۔ حدیث اور علوم حدیث میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخ اور فقہ شافعی میں بھی شہرت تھی۔ ۱۵۰ سے زائد تصانیف ہیں، جن میں فتح الباری شرح صحیح البخاری اور الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

۱۳- ابن حزم: (۳۸۴-۴۵۶ھ) ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الظاہری۔ اندلس کے مشہور صاحب مذہب فقیہ۔ مختلف علوم میں بہت سی تصانیف ہیں، جن میں الفصل فی الملل والاہواء والنحل، المحلّٰی، جوامع السیرۃ اور الاحکام فی اصول الاحکام شہرت رکھتی ہیں۔

۱۴- ابن خویز منداد مالکی: (م ۳۹۰ھ) عراق کے مالکی فقیہ۔ ان کی تصانیف میں کتاب فی اصول الفقہ اور اختیارات فی الفقہ قابل ذکر ہیں۔

۱۵- ابن دقیق العید: (۶۲۵-۷۰۲ھ) ابو الفتح تقی الدین محمد بن علی بن وہب بن مطیع القشیری۔ مجتہد فقیہ۔ مصر میں منصبِ قضاء پر فائز رہے۔ حدیث و فقہ وغیرہ میں متعدد تصانیف ہیں، جن میں احکام الاحکام اور الالمام باحادیث الاحکام اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۶- ابن رشد (م ۱۱۹۸ء) ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد۔ اندلس کے مشہور فقیہ، فلسفی اور طبیب۔ فقہ میں بدایۃ المجتہد، فلسفہ میں تھافت التھافت اور طب میں کتاب الکلیات کو غیر معمولی شہرت ملی۔

۱۷- ابن زید: تابعی، نام محمد، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پوتے، امام اعمش کے استاد۔

۱۸- ابن سعد: (۱۶۸-۲۳۰ھ) ابو عبد اللہ محمد بن سعد بن منیع الزہری۔ معتبر مورخ اور حافظ حدیث۔ واقدی کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے کاتبِ واقدی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کی کتاب الطبقات الکبریٰ مشہور ہے۔

۱۹- ابن سیرین: (م ۱۱۰ھ) ابو بکر محمد بن سیرین البصری الانصاری۔ جلیل القدر تابعی۔ حضرت انس بن مالکؓ کے آزاد کردہ غلام۔ حضرت انسؓ، ابن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں۔

۲۰- ابن شبرمہ: (م ۱۴۴ھ) عبد اللہ بن شبرمہ بن الطفیل الکوفی القاضی۔ فقیہِ اہل کوفہ، تابعی۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت حدیث کی۔ سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، شعبہؒ اور عبد اللہ بن المبارکؒ

وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔

۲۱- ابن عابدین: (۱۱۹۸-۱۲۵۲ھ) محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقی۔ فقیہ شام، اپنے وقت میں فقہ حنفی کے امام۔ فقہ وفتاویٰ، اصول، بلاغت، فرائض اور تفسیر میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ درمختار پر آپ کے حاشیہ 'رد المختار' کو غیر معمولی شہرت ملی۔

۲۲- ابن عبد البر: (۳۶۸-۴۶۳ھ) ابوعمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر النمری القرطبی المالکی۔ عظیم حافظِ حدیث، مورخ، ادیب۔ فقہ، تراجم، سیرت، علم قرات اور انساب وغیرہ پر آپ کی بہت سی تصانیف ہیں، جن میں الدرر فی اختصار المغازی والسیر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، جامع بیان العلم وفضلہ اہمیت رکھتی ہیں۔

۲۳- ابن عبد ربہ: (۲۴۶-۳۲۸ھ) ابوعمر احمد بن محمد بن عبد ربہ الاندلسی۔ قرطبہ کے مشہور ادیب اور شاعر۔ آپ کی تصنیف العقد الفرید عربی ادب کی مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔

۲۴- ابن عدی: (۲۷۷-۳۶۵ھ) ابو احمد عبد اللہ بن عدی بن عبد اللہ بن محمد بن مبارک بن القطان الجرجانی۔ حدیث اور اسماء الرجال میں ماہر تھے۔ اس فن میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین من الرواۃ اور علل الحدیث مشہور ہیں۔

۲۵- ابن العربی المالکی: (۴۶۸-۵۴۳ھ) ابوبکر محمد بن عبد اللہ بن محمد المعافری الاشبیلی المالکی۔ حافظِ حدیث، اشبیلیہ میں منصبِ قضا پر فائز رہے۔ حدیث، فقہ، اصول، تفسیر، ادب اور تاریخ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں العواصم من القواصم، احکام القرآن، عارضۃ الاحوذی فی شرح الترمذی اہم ہیں۔

۲۶- ابن عیینہ: (۱۰۷-۱۹۸ھ) ابومحمد سفیان بن عیینہ بن میمون الہلالی الکوفی۔ تابعی، امام زہری کے شاگرد۔ اعمش، ثوری، شعبہ، شافعی اور احمد وغیرہ نے آپ سے روایتِ حدیث کی ہے۔

۲۷- ابن قدامہ: (۵۴۱-۶۲۰ھ) ابومحمد موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ۔ مشہور حنبلی فقیہ۔ حدیث، فقہ و اصول فقہ، اصول دین، لغت اور انساب وغیرہ میں بہت سی تصانیف ہیں، جن میں المغنی، المقنع، العمدۃ اور الکافی کو بہت شہرت حاصل ہے۔

۲۸- ابن قیم الجوزیۃ: (۶۹۱-۷۵۱ھ) ابوعبد اللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزرعی الدمشقی۔ ابن تیمیہ کے مشہور شاگرد۔ مختلف اسلامی علوم میں قابل قدر اور اہم تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ان میں زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، اعلام الموقعین، احکام اہل الذمۃ، مدارج السالکین، التبیان فی اقسام القرآن اور ہدایۃ الحیاری فی الرد علی الیہود والنصاریٰ بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

۲۹- ابن کثیر: (۷۰۱-۷۷۴ھ) عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی۔ حافظِ حدیث، مورخ، فقیہ، مفسر۔ البدایۃ والنہایۃ، تفسیر القرآن العظیم، جامع المسانید، اختصار علوم الحدیث آپ کی اہم اور مشہور تصانیف ہیں۔

۳۰- ابن الکلبی: (م ۱۴۶ھ) ابو النضر محمد بن سائب بن بشر۔ تفسیر، ایام العرب اور انساب کے عالم

تھے۔ روایتِ حدیث میں ضعیف سمجھے جاتے تھے۔

۳۱- ابن ماجہ: (۲۰۹-۲۷۳ھ) ابوعبد اللہ محمد بن یزید۔ مشہور محدث۔ آپ کی کتاب سنن ابن ماجہ کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔

۳۲- ابن منذر: (۲۴۲-۳۱۹ھ) ابو بکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری۔ فقیہ مجتہد، حافظِ حدیث۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

۳۳- ابن منظور (۶۳۰-۷۱۱ھ) ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن علی الانصاری الرویفعی الافریقی۔ مشہور ماہر لغت۔ مختلف علوم وفنون میں بہت سی کتابوں کے اختصاریے تیار کیے۔ آپ کی تصنیف لسان العرب کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔

۳۴- ابن المنیّر: (۶۲۰-۶۸۳ھ) ناصر الدین احمد بن محمد الاسکندری المالکی۔ آپ کا شمار اسکندریہ کے علماء و ادباء میں شمار ہوتا ہے۔ منصبِ قضا پر فائز ہے۔ الانصاف فیما تضمنہ الکشاف من الاعتزال کے نام سے کشاف پر آپ کا حاشیہ علمی حلقوں میں شہرت رکھتا ہے۔

۳۵- ابن وہب: (۱۲۵-۱۹۷ھ) ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن مسلم الفہری۔ مالکی فقیہ، مجتہد، حافظِ حدیث۔ حدیث اور فقہ میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

۳۶- ابن وہبان حنفی: (م ۷۶۸ھ) امین الدین عبد الوہاب بن احمد بن وہبان الحارثی الدمشقی۔ حنفی فقیہ، ادیب، قاضی۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔

۳۷- ابن ہبیرہ: (م ۵۶۰ھ) عون الدین ابو المظفر یحییٰ بن محمد۔ حنبلی فقیہ۔ الافصاح عن معانی الصحاح آپ کی مشہور تصنیف ہے۔

۳۸- ابن ہشام: (م ۲۱۳ھ) ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری المعافری۔ مورخ۔ لغتِ اخبار عرب اور انساب کے عالم ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں السیرۃ النبویۃ کو (سیرت ابن ہشام کے نام سے) غیر معمولی شہرت ملی۔

۳۹- ابن الہمام: (۷۹۰-۸۶۱ھ) کمال الدین محمد بن عبد الواحد بن عبد الحمید بن مسعود۔ فقہ حنفی کے مشہور امام، مختلف علوم وفنون کے ماہر۔ فقہ میں ہدایہ کی شرح فتح القدیر اور اصول فقہ میں التحریر آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

۴۰- ابو امامہ الباہلیؓ: (م ۸۶ھ) صحابیِ رسول۔

۴۱- ابو بکر صدیقؓ (م ۱۳ھ) رسول اللہ ﷺ کے یارِ غار، خلیفۂ اول، نام عبد اللہ تھا۔ والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی۔

۴۲- ابو ثعلبہ خشنیؓ: (م ۷۵ھ) صحابیِ رسول۔ نام جرہم بن ناشب۔ بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔

۴۳- ابو ثور (م ۲۴۰ھ) ابراہیم بن خالد بن ابی الیمان الکلبی البغدادی۔ فقہ شافعی کے امام، علم وفضل

اور ورع وتقویٰ کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ متعدد کتابیں تالیف کیں۔

۴۴- ابو جندلؓ (م۱۸ھ) بن سہل بن عمرو القرشی العامری۔ صحابیِ رسول، خلافت فاروقی میں وفات ہوئی۔

۴۵- ابوجہم بن حذیفہؓ العدوی القرشی۔ نام عامر تھا۔ صحابی رسول، حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔

۴۶- ابوحفص عبکری: (م۳۳۹ھ) علمائے حنابلہ میں سے تھے، عبد اللہ بن احمد بن حنبل سے حدیث کی روایت کی۔

۴۷- ابوحمید الساعدیؓ: صحابی رسول، حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔

۴۸- ابوحنیفہ: (۸۰-۱۵۰ھ) نعمان بن ثابت۔ فقہ حنفی کے بانی، ائمہ اربعہ میں سے ہیں۔ حماد بن ابی سلیمان، عطا بن ابی رباح، محمد بن المنکدر، نافع اور ہشام بن عروہ وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ عبد اللہ بن مبارک، وکیع، قاضی ابو یوسف اور امام محمد وغیرہ نے آپ سے کسبِ فیض کیا۔

۴۹- ابو الخطاب (۴۳۲-۵۱۰ھ) محفوظ بن احمد الحسن الکلو ذاتی البغدادی۔ اپنے عہد میں فقہ حنبلی کے امام تھے۔ فقہ وفرائض میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔

۵۰- ابوداؤد: (۲۰۲-۲۷۵ھ) سلیمان بن الاشعث۔ مشہور محدث، آپ کی کتاب سننِ ابی داؤد کا صحاحِ ستہ میں شمار ہوتا ہے۔

۵۱- ابو الدرداءؓ: (م۳۲ھ) صحابی رسول، انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔

۵۲- ابوذر غفاریؓ: (۳۲ھ) مشہور صحابیِ رسول۔ عبادت و زہد میں مشہور تھے۔

۵۳- ابو السعود (۸۹۸-۹۸۲ھ) محمد بن محمد بن مصطفیٰ العمادی۔ ترکی کے عالم، مفسر اور شاعر۔ قضاء کے منصب پر فائز رہے۔ عربی، فارسی اور ترکی میں استفتاء کا جواب دیتے تھے۔ ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم آپ کی مشہور تفسیر ہے۔

۵۴- ابوسعید خدریؓ: (م۷۴ھ) نام سعد بن مالک الانصاری۔ صحابی رسول۔

۵۵- ابوسفیانؓ بن حرب اموی: (م۳۴ھ) صحابی رسول۔ اشرافِ قریش میں سے تھے۔

۵۶- ابو صالح: تابعی، ام المومنین حضرت جویریہ بنت الحارثؓ کے آزاد کردہ غلام، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایتِ حدیث کی۔ اعمش کے استاد۔

۵۷- ابو العالیہ: (م۹۰ھ) نام رفیع بن مہران۔ تابعی، حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت ابی بن کعب سے احادیث روایت کی ہیں۔

۵۸- ابوعبید: (۱۵۷-۲۲۴ھ) القاسم بن سلام الہروی الازدی۔ حدیث، فقہ اور ادب کے بڑے عالم، منصب قضا پر فائز رہے۔ غریب القرآن، قراءت، حدیث اور دیگر موضوعات پر متعدد تصانیف ہیں، جن میں کتاب الاموال، الغریب المصنف اور کتاب الامثال مشہور ہیں۔

۵۹- ابوعبیدہ بن الجراحؓ: (م۱۸ھ) صحابی رسول۔ عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔

۶۰- ابومجلز (م۱۰۶ھ) لاحق بن حمید السدوسی۔ تابعی، حضرات صحابہ: ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، انسؓ، ابوموسیٰ

اشعریؓ وغیرہ سے سماعت کی۔ ابن سیرین، ایوب سختیانی اور قتادہ وغیرہ کے استاد تھے۔

۶۱- ابو موسیٰ اشعریؓ: (م ۵۲ھ) صحابی رسول، نام عبد اللہ بن قیس۔

ابو میسرہ: دیکھئے عمرو بن شرحبیل

۶۲- ابو نعیم (۳۳۴-۴۳۰ھ) احمد بن عبد اللہ الاصفہانی۔ مشائخ حدیث میں سے تھے۔ آپ کی تصنیف حلیۃ الاولیاء مشہور ہے۔

ابو وائل: دیکھئے شقیق بن ابی سلمہ۔

۶۳- ابو ہریرہؓ: (م ۵۷ھ) صحابی رسول۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحابہ کرام میں سب سے زیادہ آپ سے مروی ہیں۔

۶۴- ابو یعلیٰؒ: (۳۸۰-۴۵۸ھ) محمد بن الحسین بن محمد بن خلف ابن الفراء۔ حنبلی فقیہ، بغداد میں اپنے عہد کے بڑے عالم۔ منصب قضا پر فائز رہے۔ مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ فقہ و اصول فقہ، ادب اور طب وغیرہ میں متعدد تصانیف ہیں جن میں، الاحکام السلطانیۃ اور الکفایۃ فی اصول الفقہ کو شہرت حاصل ہوئی۔

۶۵- ابو یوسف: (۱۱۳-۱۸۲ھ) یعقوب بن ابراہیم بن حبیب الکوفی البغدادی۔ امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید، فقیہ، حافظ حدیث۔ طویل عرصے تک بغداد کے قاضی رہے۔ سب سے پہلے اصول فقہ کے موضوع پر کام کیا۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں کتاب الخراج اور کتاب الآثار بہت مشہور اور اہم ہیں۔

۶۶- احمد الدردیر (۱۱۲۷-۱۲۰۱ھ) ابو البرکات احمد بن محمد بن احمد العدوی۔ مصر کے مشہور مالکی فقیہ، ازہر میں تعلیم پائی، اقرب المسالک لمذہب الامام مالک اور فتح القدیر آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

۶۷- احمد بن حنبل: (۱۶۴-۲۴۱ھ) ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی الوائلی۔ فقہ حنبلی کے بانی، ائمہ اربعہ میں سے ہیں۔ یحییٰ بن سعید، سفیان بن عیینہ اور امام شافعی وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ بخاری، مسلم، ابو زرعہ اور ابو داؤد وغیرہ کے استاد۔

۶۸- احمد محمد شاکر: (۱۳۰۹-۱۳۷۷ھ) مصری نژاد عالم۔ مسند احمد کی شرح اور تفسیر ابن کثیر کی تلخیص کی۔ متعدد مراجع اور امہات کتب کی تحقیق کی۔

۶۹- اذینہ العبدی: تابعی، حجاج کے زمانے میں بصرہ کے قاضی تھے۔ حضرت عمرؓ سے بعض احادیث روایت کی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے عبد الرحمٰن نے روایت کی ہے۔

۷۰- اروی بنت ربیعہؓ بن الحارث بن عبد المطلب: صحابیۂ رسول۔

۷۱- ازہری (۲۸۲-۳۷۰ھ) ابو منصور محمد بن احمد بن الازہر الہروی۔ لغت و ادب کے امام۔ خراسان کے باشندہ۔ فقہ میں بھی مہارت تھی۔ 'تہذیب اللغۃ' اور 'غریب الالفاظ التی استعملھا الفقہاء' آپ

کی مشہور کتابیں ہیں۔

۷۲- اسامہ بن زیدؓ: (م ۵۴ھ) رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام، حضرت زید بن حارثہؓ کے بیٹے اور منظورِ نظر صحابی۔

۷۳- اسحاق بن راہویہ: (۱۶۱-۲۳۸ھ) ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم بن مخلد الحنظلی التمیمی۔ مشہور تابعی۔ حدیث اور فقہ کے جامع۔ طلب علم میں مختلف ممالک کا سفر کیا، پھر نیسا پور میں اقامت اختیار کی۔ احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور دیگر محدثین نے آپ سے روایتیں لی ہیں۔

۷۴- اسحاق بن عبد اللہ بن حارث: (م ۱۳۲ھ) الانصاری۔ مدینہ کے ثقہ تابعی، امام مالک کے استاد۔ امام مالک ان سے زیادہ کسی کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

۷۵- اسماء بنت ابی بکرؓ: (م ۷۳ھ) حضرت ابو بکرؓ صدیق کی بڑی صاحب زادی، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی والدہ، ذات النطاقین آپ کا لقب تھا۔

۷۶- اسماعیل بن اسحاق: (۲۰۰-۲۸۲ھ) بن اسماعیل بن حماد بن زید الجہضمی الازدی۔ مالکی فقیہ۔ بغداد و مدائن وغیرہ کے قاضی رہے۔ فقہ میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں الموطا، احکام القرآن، المبسوط، الاحتجاج بالقرآن (دو جلدیں) اور شواہد الموطا (۱۰ جلدیں) شہرت رکھتی ہیں۔

۷۷- اسماعیل بن محمد: (م ۱۳۴ھ) تابعی، مشہور صحابیِ رسول حضرت سعد بن وقاصؓ کے پوتے، حضرت انسؓ سے روایت حدیث کی۔ ان کا شمار فقہاء مدینہ کے چوتھے طبقے میں ہوتا ہے۔ سفیان بن عیینہ، ابن جریج، مالک اور زہری وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔

۷۸- اشہب: (۱۴۵-۲۰۴ھ) ابو عمرو بن عبد العزیز بن داؤد القیسی العامری الجعدی۔ مالکی فقیہ۔ اپنے عہد کے زبردست عالم دین۔ مصر کے باشندہ۔

۷۹- ام ہانیؓ: (م مابعد ۴۰ھ) صحابیہ رسول، حضرت علی بن ابی طالبؓ کی بہن۔

۸۰- امیمہ بنت بشرؓ: صحابیہ رسول، انصار کے قبیلہ اوس سے تعلق تھا۔ حضرت سہل بن حنیف کی زوجہ۔

۸۱- انس بن مالکؓ: (م ۹۱ھ) الانصاری۔ خادم رسول ﷺ۔ قبیلۂ خزرج سے تعلق تھا۔

۸۲- اوزاعی: (۸۸-۱۵۸ھ) ابو عمرو عبد الرحمٰن بن عمرو بن یحمد، شام کے مشہور فقیہ، عہدۂ قضا کی پیش کش کی گئی، مگر قبول نہیں کیا۔ فقہ میں السنن اور المسائل آپ کی تصانیف ہیں۔

(ب)

۸۳- بخاری: (۱۹۴-۲۵۶ھ) ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل۔ مشہور محدث۔ آپ کی کتاب الجامع الصحیح کا صحاحِ ستہ میں شمار ہوتا ہے۔ امت کی اکثریت نے اسے اصح کتاب بعد کتاب اللہ (قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب) کہا ہے۔

۸۴- بدیل: بن ورقاء الخزاعی، صحابی رسول، عہد نبوی میں وفات پا گئے تھے۔
۸۵- بریدہؓ: (م ٦٢ھ) بن الحصیب الاسلمی، صحابی رسول، غزوۂ بدر سے قبل اسلام قبول کیا۔ بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔
۸٦- بزار: (م۲۹۲ھ) ابوبکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق۔ بصرہ کے مشہور محدث۔ حدیث میں آپ کی تالیف مسند بزار مشہور ہے۔
۸۷- بشر بن براءؓ: (م۷ھ) صحابی رسول، انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔ بیعت عقبہ اور بدر و اُحد میں شریک رہے۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر وفات پائی۔
۸۸- بغوی: (م۵۱٦ھ) ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء۔ فقہ و حدیث کے امام۔ آپ کی تصانیف میں حدیث میں کتاب المصابیح اور شرح السنہ، فقہ میں کتاب التہذیب اور تفسیر میں معالم التنزیل شہرت رکھتی ہیں۔
۸۹- بلاذری: (م۲۷۹ھ) احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد البغدادی۔ مورخ، جغرافیہ داں، ماہر انساب۔ فتوح البلدان اور انساب الاشراف آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔
۹۰- بلالؓ بن رباح: (م۲۰ھ) حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام۔ موذنِ رسول ﷺ۔ حضرت عمرؓ نے انھیں سیدنا بلال کہا ہے۔
۹۱- بیہقی: (۳۸۴-۴۵۸ھ) ابو بکر احمد بن الحسین۔ حدیث کے امام۔ السنن الکبریٰ آپ کی مشہور تالیف ہے۔

(ت)

۹۲- ترمذی: (۲۰۹-۲۷۹ھ) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ۔ مشہور محدث، آپ کی کتاب جامع الترمذی کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔
۹۳- تمیم داریؓ: صحابی رسول۔ پہلے عیسائی تھے۔ سنہ ۹ھ میں اسلام قبول کیا۔

(ث)

۹۴- ثمامہ بن اُثالؓ: صحابی رسول، یمامہ کے سردار۔
۹۵- ثوری: (۹۷-۱٦۱ھ) ابوعبد اللہ سفیان بن سعید بن مسروق کوفہ کے مشہور تابعی۔ حدیث اور فقہ کے جامع۔ امام مالک، اوزاعی، ابن جریج، سفیان بن عیینہ، معمر اور شعبہ وغیرہ نے آپ سے روایتِ حدیث کی ہے۔
۹٦- ثویر بن ابی فاختہ: حضرت ام ہانی بنت ابی طالبؓ کے آزاد کردہ غلام۔ محدثین نے انھیں ضعیف اور متروک قرار دیا ہے۔

(ج)

۹۷- جابرؓ بن عبد اللہ الانصاری: (م ۷۴ھ) صحابی رسول۔ تمام غزوات میں شرکت کی۔
۹۸- جارود بن المعلّٰی العبدی (بشر بن عمرو) سنہ ۹ھ میں وفد عبد القیس کے ساتھ خدمت نبوی میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا۔ ۲۰ھ میں خلافتِ فاروقی میں شہید ہوئے۔
۹۹- جصاص: (۳۰۴-۳۷۰ھ) ابوبکر احمد بن علی الرازی۔ رے کے مشہور حنفی فقیہ، بغداد میں قیام رہا۔ عہدۂ قضا پیش کیا گیا، مگر اسے قبول نہیں کیا۔ آپ کی کتابوں میں احکام القرآن کو خاص شہرت حاصل ہے۔
۱۰۰- جوہری: (م ۳۹۳ھ) ابونصر اسماعیل بن حماد۔ مشہور ماہر لغت۔ الصحاح آپ کی مشہور تصنیف ہے۔

(ح)

۱۰۱- حارث بن ابی ربیعہ: حضرت عبد اللہ بن ابی ربیعہ المخزومیؓ کے صاحب زادے، تابعی، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے بصرہ کا عامل بنایا تھا۔
۱۰۲- حازمی: (۵۴۸-۵۸۴) ابوبکر محمد بن موسیٰ بن عثمان بن حازم۔ مشہور محدث۔ بغداد میں وفات پائی۔ حدیث و اصول حدیث اور انساب پر آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں حدیث میں الاعتبار فی بیان الناسخ والمنسوخ من الآثار اور اصولِ حدیث میں شروط الائمۃ الخمسۃ شہرت رکھتی ہیں۔
۱۰۳- حاطب بن ابی بلتعہؓ: (م ۳۰ھ) بدری صحابی۔
۱۰۴- حاکم (۳۲۱-۴۰۵ھ) ابوعبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن حمدویہ بن نعیم النیسا بوری۔ حافظ حدیث، قاضی نیسابور۔ حدیث، اصولِ حدیث اور اسماء الرجال کے ماہر۔ المستدرک علی الصحیحین، المدخل اور معرفۃ اصول الحدیث آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔
۱۰۵- حذیفہؓ بن الیمان: (م ۳۵ھ) صحابی رسول، آں حضرت ﷺ کے رازدار۔ دورِ فتن سے متعلق آں حضرتؐ کی پیشین گوئیوں سے سب سے زیادہ واقف تھے۔
۱۰۶- حسان بن ثابتؓ: (م ۵۴ھ) شاعرِ رسول، انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔
۱۰۷- حسنؓ بن علی: (۳-۴۹ھ) رسول اللہ ﷺ کے نواسے۔ حضرت علی بن ابی طالب کے بڑے صاحب زادے۔
۱۰۸- حسن بصری: (۲۱-۱۱۰ھ) ابوسعید الحسن بن یسار البصری۔ جلیل القدر تابعی، علم وفن اور زہد و ورع میں امامِ وقت۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، انس بن مالکؓ، ابن عباسؓ وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں۔
۱۰۹- حسینؓ بن علی: (۴-۶۱ھ) رسول اللہ ﷺ کے نواسے، حضرت علی بن ابی طالبؓ کے چھوٹے صاحب زادے۔

(خ)

۱۱۰- خازن: (۶۷۸-۷۴۱ھ) علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم الشیحی۔ شام کے شافعی فقیہ۔ تصوف کا بھی ذوق اور رجحان تھا۔ آپ کی تفسیر 'لباب التاویل فی معانی التنزیل' تفسیر خازن کے نام سے مشہور ہے۔

۱۱۱- خالد بن سعید بن العاصؓ: (م ۱۴ھ) صحابی رسول، قدیم الاسلام، مہاجر حبشہ، رسول اللہ ﷺ کے کاتب۔

۱۱۲- خالد بن عبد اللہ قسری: (۶۶-۱۲۶ھ) عرب کے مشہور خطیب اور شہ سوار۔ اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے مکہ کا والی مقرر کیا تھا۔ پھر ہشام نے کوفہ و بصرہ کا والی بنایا۔ آخر میں ان پر زندقہ کا الزام لگا، جس کی بنا پر انھیں قتل کر دیا گیا۔

۱۱۳- خالد بن مہاجر: تابعی، حضرت خالد بن ولیدؓ کے پوتے۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے روایتِ حدیث کی۔ ابن شہاب زہریؒ نے ان سے روایت کی ہے۔

۱۱۴- خالد بن ولیدؓ: (م ۲۱ھ) صحابی رسول۔ آں حضرت ﷺ نے سیف اللہ کا لقب مرحمت فرمایا تھا۔

۱۱۵- خبابؓ بن الارت تمیمی: (م ۳۷ھ) صحابی رسول۔ السابقون الاولون میں سے تھے۔

۱۱۶- خبیب بن اسافؓ: الانصاری الخزرجی، صحابی رسول۔ غزوۂ بدر کے موقعے پر اسلام قبول کیا۔ حضرت عثمان کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

۱۱۷- خرقی (م ۳۳۴ھ) ابو القاسم عمر بن الحسین بن عبد اللہ۔ حنبلی فقیہ، بغداد کے باشندہ۔ فقہ میں آپ کی ایک کتاب المختصر ہے، جو مختصر الخرقی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کی شرح علامہ ابن قدامہ نے المغنی کے نام سے کی ہے۔

۱۱۸- خطابی: (م ۳۸۸ھ) ابو سلیمان احمد بن محمد۔ فقہ، حدیث اور ادب کے امام۔ معالم السنن، اعلاء السنن اور غریب الحدیث آپ کی اہم تصانیف ہیں۔

۱۱۹- خلال: (م ۳۱۱ھ) ابوبکر احمد بن محمد بن ہارون۔ بغداد کے باشندہ حنبلی فقیہ۔ تفسیر، حدیث اور لغت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔

(د)

۱۲۰- دار قطنی: (۳۰۶-۳۸۵ھ) ابو الحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی الشافعی۔ اپنے عہد میں حدیث کے امام۔ حدیث اور اسماء الرجال میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں السنن مشہور ہے۔

۱۲۱- دارمی: (۱۸۱-۲۵۵ھ) ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن۔ مشہور محدث۔ امام مسلم، ابوداؤد، اور ترمذی اور دیگر محدثین کے استاد۔ آپ کی کتاب سنن الدارمی کے نام سے مشہور ہے۔

۱۲۲- دحیہ کلبیؓ: (م ۴۵ھ) صحابی رسول، غزوہ احد اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ سنہ ۶ھ میں مکتوب نبوی لے کر قیصرِ روم کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ جبرئیل امین بعض اوقات آپ کی

صورت میں وحی لے کر آتے تھے۔

(ر)

۱۲۳- رازی: (۵۴۴-۶۰۶ھ) ابو عبد اللہ فخر الدین محمد بن عمر بن الحسن بن الحسین التیمی البکری۔ معقولات ومنقولات کے امام۔ کثیر التصانیف۔ آپ کی تفسیر 'مفاتیح الغیب' تفسیر کبیر کے نام سے معروف ہے۔ دیگر تصانیف میں المباحث الشرقیۃ، نہایۃ الایجاز فی علم الاعجاز، محصل افکار المتقدمین والمتاخرین شہرت رکھتی ہیں۔

۱۲۴- راغب اصفہانی: (م ۵۰۲ھ) ابو القاسم الحسین بن محمد بن المفضل۔ ادب ولغت کے امام۔ آپ کی تصانیف میں المفردات فی غریب القرآن کے علاوہ محاضرات الادباء اور الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ کو شہرت حاصل ہے۔

۱۲۵- ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن: (م ۱۳۶ھ) جلیل القدر تابعی۔ فقہاء مدینہ میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت سائب بن یزیدؓ سے سماعت کی۔ امام ثوریؒ اور امام مالک بن انسؒ کے استاد تھے۔

۱۲۶- رشید رضا مصری: (۱۲۸۲-۱۳۵۴ھ) مدیر مجلّہ المنار مصر، شیخ محمد عبدہ کے شاگردِ رشید، حدیث ادب، تاریخ اور تفسیر کے عالم۔ آپ کی تصانیف میں تفسیر المنار کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ اس کی ابتدائی جلدوں میں اپنے استاد محمد عبدہ کے افادات اور نوٹس پیش نظر رہے۔ بعد میں اسی نہج پر تفسیر لکھنی شروع کی۔ بارہ جلدوں میں بارہ پاروں کی تفسیر لکھی۔ مکمل نہ کر سکے۔ الوحی المحمدی، الخلافۃ، ذکری المولد النبوی، شبہات النصاری وحجج الاسلام آپ کی چند اہم تصانیف ہیں۔

(ز)

۱۲۷- زبیر بن العوامؓ: (م ۳۶ھ) صحابی رسول، آں حضرت ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی۔ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے۔

۱۲۸- زرقانی (۱۰۵۵-۱۱۲۲ھ) ابو عبد اللہ محمد بن عبد الباقی بن یوسف بن احمد بن علوان المصری الازہری المالکی۔ مصر میں اپنے عہد کے عظیم محدث۔ حدیث اور اصولِ حدیث میں متعدد تصانیف ہیں، جن میں شرح المواہب اللدنیۃ اور شرح موطا امام مالک شہرت رکھتی ہیں۔

۱۲۹- زفر: (۱۱۰-۱۵۸ھ) بن الہذیل بن قیس العنبری۔ مشہور حنفی فقیہ۔ قاضی بصرہ۔

۱۳۰- زمخشری: (۴۶۷-۵۳۸ھ) ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر بن محمد بن احمد الخوارزمی۔ تفسیر، لغت اور ادب کے امام۔ معتزلی۔ مختلف موضوعات پر بہت سی تصانیف ہیں، جن میں الکشاف عن حقائق التنزیل، الفائق فی غریب الحدیث، اساس البلاغۃ اور المفصل کو غیر معمولی شہرت ملی۔

۱۳۱- زہری (م ۱۲۴ھ) ابوبکر محمد بن عبد اللہ بن شہاب۔ جلیل القدر تابعی۔ محدث، فقیہ، متعدد صحابہ سے روایت کی۔ حضرت قتادہ اور امام مالک کے استاد۔

۱۳۲- زیلعی: (م ۷۶۲ھ) ابومحمد جمال الدین عبد اللہ بن یوسف بن محمد۔ فقیہ، محدث۔ نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ تخریج احادیث الکشاف بھی آپ کی تصنیف ہے۔

(س)

۱۳۳- سبیعہ بنت الحارث اسلمیہؓ: صحابیہ، حضرت سعد بن خولہؓ کی بیوی۔

۱۳۴- سعد بن ابی وقاصؓ: (م ۵۵ھ) صحابی رسول، عشرۂ مبشرہ میں سے تھے، عظیم سپہ سالار۔

۱۳۵- سعد بن عبادہؓ: (م ۱۵ھ) جلیل القدر صحابی رسول۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔ ان بارہ نقباء میں سے تھے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے بیعتِ عقبہ کے موقع پر نام زد فرمایا تھا۔

۱۳۶- سعد بن معاذؓ: (م ۵ھ) جلیل القدر صحابی۔ انصار کے قبیلۂ اوس کی شاخ بنو عبد الاشہل سے تعلق تھا۔ عقبہ کی دونوں بیعتوں میں شریک تھے۔

۱۳۷- سعید بن جبیر: (م ۹۵ھ) جلیل القدر تابعی۔ حضرات صحابہ ابو مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ اور انسؓ سے احادیث روایت کیں۔

۱۳۸- سعید بن العاصؓ: (م ۵۹ھ) صحابی رسول۔ سپہ سالار، حضرت عثمانؓ نے گورنر مقرر فرمایا تھا۔

۱۳۹- سعید بن المسیّب: (م ۷۴ھ) صحابی رسول، بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔

۱۴۰- سلمانؓ الفارسی: (م ۳۵ھ) صحابی رسول۔

۱۴۱- سلمہ بن اکوعؓ: (م ۷۴ھ) صحابی رسول، بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔

۱۴۲- سلیمان الاعمش: (۶۰-۱۴۸ھ) ابومحمد سلیمان بن مہران الاسدی۔ تابعی۔ علم حدیث، علم قرأت اور فرائض کے ماہر۔ بنو کاہل کے آزاد کردہ غلام۔ کوفہ میں قیام رہا۔

۱۴۳- سلیمان بن موسیٰ: (م ۱۱۹ھ) ابو الربیع المعروف بالاشدق، شام کے مشہور فقیہ۔

۱۴۴- سلیمان بن یسار: (۳۴-۱۰۷ھ) ابو ایوب، تابعی، ام المومنین حضرت میمونہؓ کے آزاد کردہ غلام، مدینہ کے فقہاء سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

۱۴۵- سہل بن حُنیفؓ: (م ۳۸ھ) صحابِی رسول، انصار کے قبیلۂ اوس سے تعلق تھا۔ تمام غزوات میں شریک رہے۔

۱۴۶- سہیل بن عمروؓ: (م ۱۴ھ) صحابی رسول، فتحِ مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔

۱۴۷- سہیلی: (۵۰۸-۵۸۱ھ) عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن احمد الخثعمی۔ حافظ، لغت اور سیر کے امام۔ سیرت ابن ہشام کی آپ کی شرح الروض الانف کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۴۸- سیرین: ماریہ قبطیہؓ کی بہن۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کے پاس رہیں۔
۱۴۹- سیوطی: (۸۴۹-۹۱۱ھ) جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن سابق الدین الخضیری۔ مفسر، محدث، مورخ، ادیب۔ مختلف علوم میں تقریباً چھ سو کتابیں تالیف کیں، جن میں الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، الاتقان فی علوم القرآن، تفسیر جلالین، الاشباہ والنظائر اور اللالی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ مشہور ہیں ۔

(ش)

۱۵۰- شافعی: (۱۵۰-۲۰۴ھ) ابوعبد اللہ محمد بن ادریس الہاشمی۔ فقہ شافعی کے بانی، ائمہ اربعہ میں سے تھے۔ فقہ میں کتاب الام، اصولِ فقہ میں الرسالۃ اور حدیث میں المسند آپ کی اہم کتابیں ہیں۔
۱۵۱- شریح: (م۸۷ھ) بن الحارث بن قیس بن الجہم الکندی۔ عہد اول کے مشہور قاضی۔ خلافتِ فاروقی سے خلافتِ معاویہ تک کوفہ کے قاضی رہے۔ حدیث میں ثقہ تھے۔ ادب وشعر میں بھی مہارت تھی۔
۱۵۲- شعبی: (۱۹-۱۰۳ھ) ابوعمرو عامر بن شراحیل بن عبد ذی کبار الشعبی الحمیری۔ جلیل القدر تابعی۔ تقریباً پانچ سو صحابہ سے آپ کو شرفِ ملاقات حاصل ہے۔ کوفہ کے مشہور اصحابِ علم وفضل میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔
۱۵۳- شقیق بن ابی سلمہ: (م۹۹ھ) تابعی۔ نبی ﷺ کا زمانہ پایا، لیکن شرفِ صحابیت سے بہرہ ور نہ ہوسکے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں۔
۱۵۴- شوکانی (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ) محمد بن علی بن محمد بن عبد اللہ الشوکانی۔ یمن کے مجتہد فقیہ، منصب قضا پر فائز ہے۔ فقہ، رجال، تفسیر اور دیگر موضوعات پر سو سے زائد تصانیف ہیں، جن میں نیل الاوطار من اسرار منتقی الاخبار اور فتح القدیر بہت مشہور ہیں۔

(ص)

۱۵۵- صالح: (م مابعد ۱۴۰ھ) (بن کیسان المدنی) تابعی، حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے بچوں کے اتالیق اور ابن جریج، معمر اور امام مالک کے استاد تھے۔
۱۵۶- صفوان بن امیہؓ: (م۴۲ھ) صحابیِ رسول، غزوۂ حنین کے بعد اسلام قبول کیا۔
۱۵۷- صفیہؓ بنت حی بن اخطب: (م۵۰ھ) ام المومنین۔ غزوۂ خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں آئیں۔

(ض)

۱۵۸- ضمرہ بن جندبؓ: صحابیِ رسول۔ ان کا نام بعض سوانح نگاروں نے ضمرہ بن عمرو الخزاعی بیان کیا ہے۔

(ط)

۱۵۹- طاؤس بن کیسان الخولانی: (م ۱۰۵ھ) تابعی، امام زہری کے استاد۔

۱۶۰- طبرانی (۲۶۰-۳۶۰ھ) ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی الشامی۔ مشہور محدث۔ آپ کی کتاب المعجم الصغیر مشہور ہے۔

۱۶۱- طبری: (۲۲۴-۳۱۰ھ) ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری۔ مورخ، مفسر، امام، مجتہد۔ منصبِ قضا کی پیشکش کی گئی، مگر قبول نہیں کیا۔ تاریخ میں آپ کی کتاب اخبار الرسل والملوک (تاریخ طبری) اور تفسیر میں جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر طبری) دونوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

۱۶۲- طحاوی (۲۳۹-۳۲۱ھ) ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامۃ بن سلمۃ الازدی۔ مصر کے مشہور حنفی فقیہ۔ آپ کی تصانیف میں شرح معانی الآثار، مشکل الآثار، کتاب الشفعۃ اور بیان السنۃ مشہور ہیں۔

۱۶۳- طلحہ بن عبید اللہؓ: (م۳۶ھ) صحابی رسول، عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔

۱۶۴- طیبی (م ۷۴۳ھ) شرف الدین الحسین بن محمد بن عبد اللہ۔ حدیث، تفسیر اور علم بیان کے ماہر، شرح کشاف، شرح مشکوٰۃ المصابیح، الخلافۃ اور معرفۃ الحدیث آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

(ع)

۱۶۵- عامر بن مالک بن جعفر العامری الکلابی۔ ملاعب الاسنۃ کے لقب سے مشہور تھے۔ صرف خلیفہ بن خیاط نے ان کا شمار صحابہ میں کیا ہے۔ بقیہ تمام اصحاب سیر کے نزدیک ان کا قبولِ اسلام ثابت نہیں ہے۔

۱۶۶- عائشہؓ بنت ابی بکر صدیقؓ (م ۵۷ھ) ام المومنین۔

۱۶۷- عبادہ بن صامتؓ: (م ۳۴ھ) صحابی رسول، بیعت عقبہ میں شریک تھے۔

۱۶۸- عباس بن عبد المطلبؓ: (م ۳۲ھ) صحابی رسول، آں حضرت ﷺ کے چچا۔

۱۶۹- عبد الرحمٰن بن ابو بکرؓ: (م ۵۳ھ) صحابی رسول، ام المومنین حضرت عائشہ کے بھائی۔

۱۷۰- عبد الرحمٰن بن عوفؓ: (م ۳۱ھ) صحابی رسول، عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

۱۷۱- عبد الرزاق: (۱۲۶-۲۱۱ھ) ابوبکر بن ہمام بن نافع الحمیری الصنعانی۔ ثقہ، حافظ حدیث۔ آپ کی کتاب 'المصنّف' مشہور ہے۔

۱۷۲- عبد اللہ بن ابی زکریا: (م ۱۱۷ھ) ابو یحیٰ الخزاعی الشامی۔ فقہاء دمشق میں سے تھے۔ محمد بن سعد نے آپ کا شمار تابعین شام کے تیسرے طبقے میں کیا ہے۔

۱۷۳- عبد اللہ بن رواحہؓ (م ۸ھ) صحابی رسول، انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔ شاعر رسول۔ غزوۂ موتہ میں شہادت پائی۔

۱۷۴- عبد اللہ بن زبیرؓ (م ۷۳ھ) صحابی رسول۔

نے ان سے روایت کی ہے۔عہدِ نبوی میں ولادت پائی۔مگر شرفِ صحابیت سے بہرہ ور نہ ہوئے۔

۱۹۳- علی بن ابی طالبؓ: (م ۴۰ھ) صحابی رسول۔خلیفہ چہارم

۱۹۴- علی بن زید بن جدعان (م ۱۲۹ھ) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی۔بیش تر محدثین نے ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔

۱۹۵- عمارہ بن زاذان: الصیدلانی، ابوسلمہ البصری۔حضرت انسؓ، ثابت البنانی اور مکحول وغیرہ سے روایت کی۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے بعض احادیث روایت کی ہیں، لیکن متعدد محدثین نے انھیں ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

۱۹۶- عمرؓ بن الخطاب: (م ۲۳ھ) صحابی رسول، خلیفۂ دوم۔

۱۹۷- عمر بن عبد العزیز: (م ۱۰۱ھ) مشہور اموی خلیفہ۔بعض لوگوں نے پانچواں خلیفۂ راشد قرار دیا ہے۔ زہری اور ابوبکر ابن حزم نے ان سے روایت کی ہے۔

۱۹۸- عمران بن حصینؓ الخزاعی: (م ۵۲ھ) صحابی رسول۔

۱۹۹- عمرو بن امیہ ضمریؓ: (م ۵۵ھ تقریباً) صحابی رسول، شجاعت میں مشہور تھے۔

۲۰۰- عمرو بن شرحبیل: (الہمدانی الکوفی) تابعی۔حضرت حذیفہؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عمر بن الخطابؓ وغیرہ سے روایت کی۔عبید اللہ بن زیاد کے عہد ولایت میں وفات پائی۔

۲۰۱- عمرو بن شعیب: (م ۱۱۸ھ) ابو ابراہیم عمرو بن شعیب بن محمد السہمی القرشی۔تابعی۔اپنے باپ شعیب اور ابن المسیّب اور طاؤس وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں اور ان سے زہری، ابن جریج اور عطا وغیرہ نے روایت کی ہے۔

۲۰۲- عمرو بن عبسہؓ السلمی: صحابی رسول، حضرت علی کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

۲۰۳- عمرو بن میمون: (م ۷۴ھ) کوفہ کے کبار تابعین میں سے ہیں۔جاہلیت کا زمانہ پایا۔نبی ﷺ کی زندگی میں اسلام قبول کیا، لیکن شرفِ صحابیت سے بہرہ ور نہ ہوسکے۔حضرت عمر بن الخطابؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہ سے احادیث روایت کیں۔

۲۰۴- عمیر بن وہبؓ: صحابی رسول، غزوہ بدر کے بعد اسلام قبول کیا۔

۲۰۵- عون بن عبد اللہ: (م ۱۱۵ھ تقریباً) بن عتبہ بن مسعود الہذلی۔خطابت، شاعری اور علم الانساب میں شہرت تھی۔حضرت عمر بن عبد العزیز کے قریبی رفقاء میں تھے۔

۲۰۶- عیاض: (۴۷۶-۵۴۴ھ) ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرون الیحصبی السبتی۔اپنے عہد کے مشہور محدث، عربوں کے کلام، انساب اور ایام عرب کے عالم، سبتہ پھر غرناطہ میں منصب قضا پر فائز رہے۔الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، مشارق الانوار اور الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع مشہور تصانیف ہیں۔

۲۰۷- عیاض بن حمارؓ: التیمی المجاشعی، صحابی رسول۔
۲۰۸- عیاض بن غنمؓ: (م ۲۰ھ) صحابی رسول۔ صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کیا۔
۲۰۹- عینی: (۷۶۲-۸۵۵ھ) بدر الدین محمود بن احمد بن موسیٰ بن احمد۔ مورخ، محدث، حنفی فقیہ، قاہرہ میں قضاء اور دیگر عہدوں پر فائز رہے۔ آخر عمر میں تدریس وتصنیف میں مصروف ہوگئے تھے۔ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، البنایۃ فی شرح الھدایۃ، رمز الحقائق شرح کنز الدقائق آپ کی بعض مشہور تصانیف ہیں۔

(ف)

۲۱۰- فاطمہؓ بنت محمد ﷺ: (م ۱۱ھ) رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادی، حضرت علیؓ کی زوجہ۔
۲۱۱- فضالہ بن عبیدؓ: (م ۵۳ھ) صحابی رسول، انصار کے قبیلہ اوس سے تعلق تھا۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔

(ق)

۲۱۲- قتادۃ: (۶۱-۱۱۸ھ) ابو الخطاب بن دعامۃ بن قتادۃ بن عزیز الدوسی البصری۔ جلیل القدر تابعی۔ تفسیر، حدیث، لغت اور انساب کے امام۔
۲۱۳- قرطبی: (م ۶۷۱ھ) ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری الخزرجی الاندلسی۔ قرطبہ کے رہنے والے تھے، مصر میں سکونت اختیار کی، بڑے عابد و زاہد تھے۔ آپ کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی) کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔
۲۱۴- قیس بن سعدؓ: (م ۶۰ھ) صحابی رسول، انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔

(م)

۲۱۵- ماریہ قبطیہؓ: (م ۱۶ھ) مقوقس شاہِ مصر نے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ انہی سے حضور کے صاحب زادے ابراہیم پیدا ہوئے۔
۲۱۶- مالک بن انس: (۹۵-۱۷۹ھ) ابو عبد اللہ مالک بن انس بن مالک الاصبحی الحمیری۔ امام دار الہجرۃ، فقہ مالکی کے بانی۔ ائمہ اربعہ میں سے تھے۔ زہری، یحییٰ بن سعید، نافع، محمد بن المنکدر، ہشام بن عروہ اور ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ امام شافعی کے استاد، موطا آپ کی مشہور تصنیف ہے۔
۲۱۷- ماوردی: (۳۶۴-۴۵۰ھ) ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب۔ اپنے عہد کے مشہور قاضی، شافعی فقیہ، عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ نے آپ کو قاضی القضاۃ بنا دیا تھا۔ آپ کی تصانیف میں ادب الدنیا والدین، الاحکام السلطانیۃ، النکت والعیون (تفسیر الماوردی) اور اعلام النبوۃ مشہور ہیں۔

۲۱۸- مجالد: (م۱۴۴ھ) بن سعید بن عمیر بن بسطام الہمدانی الکوفی۔ عامر شعبیؒ سے روایت کی۔ محدثین نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔

۲۱۹- مجاہد: (م۱۰۰ھ) ابو الحجاج بن جبر المکی۔ تابعی۔ حضرت عبد اللہ بن السائب مخزومیؓ کے آزاد کردہ غلام۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد۔ علمِ قرأت و تفسیر کے امام۔ مکہ کے فقہائے تابعین میں شمار ہوتا ہے۔

۲۲۰- محمد بن حسن شیبانی: (۱۳۱-۱۸۹ھ) ابو عبد اللہ۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے شاگرد، فقہ حنفی کے ایک بڑے امام۔ ہارون رشید کے عہد میں منصبِ قضاء پر فائز رہے۔ فقہ و اصول فقہ میں متعدد کتابیں تصنیف کیں جو فقہ حنفی کی اساس ہیں، ان میں جامع کبیر، جامع صغیر، کتاب الآثار، کتاب السیر اور الموطا مشہور ہیں۔

۲۲۱- محمد بن حنفیہ: (۲۱-۸۱ھ) ابو القاسم محمد بن علی بن ابی طالب الہاشمی القرشی۔ تابعی، حضرت علیؓ بن ابی طالب کے صاحب زادے۔ صاحب علم و فضل۔ شجاعت میں مشہور تھے۔

۲۲۲- محمد بن کعب قرظی: (م۱۰۸ھ) تابعی۔ متعدد صحابہ سے احادیث روایت کیں۔

۲۲۳- محمود محمد شاکر: (۱۳۲۷-۱۴۱۸ھ) مشہور مصری عالم و محقق، آپ کی کتاب المتنبیؔ پر ۱۹۸۲ء/ ۱۴۰۳ھ میں عالمی شاہ فیصل ایوارڈ برائے ادب عربی سے نوازا گیا۔ متعدد قدیم مصادر کی تحقیق کی ہے، جن میں تفسیر طبری کو زیادہ شہرت ملی۔

۲۲۴- مرہ ہمدانی: (م۷۶ھ) بن شراجیل البکیلی الکوفی۔ مشہور تابعی۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ زید بن ارقمؓ، ابن مسعودؓ اور دیگر متعدد صحابہ کرام سے روایت کی۔

۲۲۵- مزنی: (۱۷۵-۲۶۴ھ) ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ بن اسماعیل المصری۔ امام شافعی کے شاگرد۔ فقہ شافعی کے امام۔ الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، المختصر، الترغیب فی العلم آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

۲۲۶- مسلم بن حجاج: (۲۰۴-۲۶۱ھ) القشیری النیسا پوری۔ مشہور محدث، صحاح ستہ میں صحیح بخاری کے بعد آپ کی کتاب کا شمار ہوتا ہے

۲۲۷- مصعب بن عمیرؓ: (م۳ھ) صحابیِ رسول۔ بیعتِ عقبہ کے بعد حضور نے اہل مدینہ میں دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا تھا۔ غزوۂ احد میں شہادت پائی۔

۲۲۸- معاویہؓ بن ابی سفیان: (م۶۰ھ) صحابی رسول، کاتبِ وحی۔

۲۲۹- معمر بن راشد: (۹۵-۱۵۳ھ) ابو عروہ معمر بن راشد بن ابی عمرو الازدی الحدانی۔ فقیہ، حافظ حدیث۔ بصرہ کے رہنے والے تھے، یمن میں سکونت اختیار کی۔ سنن میں آپ کی کتاب الجامع کو شہرت حاصل ہے۔

۲۳۰- مقاتل بن سلیمان: (م۱۵۰ھ) ابو الحسن مقاتل بن سلیمان بن بشیر الازدی البلخی۔ مشہور مفسر،

متروک الحدیث۔ علم تفسیر وقرأت پر آپ کی متعدد کتابیں ہیں۔

۲۳۱- مقدام بن معدیکربؓ: (م۸۷ھ) صحابی رسول۔ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے قبیلۂ کندہ کے وفد میں شامل تھے۔

۲۳۲- مکحول: (م۱۱۲ھ) ابوعبد اللہ بن ابی مسلم شہراب بن شاذل الہذلی۔ تابعی، فقیہ شام، حافظِ حدیث۔ طلبِ حدیث میں مختلف ممالک کا سفر کیا۔ آخر میں دمشق میں سکونت اختیار کی۔

۲۳۳- مناوی: (۹۵۲-۱۰۳۱ھ) محمد عبد الرؤف بن تاج العارفین۔ مختلف علوم وفنون میں تقریباً اسّی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں حدیث میں کنوز الحقائق، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، التیسیر اور شرح شمائل ترمذی شہرت کی حامل ہیں۔

۲۳۴- موسیٰ بن عقبہ: (م۱۴۱ھ) ابومحمد موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش الاسدی۔ مشہور سیرت نگار، محدث، فقیہ، ماہرِ جرح وتعدیل۔ مغازی پر آپ کی کتاب مشہور ہے، لیکن دستیاب نہیں ہے۔

۲۳۵- مہلب بن ابی صفرہ: (۷-۸۳ھ) ابوسعید الازدی العتکی۔ تابعین بصرہ کے طبقہ اول میں شمار ہوتا ہے۔ خوارج کے خلاف جنگوں میں شریک رہے، حضرت سمرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی۔

۲۳۶- میمون بن مہران: (۳۷-۱۱۷ھ) ابوایوب۔ کوفہ میں پرورش پائی۔ بڑے عبادت گزار، حدیث میں ثقہ اور فقہ میں مشہور تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے بیٹے کے اتالیق تھے۔ منصبِ قضاء پر فائز رہے۔

(ن)

۲۳۷- نخعی: (۴۶-۹۶ھ) ابوعمران ابراہیم بن یزید بن قیس بن الاسود۔ کبار تابعین میں سے تھے۔

۲۳۸- نسائی: (م۳۰۳ھ) ابوعبد الرحمٰن احمد بن علی بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔ مشہور محدث، ابو القاسم طبرانی اور ابوجعفر طحاوی کے استاد۔ آپ کی کتاب سنن النسائی کا صحاح ستہ میں شمار ہوتا ہے۔

۲۳۹- نووی: (۶۳۱-۶۷۶ھ) ابوزکریا محی الدین یحیٰ بن شرف بن مری بن حسن الخرامی الشافعی۔ فقیہ، محدث۔ حدیث میں ریاض الصالحین اور الاذکار آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔ آپ کی شرحِ مسلم کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

(و)

۲۴۰- واقدی: (۱۳۰-۲۰۷ھ) ابوعبد اللہ محمد بن عمر بن واقدی السہمی الاسلمی۔ قدیم ترین اور مشہور ترین مورخِ اسلام، حافظ حدیث، ہارون رشید کے زمانے میں بغداد میں منصبِ قضا پر فائز رہے۔

تاریخ و سیرت پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں کتاب المغازی کو خاص طور پر شہرت ملی۔

۲۴۱- ولید بن عبد اللہ: (م ۱۷۲ھ) بن ابی ثور الہمدانی المرہبی۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ محدثین نے انھیں ضعیف اور ناقابلِ احتجاج قرار دیا ہے۔

(ہ)

۲۴۲- ہادی الی الحق: (۲۲۰-۲۹۸ھ) یحییٰ بن الحسین بن القاسم بن ابراہیم الحسنی۔ فقیہ۔ یمن میں فرقۂ زیدیہ کے ائمہ میں شمار ہوتا ہے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

۲۴۳- ہشام بن عروہ: (۶۱-۱۴۶ھ) ابو المنذر ہشام بن عروہ بن الزبیر بن العوام القرشی الاسدی۔ مدینہ کے اجلۂ تابعین میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ حضرت ابن عمرؓ وغیرہ سے روایت کی۔ ان سے روایت کرنے والوں میں امام مالکؒ، ثوریؒ، ابن عیینہؒ وغیرہ جیسی شخصیات ہیں۔

(ی)

۲۴۴- یحییٰ بن سلام: (۱۲۴-۲۰۰ھ) بن ابی ثعلبہ التیمی البصری۔ مفسر، فقیہ، محدث، ماہر لغت۔ تقریباً بیس تابعین سے روایت کی ہے۔ مختلف علوم و فنون میں آپ کی تصانیف ہیں، جن میں تفسیر القرآن، اختیارات فی الفقہ اور الجامع کو شہرت ملی۔

۲۴۵- یحییٰ بن یعمر: (م ۱۲۹ھ) ابوسلیمان الوشقی العدوانی۔ تابعی۔ حدیث، فقہ اور لغت کے ماہر۔ مرو کے قاضی رہے۔ نحو میں ابو الاسود الدولی کے شاگرد۔ سب سے پہلے مصحف پر نقطے لگائے۔

۲۴۶- یزید بن ابی سفیانؓ: (م ۱۹ھ) صحابی رسول، حضرت معاویہؓ کے بھائی، فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔

۲۴۷- یعقوب بن عتبہ: (م ۱۲۸ھ) بن المغیرہ بن الاخنس۔ تابعی۔ حضرت ابان بن عثمان، سلیمان بن یسار، عکرمہ، عروہ وغیرہ سے روایت کی۔ اصحابِ سیر نے ان کا شمار اہلِ مدینہ کے چوتھے طبقے میں کیا ہے۔